چند یادیں
چند تاثّرات

اچھی کتاب
کا
نقش ہمیشہ
قائم
رہتا ہے

چند یادیں چند تاثرات

عاشق حسین بٹالوی

آئینۂ ادب۔ چوک مینار۔ انارکلی لاہور

جملہ حقوق محفوظ

طبع اوّل ۱۹۶۹ء
تعداد ۱۱۰۰
قیمت Rs : 18/-

اہتمام
م، ع، سلام۔ آئینۂ ادب
چوک مینار۔ انارکلی لاہور
فون نمبر ۶۷۵۰۴

باہتمام محمد طفیل مالک نقوش پریس اُردو بازار لاہور سے م، ع، سلام نے چھپوا کر آئینۂ ادب لاہور سے شائع کی۔

فہرست

چند یادیں

۱۔ ملک برکت علی ۱۱

۲۔ سر عبدالقادر ۳۳

۳۔ ڈاکٹر سیف الدین کچلو ۶۱

۴۔ آغا حشر ۷۷

۵۔ مولانا صلاح الدین احمد ۹۱

۶۔ سید افضل علی ۱۱۱

۷۔ اختر شیرانی ۱۲۱

۸۔ میر غلام بھیک نیرنگ ۱۴۹

۹۔ ڈاکٹر محمد اشرف ۱۵۹

۱۰۔ باری ۱۶۹

۱۱۔ ابو سعید بزمی ۱۷۷

۱۲۔ چراغ حسن حسرت ۱۸۵

۱۳۔ تبرکات اکبر ۱۹۹

۱۴۔ قرارداد پاکستان سنہ ۱۹۴۰ء ۲۴۱

چند تاثرات

۱۵۔ انڈیا آفس لائبریری ۔ لندن ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۲۵۵

۱۶۔ دیوانِ حافظ کا انگریز مترجم ——— جان پین ۔۔۔۔۔۔ ۲۷۹

۱۷۔ اقبال کے استاد ——— ڈاکٹر مک ٹیگرٹ ۔۔۔۔۔ ۳۰۱

۱۸۔ رُباعیاتِ عمر خیام کے انگریزی ترجمے کا پس منظر ۔۔۔۔ ۳۰۷

۱۹۔ آسکر وائلڈ کی صد سالہ سالگرہ ۔۔۔۔۔۔۔۔ ۳۱۵

۲۰۔ شیکسپیئر کا وطن ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۳۳۹

۲۱۔ ٹیپو سلطان کا کتب خانہ ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۳۵۳

۲۲۔ سر ٹامس آرنلڈ ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۳۶۷

۲۳۔ لارڈ برٹرنڈ رسل ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۳۸۵

۲۴۔ سر ونسٹن چرچل ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۳۹۱

۲۵۔ مُسلم مشن ۔ ووکنگ ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۳۹۹

۲۶۔ ماربیڈ بوک پکھتال ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۴۰۷

۲۷۔ لندن کی ایشیائی انجمنیں ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۴۱۳

۲۸۔ رُوحانیات کی تحریک ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۴۲۱

۲۹۔ چارلس بریڈلا ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۴۲۹

۳۰۔ کارلائل کا مکان ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۴۳۵

۳۱۔ عبداللہ قلبی ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۴۴۴

بچشمِ کم منگر عاشقانِ صادق را

که این شکسته بهایان متاعِ قافله اند

چند یادیں

ملک برکت علی

عمرہا چرخ بہ گردد کہ جگر سوختۂ
چوں من از دودۂ آزر نفساں برخیزد

جس محب گرامی رفیق کرم کا نام اس مضمون کا زیبِ عنوان ہے اور جس کی سوگوار یاد میں یہ چند سطور سپردِ قلم کی جا رہی ہیں وہ غالب کے مذکورہ بالا شعر کے مطابق اپنی زندگی کی حرارت کے لیے کسی آذر نفس کے شعلے کا محتاج نہیں تھا۔ قدرت نے خود اسے آتش نفس بنا کر دنیا میں بھیجا تھا کہ اپنی گرمیٔ گفتار اور پاکیزگیٔ کردار سے مُردہ دلوں کو زندہ اور افسردہ روحوں کو شگفتہ کرے، وہ جب تک زندہ رہا قوم کی جنگ میں ہمیشہ صفِ اوّل میں رہنے کا عادی تھا تاکہ گرتے ہوؤں کو سنبھالے اور آگے بڑھنے اور غنیم سے لڑنے کا سبق دے۔

ملک برکت علی کی بے وقت اور ناگہانی موت کا حادثہ اتنا اچانک اور المناک تھا کہ یقین نہیں آتا تھا کہ وہ اس دنیا سے رخصت ہو گئے ہیں۔ اگرچہ ۵ر اپریل ۱۹۴۶ء کی شام کو خود اِن ہاتھوں نے اُن کا جنازہ اٹھایا اور غروبِ آفتاب کے

وقت لاہور کے ایک قدیم قبرستان کے گوشے میں جہاں پارسال اُن کی رفیقِ زندگی کو سپردِ خاک کیا تھا اُنھیں آغوشِ لحد میں سُلا دیا۔

زمن بحرم تپیدن کنارہ می کردی
بیا بخاکِ من و آرمیدنم بنگر

جس شخص کے ساتھ اُس کی زندگی کے آخری لمحے تک دوستانہ اور نیازمندانہ مراسم رہے ہوں جس کے ساتھ مسلسل دس برس سیاسی کام کرنے کا اتفاق ہوا ہو جس کی صحبت میں رہ کر بے شمار علمی فوائد حاصل کئے ہوں اور جس کے ساتھ سالہا سال کے قرب و یکجائی نے ایسی یگانگت اور محبت پیدا کر دی ہو کہ اُس کا غم اپنا غم اور اس کا آرام اپنا آرام بن گیا ہو اُس کے مرجانے کے بعد اُس کے محاسن کو قلم بند کرنا آسان نہیں۔ ایک عقیدت مند کو اُس کی سیرت کا ہر پہلو عظمتوں سے لبریز نظر آتا ہے۔

دُنیا کا قاعدہ ہے کہ مرنے والے کی صرف نیکیاں یاد رہ جاتی ہیں اور عیوب سے چشم پوشی کی جاتی ہے لیکن ان سطور کا لکھنے والا، از راہ تکلف نہیں بلکہ اظہارِ حقیقت کے طور پر، یہ عرض کرنے کی جرأت کرتا ہے کہ ملک صاحب مرحوم کی زندگی کا کوئی گوشہ ایسا نظر نہیں آتا جو قابلِ گرفت ہو۔ وہ ایک بڑے آدمی تھے اُن میں ایک شاعر کے جذبات کی گرمی بھی تھی اور ایک فلسفی کا تعقل اور ایک فن کار کا وجدان بھی تھا وہ بیک وقت ایک قانون دان، ایک ادیب، ایک سیاسی مفکر ایک مصلح قوم اور ایک ماہرِ تعلیم تھے۔ خدا نے اُنھیں ایک روشن دماغ اور روشن تر ضمیر عطا کیا تھا ان کے دل و دماغ میں حیرت انگیز توازن تھا، پیہم غور و فکر اور

کثرتِ مطالعہ نے۔ اُن کی طبیعت میں۔ ایک خاص قسم کا ضبط پیدا کر دیا تھا۔ جو جذبات کے دھارے کو بے راہ نہیں ہونے دیتا تھا۔ اس ضبط کی وجہ سے، اُن کے مزاج میں، کبھی تُندی پیدا نہیں ہوتی تھی۔ روزمرّہ زندگی کے ایسے نازک موقعوں پر۔ جب معمولی اِشتعال سے مزاج کے برہم ہو جانے کا اندیشہ ہوتا ہے وہ عموماً خاموش و پُرسکون رہتے تھے، مخالف کے حملوں کو نہایت حوصلے سے برداشت کرتے تھے۔ اور دوستوں کی مدح و ستائش سے، اُن کی طبیعت میں اور زیادہ اِنکسار پیدا ہو جاتا تھا۔

ہائی کورٹ میں اُن کی قانونی نکات سے لبریز بحث اور مجلسِ قانون ساز میں اُن کی دلائل و براہین سے مرصع تقریریں سُننے کے بعد انسان اُن کی فصاحت و طلاقت سے بے حد متاثر ہوتا تھا۔ سیاسی جلسوں میں بھی وہ جس بے پناہ جوش سے بولتے تھے وہ سامعین کو مسحور کر دینے کے لیے کافی تھا لیکن عام خانگی زندگی یا دوستوں کی محفل میں وہ زیادہ باتیں کرنے کے عادی نہیں تھے۔ ایک اجنبی اُن کی طبیعت کے یہ دو مختلف پہلو دیکھ کر حیران رہ جاتا تھا۔ بسا اوقات کم سخنی کا یہ عالم ہوتا تھا کہ پاس بیٹھا ہوا شخص مُسلسل باتیں کر کے تھک جاتا تھا۔ اور مرحوم جواب دینے میں صرف "ہوں، ہاں" پر اکتفا کرتے تھے۔ لیکن یہ انداز زیادہ تر اُس وقت روا رکھا جاتا جب گفتگو کم تر قسم کے دُنیاوی معاملات کے حلقے میں محدود ہوتی تھی جونہی کوئی قانونی، علمی یا سیاسی موضوع معرضِ کلام میں آتا اُن کی خاموشی معاً غائب ہو جاتی تھی اور وہ مسئلہ زیرِ نظر پر نہایت سیر حاصل بحث کرتے تھے، بے مصرف اور بے کار باتیں کرنے سے اُنھیں سخت نفرت تھی، ہر شخص کے ذوق کے مطابق یا ہر شخص کو خوش

کرنے کے لیے، اُس کے ڈھب کی گفتگو کرنے کا انداز اُنھیں بالکل نہیں آتا تھا
یہی وجہ ہے کہ اپنی قابلِ رشک دماغی صلاحیتوں کے باوجود، وہ پارٹی بازی یا
جماعت سازی کے فن سے ناواقف تھے، آج کل کی سیاسی زندگی، چونکہ پارٹی بازی
اور جماعت سازی کے اصول پر چلتی ہے اور ملک صاحب اس فن کے ماہر نہیں تھے
اس لیے وہ سیاسی جوڑ توڑ میں کبھی کامیاب نہ ہوئے ——

سیاسیات میں وہ شروع سے آزاد اور ترقی پسند رجحانات کے مالک تھے
۱۹۱۵ء اور ۱۹۱۶ء میں مسلم لیگ اور کانگریس کو ایک دوسرے کے قریب لانے اور
دونوں جماعتوں میں ہم آہنگی پیدا کرنے میں اُن کی کوششوں کو بڑا دخل تھا۔ سر محمد شفیع
مرحوم اس روش کو پسند نہیں کرتے تھے، لیکن قائدِ اعظم کی قیادت میں میاں فضلِ حسین
اور ملک برکت علی دو ایسے شخص تھے۔ جو اس عقیدے کے پُرجوش حامی تھے کہ بدنشی
حکومت کے خلاف جنگ کرنے کے لیے لیگ اور کانگریس کا اتحاد ضروری ہے،
چنانچہ ۱۹۱۶ء میں مسلمانانِ پنجاب کی نمائندگی کرتے ہوئے ملک صاحب اور میاں فضلِ حسین
نے معاہدۂ لکھنؤ پر دستخط کیے تھے۔ ۱۹۲۱ء کی اصلاحات کے بعد جب میاں فضلِ حسین
نے اس معاہدے پر عمل کیا اور سرکاری ملازمتوں اور حکومتِ خود اختیاری کے
عہدوں میں مسلمانوں کو چالیس فیصد نمائندگی دی تو ہندوؤں نے ان کے خلاف اعلانِ
جنگ کر دیا۔ اس نازک وقت میں میاں فضلِ حسین کے ساتھیوں میں صرف ملک صاحب
آگے بڑھے۔ اور تقریر و تحریر سے اُن کی مدد کی۔

یونینسٹ پارٹی کی ہیئتِ تعمیر اور اصولِ کار سے ملک صاحب کو شدید اختلاف
تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ۱۹۲۴ء کے بعد اُن کے اور میاں فضلِ حسین کے درمیان اختلاف

کی ایک خلیج پیدا ہونا شروع ہو گئی تھی۔ ۱ اپریل ۱۹۳۶ء میں میاں فضلِ حسین نے یونینسٹ پارٹی کی نئے سرے سے تشکیل کی تو ملک صاحب کو بھی بڑی گرم جوشی سے شرکت کی دعوت دی تھی لیکن ملک صاحب نے عمر بھر کی دوستی کے باوجود اِس دعوت کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اُنہوں نے میاں فضلِ حسین کو اس موضوع پر جو طویل مکتوب لکھا تھا اس میں ایک جگہ کہتے ہیں :-

"مجھے آپ کی قابلیت اور نیک نیتی پر کوئی شبہ نہیں اور میں یہ بھی جانتا ہوں کہ جب تک آپ زندہ ہیں۔ آپ کی زوردار شخصیت کی وجہ سے یہ پارٹی مسلمانوں کے لیے زیادہ نقصان رساں ثابت نہیں ہو گی لیکن جن لوگوں کو آپ نے اپنے گرد جمع کر لیا ہے اور جو آئندہ آپ کے جانشین بننے والے ہیں۔ وہ قطعاً اس قابل نہیں کہ اُن کو مسلمانوں کی قسمت کا مختار بنایا جائے۔ اور مجھے یقین ہے کہ پارٹی کی باگ ڈور جب اِن لوگوں کے ہاتھ میں جائے گی تو یہ جماعت مسلمانوں کے لیے مفید ہونے کی بجائے سخت مضر ثابت ہو گی۔"

یاد رہے کہ جب ملک صاحب نے یہ خط لکھا ہے اس وقت آل انڈیا مسلم لیگ قطعاً عوام کی جماعت نہ تھی اور نہ اُس نے ۱۹۳۵ء کے ایکٹ کے تحت، مجالسِ قانون ساز کے انتخابات میں حصہ لینے کا ابھی فیصلہ کیا تھا۔ مئی ۱۹۳۶ء میں مسٹر جناح مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ مقرر کرنے کے لیے لاہور تشریف لائے تو ملک صاحب نے پوری سرگرمی اور انہماک سے اُن کے ساتھ تعاون کیا۔ ۱۹۳۷ء میں مخالفت کے بے پناہ طوفان کے باوجود، وہ مسلم لیگ کے ٹکٹ پر کامیاب ہوئے اور نومبر ۱۹۴۴ء تک پنجاب

اسمبلی میں واحد مسلم لیگی ممبر کی حیثیت سے، حزب مخالف میں بیٹھتے رہے۔ اس ضمن میں یہ لطیفہ قابلِ ذکر ہے کہ انتخاب سے پہلے، یونینسٹ پارٹی کے لیڈر کی طرف سے، سردار احمد بخش خاں مرحوم، علامہ اقبالؒ کے لیے، یہ پیغام لے کر آئے تھے کہ اگر مسلم لیگ اپنے ٹکٹ پر علیحدہ امیدوار نہ کھڑے کرے تو اس کے دو ممبروں کو اسمبلی کی نشستیں بلا مقابلہ پیش کی جا سکتی ہیں لیکن اس پیشکش کے ساتھ یہ شرط بھی مدکر دی گئی تھی کہ ملک برکت علی کو وہ کوئی نشست دینے کو تیار نہیں، علامہ مرحوم نے یہ پیش کش حقارت سے ٹھکرا دی تھی۔

الیکشن کے بعد ملک صاحب کے حریفوں اور مخالفوں نے ان کے خلاف قسم قسم کے اتہام تراشے اور رنگ رنگ کے بہتان باندھے لیکن وہ روزِ اوّل سے جس جگہ کھڑے تھے وہیں چٹان کی طرح قائم رہے۔ اگرچہ سر سکندر مرحوم آل انڈیا مسلم لیگ کی مجلس عاملہ کے رکن مقرر ہو گئے تھے اور یونینسٹ پارٹی کے مسلمان ممبر بظاہر مسلم لیگی بن گئے تھے لیکن ملک صاحب کا ابتدا سے یہ خیال تھا کہ سکندر جناح پیکٹ کے باوجود پنجاب کی مجلسِ قانون ساز میں کوئی مسلم لیگ پارٹی نہیں بنی۔ اس لیے انہوں نے ہر قسم کی تحریص و ترغیب کا مقابلہ کرتے ہوئے حزبِ مخالف میں بیٹھنا منظور کیا۔

حقیقت یہ ہے کہ ۱۹۳۷ء سے ۱۹۴۴ء تک پنجاب میں مسلم لیگ کی تاریخ صرف ملک صاحب کے کارناموں کا دوسرا نام ہے، سات سال تک وہ فنِ تنہا ایک انجمن کا کام کرتے رہے۔ ۱۴ اکتوبر ۱۹۳۷ء کو سکندر جناح پیکٹ کا پہلا مسودہ ملک صاحب ہی نے مرتب کیا تھا اور اس میں انہوں نے لکھا تھا کہ یونینسٹ پارٹی

کو بحیثیت ایک مستقل جداگانہ سیاسی ادارے کے ختم کر دیا جائے گا۔ سر سکندر کو چونکہ اس پر اعتراض تھا اس لیے وہ مسودہ منظور نہ ہو سکا اور دوسرا مسودہ میر مقبول محمود نے تیار کیا۔

قائدِ اعظم سے اُن کی عقیدت و محبت بے اندازہ تھی۔ دسمبر ۱۹۲۷ء میں سائمن کمیشن کی آمد پر جب سر محمد شفیع نے لیگ کو دو حصوں میں تقسیم کر کے اپنی لیگ کا اجلاس لاہور میں کیا تھا تو تقریباً سارا پنجاب اُن کا ہم نوا بن گیا تھا لیکن ملک صاحب تنہا کلکتہ گئے اور وہاں قائدِ اعظم کی لیگ میں شرکت کی اس موقع پر انھوں نے جو عظیم الشان خدمات انجام دیں۔ اُن کی تعریف مولانا محمد علی مرحوم ایسے شخص کو بھی اپنے اخبار ہمدرد میں کرنا پڑی تھی۔ ۱۹۲۸ء کی آل انڈیا کنونشن کلکتہ میں ہوئی تو انھوں نے قائدِ اعظم کے ساتھ مسلم لیگ کی نمائندگی کی۔ ۱۹۳۱ء میں وہ نیشنلسٹ مسلم کانفرنس لاہور کی مجلسِ استقبالیہ کے صدر بنے۔ اُس زمانے میں وہ مخلوط انتخاب کے بہت بڑے حامی تھے اور چاہتے تھے کہ کانگرس سے کسی معقول بنیاد پر سمجھوتہ ہو جائے اس غرض کے لیے انھیں بہت سے پرانے رفیقوں اور ساتھیوں کو بھی چھوڑنا پڑا۔

علامہ اقبال نے جب ۱۹۳۰ء میں تقسیمِ ہند کی تجویز پیش کی تو ملک صاحب نے سخت مخالفت کی تھی۔ پھر آہستہ آہستہ ان پر متحدہ ہندوستانی قومیت کا بھرم کھلنا شروع ہوا اور انھوں نے دیکھا کہ اس نام نہاد متحدہ قومیت کا مطلب سوائے اس کے اور کچھ نہیں کہ مسلمانوں کی جداگانہ قومی ہستی کو ختم کر دیا جائے تو انھوں نے اس راہ کو ہمیشہ کے لیے ترک کر دیا۔

۱۹۳۶ء سے لے کر اپنی وفات تک وہ مسلم لیگ کی تحریک جدید کے ایک

زبردست ستون تھے، لیگ کی مجلسِ عاملہ کے بہت سے اہم فیصلے ان کی رائے سے طے ہوتے رہے۔ علامہ اقبال کو آپ پر مکمل اعتماد تھا اور آپ سے محبت بھی بہت تھی فروری ۱۹۳۷ء میں جب انھیں پنجاب اسمبلی کے انتخابات میں ملک صاحب کی کامیابی کی خبر سنائی گئی تو اس قدر خوش ہوئے گویا یہ اُن کی ذاتی کامیابی کا مژدہ تھا اسی روز شام کو جب ملک صاحب اُن کے دولت کدے پر حاضر ہوئے تو علامہ مرحوم علالت کے باوجود اٹھ کر باہر برآمدے میں آئے اور خوشی میں اُن سے بغل گیر ہوئے۔

اسی الیکشن کے زمانے میں ملک صاحب کی صاحبزادی سخت علیل تھیں اور ملک صاحب کو مسلسل کئی ہفتے لاہور سے باہر رہنا پڑا تو حضرت علامہ ہر روز صاحبزادی کی صحت کی خبر منگواتے اور اُن کے علاج کے لیے حکیم نابینا صاحب کو دہلی خط بھی لکھتے تھے۔

۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء کو جب حضرتِ علامہ کا انتقال ہوا تو لوگوں نے دیکھا کہ علامہ مرحوم کے مکان پر ہزاروں انسانوں کے ہجوم میں ملک صاحب ایک بچے کی طرح دھاڑیں مار مار کر روتے تھے ——

سر سکندر حیات خاں کی زندگی میں جب کہ یونینسٹ پارٹی اپنے عروج پر تھی، اس پارٹی کے اکیاسی مسلمان ممبروں میں سے کسی کو سر سکندر کے سامنے دم مارنے کی ہمت نہ تھی۔ وہ لوگ جو سر سکندر کے انتقال کے بعد، سیاست کے میدان میں شیر نیستاں بن کر گرجے، اُن کی زندگی میں بھیگی بلی کی طرح دبک کر بیٹھے رہتے تھے ان نامساعد حالات میں صرف ملک برکت علی کی آواز تھی جو گاہے گاہے بلند ہوتی اور مسلم لیگ کے تنِ نیم جان میں زندگی کی ایک لہر دوڑا جاتی تھی۔

اسمبلی کے اندر اور باہر، اخبارات کے صفحات پر اور پبلک جلسوں کے پلیٹ فارم

پر، دوستوں کی محفل میں اور دشمنوں کے مجمع میں انہوں نے ہر موقع اور ہر مقام پر جس شدت سے یونینسٹ پارٹی پر حملے کئے اُس کی مثال اُس دور میں اور کہیں نظر نہیں آتی۔ ۷ مارچ ۱۹۳۸ء کو پنجاب اسمبلی کے بجٹ سیشن میں تقریر کرتے ہوئے انھوں نے پوری بلند آہنگی سے کہا تھا:۔

"اِس وقت پنجاب میں ایک نہایت غلط قسم کی دفتری حکومت کا سکہ رواں ہے اگرچہ اصطلاحی معنوں میں اب دفتری حکومتیں ختم ہو چکی ہیں لیکن پنجاب پر بدستور یہ لعنت مسلط ہے۔ اس لعنت سے نجات پانے اور اس طلسم کو ہمیشہ کے واسطے پاش پاش کر دینے کے لیے ہمارے صوبے کو سر توڑ محنت کرنا پڑے گی یہ حکومت ایک کابوس کی طرح ہم پر سوار ہے جس نے ہماری ان تمام کوششوں کو بے کار بنا رکھا ہے جو ہم اس مبارک دن کی آمد آمد کے لیے کر رہے ہیں۔ جب ہمارا صوبہ ان بندھنوں اور زنجیروں سے آزاد ہو جائے گا جنھوں نے ماضی میں ہم کو بری طرح جکڑ رکھا تھا۔"

وزیر اعظم سر سکندر حیات خاں:۔ "لیجئے بلی تھیلے سے باہر نکل آئی!"

ملک برکت علی:۔ ہاں۔ بلی تھیلے سے باہر نکل آئی ہے اور یہ بھی سن لیجئے کہ کیوں باہر نکلی ہے۔

"اِس وقت پنجاب میں ایک بدترین قسم کی رجعت پسند حکومت قائم ہے۔ ہمارا فرض ہے کہ اِس حکومت کی کمزوریوں کو واشگاف طور پر بیان کر کے اُسے ختم کرنے کی جدوجہد کریں تاکہ آلام و مصائب کی یہ اندھیری رات جو اس وقت ہمارے صوبے

پر چھائی ہوئی ہے، کسی طرح ختم ہو اور تاریخِ پنجاب کا یہ افسوس ناک باب۔ اپنے انجام کو پہنچے۔ یہ صحیح ہے کہ ہمارے سامنے اکثریت کی ایک سنگین دیوار کھڑی ہے جو اُن لوگوں سے تعمیر کی گئی ہے جن میں خطاب یافتہ رئیس بڑے بڑے زمیندار، آنریری مجسٹریٹ، آنریری سب رجسٹرار، ذیلدار اور دفتری حکومت کے پرانے ہوا خواہ اور کاسہ لیس شامل ہیں۔ لیکن کچھ پروا نہیں، خواہ اس دیوار کو پاش پاش کرنے کے لیے ہمیں برسوں کیوں نہ سر ٹکرانا پڑے ہم اپنی کوششیں جاری رکھیں گے۔"

جب مارچ ۱۹۴۰ء میں آل انڈیا مسلم لیگ نے قراردادِ لاہور منظور کی تو چاروں طرف سے پاکستان کا غلغلہ بلند ہونا شروع ہو گیا تھا۔ سر سکندر، پاکستان کے نقطے سے گھبراتے تھے۔ اُنہی دنوں وہ ایک دفعہ سرکاری دورے پر لائل پور تشریف لے گئے تو مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کے کارکنوں نے خیر مقدم کا ایڈریس پیش کرتے ہوئے پاکستان کا بھی ذکر کر دیا۔ اس پر سر سکندر بگڑ گئے۔ اور نیم تمسخر، نیم تہدید آمیز لہجے میں کہنے لگے۔

"کون سا پاکستان چاہتے ہیں آپ! اس وقت چار قسم کے پاکستان بازار میں آ گئے ہیں۔

ایک وہ ہے جس کا خاکہ جمال الدین افغانی نے پیش کیا تھا۔ دوسرا وہ ہے جسے علامہ اقبال نے تجویز کیا تھا تیسرا وہ ہے جو چودھری رحمت علی کی صنعت کاری کا نمونہ ہے۔ اور چوتھا وہ ہے جو ایک انگریز کی اختراع ہے۔ آخر ان چاروں میں سے کون سا پاکستان آپ

مانگتے ہیں۔"

سٹوڈنٹس فیڈریشن کے بچارے نوعمر ارکان اس طنز کے جواب میں سہم کر چپ ہو گئے، اتفاق کی بات ہے کہ شہر لائل پور میں اس واقعہ کے چند ماہ بعد انہی جواں ہمت و جواں سال طلبہ نے پاکستان کانفرنس منعقد کر ڈالی اور ملک برکت علی کو کانفرنس کا صدر بنایا۔ یوں کہنا چاہیئے کہ قرارداد لاہور کی منظوری کے بعد، تجویز پاکستان کی حمایت میں یہ سب سے پہلی اور سب سے منظم اور سب سے بھرپور آواز تھی، جو سرزمین پنجاب سے اٹھی اور لاریب حد درجہ ناسازگار اور نامساعد حالات میں اٹھی۔

ملک صاحب نے اس کانفرنس میں جو ولولہ انگیز خطبۂ صدارت پڑھا تھا آج بھی اس کا مطالعہ کریں، تو خون کی گردش تیز ہو جاتی ہے۔ حالانکہ اس پر بیس سال کا عرصہ گزر چکا ہے۔ سر سکندر نے جو تمسخر آمیز جواب طلبہ کو دیا تھا اس کا تجزیہ کرنے کے بعد ملک صاحب نے فرمایا:۔

"مسلم لیگ کے سامنے جس پاکستان کا نصب العین ہے اس کا خاکہ آل انڈیا مسلم لیگ کی اس قرارداد میں درج ہے، جو ۲۳ مارچ ۴۰ء کو لاہور میں منظور ہوئی تھی۔ اور جس کی رو سے ہندوستان کے شمال مغرب اور شمال مشرق میں دو مسلم مملکتیں وجود میں لائی جائیں گی اس کے بعد یہ نکتہ ہر شخص پر واضح ہو جانا چاہیئے کہ ہندوستان کے مسلمان جس پاکستان کی تعمیر و تشکیل میں کوشاں ہیں۔ وہ کوئی مشتبہ یا متنازع فیہ شے نہیں۔ بلکہ ایک معین حقیقت ہے۔ جس کی

وضاحت مسلم لیگ کی مذکورہ بالا قرارداد میں کی جا چکی ہے۔ سر سکندر حیات خاں نے تجاہلِ عارفانہ سے کام لے کر، جو سوال مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کے ارکان سے کیا تھا اس کا جواب اگر انھیں درکار ہے۔ تو کان کھول کر سن لیں کہ جس پاکستان کے حصول کو ہم نے اپنا مطمحِ نظر قرار دیا ہے۔ وہ مسلم لیگ اور صرف مسلم لیگ کا پاکستان ہے۔"

اس وقت آبادیوں کے تبادلے کا کسی کو گمان بھی نہیں تھا۔ لیکن ملک صاحب کی دور رس نگاہ نے ان امکانات کا بھی بخوبی جائزہ لے لیا تھا۔ چنانچہ ایک جگہ فرماتے ہیں:—

"میں اس امر کا دوبارہ اعادہ کرنے پر مجبور ہوں کہ جو لوگ یہ اعتراض کرتے ہیں کہ پاکستان بن جانے کے بعد بھی اقلیتوں کا مسئلہ جوں کا توں معلق رہے گا، یا ہندو مسلم قضیہ حل نہیں ہو سکے گا۔ وہ حقیقتاً ان محرکات سے قطعاً بے خبر ہیں۔ جو تحریکِ پاکستان کی پشت پر کارفرما ہیں، ہمارے پیشِ نظر آبادیوں کے تبادلہ کی کوئی سکیم نہیں لیکن ظاہر ہے کہ جو ہندو پاکستان میں رہنا پسند نہیں کریں گے۔ یا جن مسلمانوں کو ہندوستان میں رہنا منظور نہیں ہوگا۔ انھیں نقلِ مکانی کر کے اپنی اپنی قومی مملکتوں میں قیام پذیر ہونے سے کوئی شخص منع نہیں کر سکتا۔ ممکن ہے کہ مستقبل میرے اس خیال پر مہرِ تصدیق ثبت کر دے اور واقعات و تجربات کی تلخیوں سے مجبور ہو کر لوگ نقلِ مکانی پر آمادہ ہو جائیں۔

"کیا یورپ میں آبادیوں کا تبادلہ نہیں ہوا؟ اور کیا اس تبادلے

سے اُس نسلی منافرت کا خاتمہ نہیں ہو گیا جس نے صدیوں سے یورپ میں خون خرابہ پیدا کر رکھا تھا؟ ہمیں یورپ کی تاریخ سے سبق سیکھنا چاہیئے اور جب ہندوستان کی دو بڑی قوموں کے حقِ خود ارادی کا اہم سوال درپیش ہو۔ اس وقت چھوٹی چھوٹی غیر ضروری اور بے مصرف باتوں کی آڑ لے کر حقائق سے روگردانی کرنا عقل مندی نہیں۔"

ملک صاحب کا یہ خطبہ انگریزی میں تھا۔ اور مرحوم جس قسم کی پاکیزہ اور بے عیب انگریزی لکھتے اور بولتے تھے۔ اُس کی مثال مشکل ہی سے کہیں ملے گی۔ آخری پیراگراف میں انہوں نے پورے جوش سے نوجوانوں کو تلقین کی تھی کہ :-

پاکستان کا حصول کوئی آسان کام نہیں۔ اس منزل تک پہنچنے میں آپ کو دشوار گزار گھاٹیوں سے گذرنا ہوگا۔ تنگ و تاریک وادیاں طے کرنا ہوں گی اور بڑی بڑی خوف ناک دلدلوں کو عبور کرنا پڑے گا۔ تاہم مجھے یقین ہے کہ عزم و حوصلہ کی بے باکی اور ایمان و استقلال کی مضبوطی سے آپ راستے کی تمام رکاوٹوں پر فتح پالیں گے۔ حصولِ پاکستان کوئی معمولی مسئلہ نہیں۔ یہ ہماری موت و زیست کا سوال ہے خدارا اس کی اہمیت کو نظر انداز نہ کیجئے یہ کوئی ہنسی کھیل نہیں بلکہ ایک ٹھوس اور پائدار حقیقت ہے۔ جس کے ساتھ مسلمانوں کی تقدیر وابستہ ہو چکی ہے۔ خدارا اس حقیقت کو آنکھوں سے اوجھل نہ ہونے دیجئے..... دل سے ہر قسم کا خوف نکال دو۔ اپنے دماغ کو تذبذب اور شک و شبہ کی الجھنوں سے معاف کر دو۔ اپنی تمام قوتوں کو ایک مرکز پر لا کر جمع کر دو۔ اور پھر میں

تمھیں یقین دلاتا ہوں۔ کہ امیدوں کی اس جگمگاتی ہوئی منزل تک جس کا نام پاکستان ہے، پہنچنا کچھ مشکل نہ ہوگا۔ ..... پاکستان زندہ باد، قائدِ اعظم زندہ باد۔"

قدرت کی ستم ظریفی ہے کہ جس شخص نے حصولِ پاکستان کی جدوجہد کا آغاز اس شان دار اور حریت آموز لہجے میں کیا تھا اور جس کی زندگی بخش للکار نے گرتی ہوئی امیدوں اور مٹتے ہوئے حوصلوں میں ایک نئی جان ڈال دی تھی۔ اُسے منزلِ مقصود تک پہنچنا نصیب نہ ہوا، اور موت کے بے رحم ہاتھ نے جیسے اُس وقت اُسے ہم سے چھین لیا جب رسول کی بادیہ پیمائی کے بعد، ہمارا قافلہ بامراد و کامیاب ہو کر منزل سے ہم کنار ہونے والا تھا۔

قائدِ اعظم اور ملک صاحب کے تعلقات بالکل اِس قسم کے تھے۔ جیسے پُرانے بے تکلف دوستوں کے ہوتے ہیں۔ آپس میں باتیں کرتے وقت وہ اُنھیں صرف جناح کہہ کر خطاب کرتے تھے۔ میں نے جب ابتدا میں یہ بے تکلفی دیکھی تو تعجب ہوا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ملک صاحب کو حفظِ مراتب کا بے حد پاس تھا، چنانچہ چند سال بعد جب قوم نے مسٹر جناح کو قائدِ اعظم کے لقب سے پکارنا شروع کیا تو ملک صاحب بھی خط و کتابت اور گفتگو میں اُنھیں قائدِ اعظم ہی کہہ کر خطاب کرتے تھے۔

جب مئی ۱۹۳۶ء میں پارلیمنٹری بورڈ قائم کرنے کے لیے قائدِ اعظم لاہور تشریف لائے تو میاں فضلِ حسین زندہ تھے۔ قائدِ اعظم کو اُمید تھی کہ اُن کے اشتراک و تعاون سے پنجاب میں بورڈ کی ایک مضبوط شاخ قائم ہو جائے گی۔ لیکن میاں صاحب نے صاف انکار کر دیا۔ اس کے بعد قائدِ اعظم سخت مایوس ہوئے اور اس مایوسی کے عالم

میں اُنھوں نے علامہ اقبال سے اِستمداد کی۔ یہ صحیح ہے کہ اُس نازک وقت میں علامہ مرحوم نے دل کھول کر مدد کی۔ لیکن یہ بھی واقعہ ہے۔ کہ حضرتِ علامہ بیماری کی وجہ سے خانہ نشین ہو چکے تھے۔ اور دوڑ دھوپ کرنے، لوگوں سے ملنے ملانے اور جلسے جلوس مرتب کرنے کا سارا بوجھ ملک صاحب ہی نے اُٹھا رکھا تھا۔

میں خود اُس زمانے میں ملک صاحب کا شریکِ کار تھا اور ساری جدّ و جہد میری آنکھوں کے سامنے ہو رہی تھی، لورینگ کی ٹی پارٹی، نیڈوز ہوٹل کا اجتماع، محمد عظیم خاں ایڈووکیٹ کے ہاں دعوت۔ بھاٹی دروازے کی ایک محفل، احرار لیڈروں سے مذاکرہ، اِتحادِ ملت والوں سے بحث مباحثہ، اِن تمام موقعوں پر ملک صاحب قائدِ اعظم کے ساتھ ساتھ تھے، ملک صاحب کی شبانہ روز محنت اور کاوش کا احساس خود قائدِ اعظم کو بھی تھا۔ وہ یقیناً سمجھتے تھے کہ میاں فضلِ حسین کے انکار اور علامہ اقبال کی بیماری کے بعد پنجاب کی سرزمین میں مسلم لیگ کا پرچم صرف ملک برکت علی کی ہمت سے بلند ہو سکے گا۔

ملک صاحب کی قانونی قابلیت کے متعلق کچھ عرض کرنا بے کار سی بات ہے اُن کی وفات پر عدالتِ عالیہ لاہور کے چیف جسٹس، سر عبدالرشید نے جلسۂ تعزیت میں کہا تھا کہ

"ملک صاحب کے اُٹھ جانے سے قانون کی دُنیا میں جو جگہ خالی ہوئی ہے اُسے عرصۂ دراز تک کوئی شخص پُر نہیں کر سکے گا"

سر محمد شفیع مرحوم کے بعد پنجاب کے کسی مسلمان وکیل کی پریکٹس اِتنی وسیع اور ہمہ گیر نہیں ہوئی تھی۔ جتنی کہ ملک صاحب کی تھی۔ وہ گذشتہ کئی سال سے دیوانی مقدمات

میں لاہور ہائی کورٹ بار کے لیڈر تھے۔ جولائی ۱۹۴۲ء میں جب اُنھوں نے فیڈرل کورٹ کے سامنے سردار سر دُول سنگھ کو لیشر کی نظربندی کے خلاف تین دن تک اپنی معرکتہ الآرا بحث جاری رکھی تھی تو بلا مبالغہ سارا ہندوستان چونک اُٹھا تھا۔ رائے گوپال اچاری نے اس موقع پر ملک صاحب کو تار کے ذریعہ سے ہدیۂ مبارکباد بھیجتے ہوئے لکھا تھا کہ "آج آپ ہندوستان کے چوٹی کے قانون دان ہیں" اُنھیں اپنے کام سے غایت درجہ محبت تھی اور پیشۂ وکالت کی شاندار روایات کو جس تن دہی سے اُنھوں نے برقرار رکھا تھا مشکل ہی سے اُس معیار پر کوئی شخص پورا اُتر سکے گا۔ ۱۹۳۷ء سے ۱۹۴۴ء تک پنجاب اسمبلی میں اُنھوں نے مختلف اوقات میں جو تقریریں کی تھیں اگر اُن کا مجموعہ مرتب کیا جائے تو ہمارے سیاسی ادب میں ایک گراں قدر اضافے کا موجب ہوگا۔ دستور (کانسٹی ٹیوشن) اور پارلیمنٹری قانون کو سمجھنے اور استعمال کرنے میں بہت کم لوگوں کو ملک صاحب کے برابر ملکہ حاصل تھا۔ سر سکندر سے ملک صاحب کے تعلقات بالعموم کشیدہ رہتے تھے۔ لیکن سر سکندر کو اُن کی قانونی قابلیت پر اتنا اعتماد تھا کہ جب کبھی کسی ذاتی معاملے میں قانونی مشورے کی ضرورت محسوس ہوتی تو ملک صاحب ہی سے رجوع کرتے تھے۔ یہی حال ملک خضر حیات خاں ٹوانہ کا تھا، جب وہ ۱۹۳۷ء میں پنجاب اسمبلی کی رکنیت کے اُمیدوار کھڑے ہوئے تو کاغذاتِ نامزدگی پُر کروانے کے لیے ملک صاحب مرحوم کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے۔ ۱۹۳۸ء میں ملک صاحب نے مسجدِ شہید گنج کی بازیابی کے لیے علامہ اقبال کے مشورے سے ایک مسودۂ قانون پنجاب اسمبلی میں پیش کیا تھا جو برسرِ اقتدار پارٹی کی مہربانی سے منظور نہ ہو سکا۔

جولائی میں ہائی کورٹ بند ہوتا۔ تو ملک صاحب ڈلہوزی چلے جاتے تھے۔ وہاں بھی اُن کا ایک عالی شان بنگلہ تھا سال بھر میں بھی ڈیڑھ ایک مہینہ اُن کی تفریح یا آرام کا زمانہ تھا۔ عدالتِ عالیہ بند ہونے سے ہفتہ بھر پہلے مجھ سے اصرار شروع ہو جاتا کہ ڈلہوزی کے لیے رختِ سفر باندھ لو۔ میں حیل حجت اور تامل سے کام لیتا۔ تو حیران ہو کر پوچھتے "بندۂ خدا، لاہور میں بلا کی گرمی پڑ رہی ہے۔ یہاں رہ کر کیا کرو گے؟"

میں بدستور آج کل میں آنے کا وعدہ کر کے ٹال مٹول کرتا تو کسی قدر ناراض ہو کر فرماتے "ساری عمر لاہور میں گزار دی ہے تم نے ابھی لاہور میں رہ کر جی نہیں بھرا، چلو تیار ہو جاؤ، ڈلہوزی میں دیوانِ غالب اکٹھے بیٹھ کر پڑھیں گے۔"

وہ سچ کہتے تھے۔ ڈلہوزی میں اُن کا ایک محبوب مشغلہ دیوانِ غالب کا مطالعہ بھی تھا۔ انھیں شعر و ادب کا بہت اچھا ذوق تھا۔ ابتدائی عمر میں سر عبدالقادر کے مخزن میں کچھ ولولہ مضمون نگاری بھی کی تھی لیکن پھر قانونی مصروفیتوں نے اس شوق کو دبا دیا تھا۔ ڈلہوزی تشریف لے جاتے تو وہاں سے خط پر خط لکھ کر مجھے یاد فرماتے اور جب دیکھتے کہ خطوں کا کچھ اثر نہیں ہوتا تو ڈلہوزی میں مسلم لیگ کے جلسے کے انعقاد کا اعلان کر کے مجھے باضابطہ حاضر ہونے کا حکم دیا جاتا تھا۔ یہ گویا میری طلبی کا سرکاری پروانہ تھا جس سے سرتابی محال تھی۔

لاہور میں تو اُن کی مصروفیتوں کا شمار نہیں تھا۔ تنہا وکالت کا روز افزوں کام اتنا زیادہ تھا کہ اُسی سے فرصت نہ ملتی تھی۔ اس پر اسمبلی کے ہنگامے جلسوں جلوسوں کی شرکت، مسلم لیگ کی ہمہ گیر تنظیم، اخباری نمائندوں سے ملاقاتیں، اسلامیہ کالج کمیٹی کی سیکرٹری شپ، ہفتہ وار نیو ٹائمز کے لیے مقالۂ افتتاحیہ لکھوانا۔ اور پھر ان تمام کاموں

پر مستزاد یہ کہ ہم جیسے بے فکروں کے لیے بالالتزام گپ کا وقت نکالنا بھی۔ گویا اُن کے نزدیک فرائضِ منصبی میں شامل تھا۔

اکثر ایسا ہوتا کہ اپنے دفتر میں بیٹھے قانون کی کسی ضخیم کتاب کا مطالعہ کر رہے ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ نیو ٹائمز کا مقالہ بھی سٹینو گرافر کو لکھوایا جا رہا ہے۔ دوسری طرف ایک مؤکل بیٹھا اپنے مقدمہ کی روئداد بیان کر رہا ہے۔ جس کا ہر لفظ غور سے سُنا جا رہا ہے، سامنے ہیں اور پیر تاج الدین آرام کرسیوں پر دراز یونینسٹ پارٹی کے کسی تازہ چٹکلے پر قہقہہ لگا رہے ہیں۔ اور ملک صاحب ہیں کہ ہماری ہنسی میں برابر کے شریک ہیں۔ اور لطیفہ کی داد دینے کو ہمہ اوقات تیار۔ بیک وقت اِن مختلف النوع کاموں میں اُن کی یکسوئی حیرت انگیز تھی۔

ملک صاحب اور پیر تاج الدین کی طبیعتوں میں بُعد المشرقین تھا لیکن دوستی تھی کہ زوروں سے نبھ رہی تھی، سردی، گرمی جاڑا برسات۔ کوئی موسم ہو، پیر صاحب کے شام کے پھیرے میں ناغہ نہ ہوتا تھا۔ اگر نہ آتے۔ تو ملک صاحب ہزار کام چھوڑ کر ان کی خبر پوچھنے کو جاتے تھے۔ ۱۹۲۹ء سے ملک صاحب کو ذیابیطس کی شکایت تھی۔ لیکن کھانے پینے میں احتیاط اور روزمرہ زندگی میں باقاعدگی اختیار کرنے سے اُن کی صحت بالعموم اچھی رہتی تھی۔ اِبتدا میں پُر تکلف کھانا کھانے کی عادت تھی، لیکن اب مدت سے غذا نہایت سادہ ہو گئی تھی، کام سے اُنھیں بے اِنتہا شغف تھا۔ کئی بار ایسا ہوا کہ رات کے گیارہ بارہ بجے وہ کسی جلسے سے فارغ ہو کر آئے اور آتے ہی خواب گاہ میں جانے کی بجائے اپنے دفتر میں بیٹھ کر دوسرے دن پیش ہونے والی اپیلوں کی تیاری میں مصروف ہو گئے۔

ستمبر ۱۹۴۵ء میں پہلی بار اُن پر قلب کی بیماری کا حملہ ہوا۔ شملہ میں اُنھوں نے ایک پبلک جلسے میں تقریر کی تھی اور واپس قیام گاہ کو جاتے ہوئے اُن کے دل میں یک لخت درد اُٹھا۔ جب لاہور آئے تو ڈاکٹروں نے نہایت غور سے معائنہ کیا۔ اور مکمل آرام کا مشورہ دیا۔ جنوری ۱۹۴۶ء تک آرام کرنے سے اُن کی صحت بظاہر بہت اچھی ہو گئی تھی۔ فروری کے اوائل میں انھیں اپنے الیکشن کے سلسلہ میں ایک روز کے لیے جالندھر جانا پڑا اور وہاں لوگوں کے اصرار پر ایک جلسے میں تقریر بھی کی واپسی پر پھر تکلیف ہو گئی لیکن مارچ کے شروع میں اُنھوں نے اپنے آپ کو کام کرنے کے قابل سمجھ کر ہائی کورٹ جانا شروع کر دیا، چند روز کی محنت سے پھر تکلیف عود کر آئی لیکن اب ان کی حالت یہ تھی کہ وہ بستر پر لیٹنے سے انکار کرتے تھے، کئی بار دوستوں اور عزیزوں نے سمجھایا کہ کام ترک کر دیجئے، خود قائدِ اعظمؒ نے بھی مشورہ دیا اور فرمایا کہ وہ اُنھیں بعض ریاستوں کا قانونی مشیر مقرر کرائے دیتے ہیں۔ تاکہ گھر بیٹھے اطمینان سے، چند ہزار روپے کی ماہانہ رقم مل جایا کرے اور فکرِ معاش باقی نہ رہے، لیکن اُن کی طبیعت میں اب آہستہ آہستہ صحت سے بے پروائی پیدا ہو رہی تھی، چنانچہ بعض بے تکلف دوستوں سے، اُنھوں نے کہا کہ میں بستر پر لیٹ کر مرنے کی بہ نسبت کام کرتے ہوئے مر جانے کو ترجیح دوں گا۔

آخر یہی کچھ ہوا۔ ۵ اپریل ۱۹۴۶ء کو جمعہ کے روز گیارہ بجے، سپیشل ٹریبونل کے سامنے وہ ایک اہم مقدمے میں پیش ہوئے، ایک گواہ پر جرح کر رہے تھے کہ یکایک نڈھال ہو کر کرسی پر بیٹھ گئے اور سر میز پر رکھ دیا اور دو منٹ کے اندر اپنی جان، جان آفریں کے حوالے کر دی۔ ؎

قسمت نگر کہ کشتۂ شمشیرِ عشق یافت

مرگے کہ زندگاں بہ دعا آرزو کنند

انتقال سے چند روز پہلے راقم التحریر سے بڑی دیر تک آئندہ کے متعلق گفتگو کرتے رہے۔ اُن کا ارادہ تھا کہ سپیشل ٹریبونل کے مقدمے سے فارغ ہو کر جوں جوں وکالت ترک کر دیں گے لیکن سب سے زیادہ الجھن انھیں اِس بات سے ہوتی تھی کہ بے کاری کا وقت کیوں کر گزرے گا۔ اِس بارے میں راقم السطور نے اُن کے سامنے چند تجاویز پیش کیں۔ جو کم و بیش اُن کے ذوق کے مطابق تھیں اور جن پر عمل کرنے سے زیادہ مشقت بھی نہیں کرنی پڑتی تھی، اِس مجوّزہ پروگرام کی بعض شقوں سے انھیں اتفاق تھا اور بعض کو اُنھوں نے نظرِ ثانی کے لیے مخصوص کر لیا تھا، افسوس کہ نظرِ ثانی کی نوبت بھی نہ آئی اور وہ خود ہی، کشاکشِ عمل سے نجات پا کر اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔

ملک صاحب کی وفات پر مجھے بے اختیار مولانا حالی کا وہ مرثیہ یاد آ رہا ہے جو اُنھوں نے نوّاب محسن الملک کے انتقال پر لکھا تھا آج ملک صاحب کے حادثۂ ارتحال پر بھی اگر کوئی نوحہ لکھا جائے گا تو اُس میں اظہارِ جذبات کا یقیناً وہی انداز ہو گا جو حالی نے اختیار کیا ہے۔ یہ مرثیہ مطبوعہ دیوان حالی میں نہیں ہے اُس کے چند اشعار درج کرتا ہوں۔

جس وقت کا دھڑکا تھا وہ وقت آ گیا آخر

یاروں پہ مصیبت کا سماں چھا گیا آخر

وہ ملک کا محسن، وہ مسلمانوں کا غمخوار
سر کر کے مہم، قوم کے کام آ گیا آخر

رہنا تھا بس قوم کی تقدیر میں بے کس
لکھا ہوا تقدیر کا پیش آ گیا آخر

نکبت کا پتہ ڈھونڈتا پھرتا تھا مقدر
نکبت کا مقدر بھی پتہ پا گیا آخر

جیتا تھا تو لوگوں کو گماں اس پہ تھا کیا کیا
پر مر کے خلوص اپنا وہ منوا گیا آخر

جو خندہ زنی کرتے تھے ہر کام پہ اس کے
وہ خون کے آنسو انھیں رلوا گیا آخر

یوں جیتے ہیں یوں مرتے ہیں قوموں کے فدائی
دنیا کو تماشا یہ وہ دکھلا گیا آخر

سر عبدالقادر

ہے کدھر قیس، کہاں ہے فرہاد
عشق سے نام چلا جاتا ہے

شیخ صاحب[1] کو میں نے پہلی مرتبہ کب اور کہاں دیکھا تھا؟ اس بارے میں حافظہ کچھ ٹھیک رہنمائی نہیں کرتا۔ وقت کے ساتھ ساتھ بہت سی باتیں خلط ملط ہو گئی ہیں۔ تاہم کچھ دھندلی سی یاد ہے کہ میں کالج میں پڑھتا تھا اور تقسیم انعامات کے سالانہ جلسے کی صدارت کے لیے شیخ صاحب تشریف لائے تھے۔ وہیں پہلی بار اُن کی زیارت ہوئی تھی۔ دُہرا بدن، میانہ قد اور رعب دار شخصیت تھی۔

---

[1] سر عبدالقادر کو اُن کے دوست، نیاز مند اور مداح ہمیشہ شیخ صاحب کے محبوب لقب سے یاد کرتے تھے۔ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی مرحوم تو انھیں شیخِ پنجاب کہا کرتے تھے۔

اعلیٰ درجے کا انگریزی لباس زیبِ تن تھا۔ کشادہ پیشانی کے ساتھ چہرے پر گھنی داڑھی بھی تھی جس نے شکل و صورت کو زیادہ پر وقار بنا دیا تھا۔

والدِ مرحوم و مغفور مخزن کے اوّلین خریداروں میں تھے اور پرچہ برابر ہمارے ہاں آتا تھا۔ میں نے جب ہوش سنبھالا تو اُردو کی جن کتابوں نے مجھے بہت جلد اپنی طرف متوجہ کیا۔ اُن میں مخزن کی پُرانی جلدیں بھی تھیں جو بہت احتیاط سے دیوان خانے کی الماریوں میں رکھی ہوئی تھیں۔ شیخ صاحب کا نام رسالے کے سرورق پر ایڈیٹر کی حیثیت سے چھپتا تھا۔ اِس طرح اُن کے نام سے آشنا ہونے کا موقع مجھے بہت پہلے مل گیا تھا۔

شیخ صاحب کا آبائی وطن قصور تھا۔ بی۔اے انھوں نے ۱۸۹۴ء میں فارمن کرسچین کالج سے درجۂ اوّل میں پاس کیا تھا۔ سر شادی لال، جو بعد میں لاہور ہائی کورٹ کے پہلے ہندوستانی چیف جج بنے، شیخ صاحب کے ہم جماعت تھے۔ اور انھوں نے بھی بی۔اے کے امتحان میں درجۂ اوّل کی کامیابی حاصل کی تھی۔ شادی لال تو کالج سے نکلتے ہی بیرسٹری کے لیے انگلستان چلے گئے لیکن اس سلسلہ میں تعجب کی بات یہ ہے کہ شیخ صاحب نے اُس وقت قانون کے پیشے کی طرف کسی رغبت کا اظہار نہ کیا۔ سال بھر انھوں نے ضلع میانوالی میں عیسیٰ خیل ایسے دُور اُفتادہ مقام پر بسر کیا۔ پھر لاہور تشریف لائے اور ہفت روزہ اخبار آبزرور کے ایڈیٹر ہو گئے۔ آبزرور اُن دنوں پنجاب میں مسلمانوں کا واحد انگریزی اخبار تھا۔ شیخ صاحب اگر چاہتے تو اچھی سے اچھی سرکاری ملازمت حاصل کر لینا کچھ مشکل نہ تھا۔ لیکن اِس ضمن میں بھی انھوں

نے بے نیازی اور بے پروائی کا حیرت انگیز ثبوت دیا۔

اپریل ۱۹۰۱ء میں انھوں نے مخزن جاری کیا اور یوں قدرت نے اُن کے ہاتھوں ایک ایسے کارنامے کا آغاز کرایا۔ جس نے آگے چل کر عبدالقادر کے نام کو حیاتِ جاوداں اور اُن کی شخصیت کو بقائے دوام بخشی۔ اگر یہ سوال کیا جائے کہ برِ عظیم ہند میں وہ کون سے دو جرائد تھے جن کے اجرا سے اُردو ادب کے دھارے کا رُخ یکسر بدل گیا تو میں بے تکان جواب دوں گا کہ سر سید احمد خاں کا تہذیب الاخلاق اور سر عبدالقادر کا مخزن۔

جس طرح تہذیب الاخلاق نے ایک نئے عہد کی تخلیق کی، اُسی طرح مخزن بھی ایک نئے دَور کا نقیب بنا۔ تہذیب الاخلاق کے نمودار ہوتے ہی پرانے تعصبات کے سائے چھٹ گئے اور وہ تکلفات جنھوں نے زبان کو بندشوں میں جکڑ کر نیم جاں بنا رکھا تھا آناً فاناً رفع ہو گئے۔ اِسی طرح مخزن کے طلوع ہوتے ہی وہ پُرانی روایات ختم ہو گئیں جنھوں نے تعلیم یافتہ نوجوانوں کو ادبِ اُردو سے بیگانہ بنا رکھا تھا۔ بلاشبہ تہذیب الاخلاق نے ہماری موجودہ نثر کی بنیاد رکھی۔ اور مخزن نے اُس نثر کو مغربی زبانوں کے پرتو سے اِس قدر چمکایا کہ وہ جدید علوم کی سرمایہ دار بن گئی۔ یہ شرف مخزن ہی کو حاصل ہے کہ اُس نے نئی نسل کے نوجوانوں میں اپنی زبان کا ایسا والہانہ ذوق پیدا کر دیا کہ آئندہ ادبِ اُردو کے فروغ کی ہر تحریک اِسی نثرِ اُردو کے ہاتھ میں آ گئی۔

عبدالقادر کوئی انتہا پسند سیاسی رہنما نہ تھے۔ نہ اُنھوں نے اُس وقت

جب سیاست کی آندھیوں سے مطلع تاریک ہو رہا تھا عام لوگوں کی طرح انقلابی جھنڈا ہاتھ میں تھام کر گلی کوچوں میں نعرے لگائے۔ لیکن یہ بات بلاخوفِ تردید کہی جا سکتی ہے کہ قوم کے اندر خود اعتمادی پیدا کرنے اور اسے سربلند و گردن کشاں ہو کر چلنے کی جو خدمت عبدالقادر کے ہاتھوں انجام پائی وہ کسی اور سے نہ بن آئی۔ انیسویں صدی کے آخر، اور بیسویں صدی کے اوائل میں برطانوی حکومت کا دبدبہ ہمارے جسموں کو چیرتا ہوا ہماری روحوں کے اندر اتر گیا تھا۔ سیاسی غلامی تو بہرحال مقدر میں لکھی جا چکی تھی۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ ذہنی غلامی کا یہ عالم تھا کہ کالجوں کے تعلیم یافتہ نوجوان اپنے سرمایۂ شعر و سخن سے متنفر۔ اپنی زبان سے بے پروا اور اپنے اسلاف کے ادبی کارناموں سے غافل تھے۔ انگریزی کی شدبد نے ہمیں شیکسپیر اور بائرن سے یوں ہی سا روشناس کر دیا تھا۔ لیکن حکمران قوم کے شاعروں سے یہ سرسری سی آشنائی بھی ہمارے لیے قیامت ثابت ہوئی۔ اور ہمیں اب غالب و میر بھی ذرۂ ناچیز کی طرح بے حقیقت نظر آنے لگے۔

سرسید کی تعلیمی تحریک اپنی جگہ بالکل درست اور اقتضائے وقت کے مطابق تھی۔ لیکن اس کا ایک منفی پہلو، جس سے تحریک کے حامیوں نے آنکھیں بند کر لی تھیں، یہ بھی تھا کہ قدیم ادب قطعاً بے کار ہے۔ اور قوم کے اندر اگر نئی زندگی پیدا کرنا مقصود ہے تو اس ادب کو بھول جانا ہوگا۔ چنانچہ نتیجہ یہ ہوا کہ مصنوعی قسم کی افرنگیت کی جڑیں تو، کوشش کے باوجود، ہمارے دل و دماغ میں گھر نہ کر سکیں۔ لیکن سحرِ فرنگ کے ہاتھوں وہ عمارت یقیناً مسمار ہو گئی،

جس کی بنیادیں ماضی کی قدیم روایات پر کھڑی تھیں۔ کوئی قوم ماضی سے بے نیاز ہو کر ایک دن زندہ نہیں رہ سکتی۔ علی گڈھ کے بانی یقیناً اس نکتے کو خوب سمجھتے ہوں گے۔ لیکن مغربی تہذیب نے انھیں اس قدر مرعوب کر دیا تھا کہ اب اُن کی نظریں پیچھے کی طرف اٹھتی ہی نہ تھیں۔ غور و فکر کی بے بسی اور ذوق و نظر کی شکست خوردگی کا یہ عالم تھا، جب عبدالقادر نے بسم اللہ مجریہا کہہ کر مخزن کی کاغذی ناؤ کو سمندر کی موجوں کے حوالے کر دیا۔

مخزن کا اجرا بلاشبہ ایک نئے دور کی آخر نیش تھا۔ امیر۔ داغ۔ جلال، مجروح۔ تسلیم قدیم شاعری کی چند جھلملاتی ہوئی شمعیں اگرچہ موجود تھیں لیکن اہلِ نظر جانتے تھے کہ یہ بساط بھی چند روز میں اُلٹ جانے والی ہے۔ اور پھر زمانے کے بدلتے ہوئے تیور ہماری معاشرت و معیشت کے علاوہ ہمارے ادب میں بھی اس حد تک انقلاب پیدا کر دیں گے کہ اگر وقت کی رفتار کے ساتھ قدم آگے نہ بڑھایا تو پرانا ادب یقیناً متروک قرار پائے گا۔ اور نئے ادب کا تصور ایک خوابِ پریشاں کی طرح بکھر کر رہ جائے گا۔ عبدالقادر کی عظمت کا ایک بیّن ثبوت یہ ہے کہ انھوں نے سب سے پہلے اس کیفیت کا جائزہ لیا۔ دلّی و لکھنؤ کی طرح پنجاب میں جامد قسم کی ادبی روایات سرے سے ناپید تھیں۔ اس لیے یہاں ذہن و فکر میں وہ لچک موجود تھی جو ہر جدید اور خوش آیند تحریک کو قبول کرنے کے لیے ضروری ہوتی ہے۔ چنانچہ مخزن کی نشو و نما کے لیے جو قدامت کا مداح اور جدت کا پیغام بر تھا، لاہور سے زیادہ سازگار زمین ہندوستان بھر میں کہیں نہ ہو سکتی تھی۔

دُنیائے ادب میں عبدالقادر کا صحیح مقام متعین کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ ہم ایک بنیادی حقیقت کو آنکھوں سے اوجھل نہ ہونے دیں۔ عین اُس وقت جب دلی میں لال قلعہ آباد تھا۔ اور بادشاہ سے لے کر گنجڑے قصائی تک شعر و سخن کی شراب میں مست تھے۔ جب غالب، ذوق، مومن، آزردہ، شیفتہ، صہبائی کی نغمہ سنجیوں نے چاروں طرف دھوم مچا رکھی تھی۔ اور اُدھر لکھنؤ میں شاہانِ اودھ کے زیرِ سایہ آتش، ناسخ، انیس، دبیر، مصحفی، انشاء چمنستانِ ادب میں نئے برگ و بار پیدا کرنے میں مصروف تھے، پنجاب میں اُردو لکھنے، بولنے، پڑھنے والا شخص ڈھونڈے سے بھی نہیں ملتا تھا۔ ۱۷۹۸ء سے لے کر ۱۸۴۹ء تک پنجاب پر رنجیت سنگھ اور اُس کے جانشینوں کی حکومت رہی اور اِس نصف صدی میں وہ اندھیر مچا کہ شعر و شاعری تو بڑی چیز ہے۔ معمولی نوشت و خواند کے چراغ گُل ہو گئے۔ مارچ ۱۸۴۹ء میں جب انگریزوں نے لاہور پر قبضہ کیا تو اِس شہر کی آبادی ساٹھ ہزار تھی۔ حالانکہ شاہ جہاں کے عہد میں اس عروس البلاد کی آبادی دس لاکھ تک پہنچ گئی تھی۔ اور لاہور اُس وقت کے پیرس اور لندن سے کہیں بڑا شہر تھا۔

۱۸۵۷ء کے غدر کے بعد دلی کے آسمانِ ادب کے چند ٹوٹے ہوئے ستارے گردشِ روزگار کے ہاتھوں لاہور آ گئے۔ جن میں حالی اور آزاد سب سے زیادہ قابلِ ذکر ہیں۔ اِن لوگوں نے دلی مرحوم کی یاد میں یہاں بھی شعر و سخن کی محفلیں جمانا شروع کیں۔ اور یوں سرزمینِ پنجاب کے لوگ اُن ادبی روایات سے پہلی مرتبہ آشنا ہوئے جو ایک صدی سے زیادہ مدت ہوئی دلی سے نکل کر لودھ۔

مرشد آباد۔ عظیم آباد اور حیدر آباد ایسے دور افتادہ مقامات میں اپنا گھر بنا چکی تھیں۔ یوں کہنا چاہیئے کہ پنجاب میں پہلی نسل کے لوگوں نے تو حالی آزاد۔ ارشد وغیرہ کو اردو بولتے ہوئے سنا۔ اور دوسری پشت میں ہمارے یہاں جو لوگ پیدا ہوئے اُن میں عبدالقادر۔ اقبال۔ ظفر علی خاں۔ خوشی محمد ناظر محمد دین فوق۔ محبوب عالم وغیرہ شامل تھے۔ جو اُس وقت بھی کمالِ فن کے اعتبار سے خداوندانِ سخن تھے اور آج بھی اِس میدان میں اُن کا کوئی شریک و سہیم نظر نہیں آتا۔ لطف یہ ہے کہ یہ سب کچھ ایسی حالت میں ہوا کہ پنجاب کو نہ قیصر باغ لکھنؤ کی داد و دہش نصیب تھی۔ اور نہ لالی قلعہ کی سرپرستی۔ نہ دربارِ مرشد آباد کی سخن پروری میسّر تھی اور نہ آصف جاہ دکن کی دستگیری۔

پندرہ بیس سال ہوئے میرے ایک مُنصف مزاج لیکن سخن فہم دوست نے اسی موضوع پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے ایک بے نظیر بات کہی تھی۔ فرمانے لگے کہ یو۔ پی میں اُردو خود رَو ہے۔ اِس لیے خود بین و خود پرست بھی ہے۔ دکن میں اُردو بادشاہ کے سایۂ عاطفت میں پھلی پھولی ہے۔ اِس لیے عوام سے دُور دُور رہتی ہے۔ لیکن پنجاب میں اُردو کے درخت کو خونِ عشاق سے سینچا گیا ہے۔ اِس لیے اِس میں ہمارے دل کی دھڑکنیں اور جگر کی کاوشیں شامل ہیں۔

مخزن کا اِجرا اِنہی دھڑکنوں اور کاوشوں کا نتیجہ تھا۔ سید سلیمان ندوی مرحوم نے ایک مرتبہ ذکر کیا تھا کہ جب مخزن نکلا تو وہ ندوہ میں طالب علم تھے، اور حماسہ

اُن کے درس میں تھی۔ مخزن کے حُسن و جمال کو دیکھ کر اُن کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ بلاشبہ یہ حُسن و جمال ظاہری اور معنوی دونوں پہلوؤں پر چھایا ہوا تھا۔ مخزن کے پرانے پرچے آج بھی موجود ہیں کتابت و طباعت دیکھیے تو یوں معلوم ہوتا ہے گویا موتیوں کی افشاں چُنی ہوئی ہے۔ کاغذ ولائتی تھا۔ اور ہر پرچے میں بلاک کی ایک تصویر ہوتی تھی۔ لاہور میں بلاک سازی کا کوئی کارخانہ نہیں تھا۔ تصویریں کلکتہ بھیجی جاتی تھیں، اور وہاں سے بلاک بن کر آتے تھے۔ اِس اہتمام پر بے دریغ روپیہ صرف ہوتا تھا۔ اور عبدالقادر خود تنگی ترشی کی زندگی بسر کرتے۔ لیکن مخزن پر ایک ایک پیسہ خرچ کر ڈالتے تھے۔

مخزن جاری ہوتے ہی ایک ادبی انقلاب رُونما ہوا۔ ہندوستان کا انگریزی خواں طبقہ جو قدیم خیال کے بزرگوں کے نزدیک گویا ذوقِ ادب سے یکسر محروم تھا یکایک جاگ اُٹھا۔ اس طبقہ میں علی گڑھ۔ لاہور۔ دہلی حیدرآباد اور پٹنہ کے وہ نوجوان شامل تھے جنھوں نے ایک طرف جدید تعلیم سے اپنے دماغ کو روشن کیا تھا اور دوسری طرف قدیم روایات کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا تھا۔ ان لوگوں میں اقبال۔ سجاد حیدر یلدرم۔ ظفر علی خاں۔ محمد علی۔ مرزا محمد سعید۔ غلام بھیک نیرنگ۔ اعجاز حسین۔ شاہ دین ہمایوں، خوشی محمد ناظر، حسرت موہانی۔ تلوک چند محروم۔ شو نرائن شمیم، دیا نرائن نگم وغیرہ شامل تھے۔ اِن نوجوانوں کے ساتھ ساتھ جلال۔ تسلیم۔ رسا۔ سائل، مہدی مجروح۔ محمد حسین آزاد۔ شبلی اور حالی بھی مخزن کی آراستہ کی ہوئی بزمِ سخن میں موجود تھے۔ قدیم رنگِ تغزل کے پہلو بہ پہلو جدید رنگ کی نظمیں

چھپتی تھیں۔ اور پرانی نثر کے ساتھ ساتھ مغربی طرز کے افسانے بھی دیکھنے میں آتے تھے۔ اقبال کی شاعری کو پہلی مرتبہ مخزن ہی نے عوام سے روشناس کرایا۔ ابوالکلام آزاد۔ سجاد حیدر یلدرم۔ سلیمان ندوی اور حسن نظامی کے مضامین پہلی بار مخزن ہی میں شائع ہوئے۔ سید سلیمان ندوی کہتے تھے کہ "ندوہ کی طالب علمی کے زمانے میں میں نے اپنا پہلا مضمون وقت کے عنوان سے لکھ کر مخزن کو بھیجا تو شائع ہو گیا۔ اس مضمون کے چھپنے سے جتنی خوشی مجھے ہوئی وہ بیان سے باہر ہے اس کے بعد میں نے اپنی زندگی میں ہزاروں صفحے سیاہ کئے۔ بڑی بڑی ضخیم کتابیں لکھیں۔ دنیا نے توقع سے بڑھ کر داد بھی دی۔ لیکن جو خوشی مخزن میں اپنا پہلا مضمون چھپنے کے بعد ہوئی تھی وہ دوبارہ حاصل نہ ہوئی۔"

مخزن کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے قوم کے نونہالوں کو احساسِ کمتری سے نجات دلا کر ذہنی غلامی سے آزاد کیا۔ ان میں خود اعتمادی کی روح پیدا کی اور ان کو اپنے ادبی سرمائے کی ترتیب و تدوین کی طرف متوجہ کیا۔ چراغ سے چراغ جلتا ہے۔ چنانچہ دیکھتے ہی دیکھتے اردو کے خدمت گزاروں کی فہرست میں ایسے ایسے نام شامل ہونے لگے جن کے متعلق آج گمان بھی نہیں ہو سکتا کہ یہ لوگ بھی ادب سے دلچسپی رکھتے ہوں گے۔ مخزن کے اولین دور کے مضمون نگاروں میں سر فضل حسین۔ سر علی امام۔ سر منوہر لال سر عبداللہ المامون سہروردی۔ سر تیج بہادر سپرو اور سر جوگندر سنگھ کے نام نظر آتے ہیں۔ یہ لوگ اس زمانے میں نوجوان تھے۔ اور زبان و ادب کی خدمت کے ولولے نے انھیں بھی سرشار کر رکھا تھا۔

مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی نے مارچ ۱۹۲۹ء میں لکھا تھا۔

"بیسویں صدی کا آغاز ادبِ اُردو کے لیے فالِ خیر تھا کہ رسالہ مخزن لاہور سے نکلا۔ اور اسمِ بامسمّیٰ نکلا۔ ادب کے خزانے لُٹائے ٹکسالی مضمونوں سے دل و دماغ کے دامن بھر دیئے۔ یہ ایک "شیخ" کا تصرّف تھا کہ انگریزی دان طبقہ اُردو ادب سے آشنا ہُوا۔"

شیخ صاحب اگرچہ بعد میں مخزن سے الگ ہو گئے اور اُن کے مشاغل نے نئی صورت اختیار کر لی۔ لیکن اُن کا ذوقِ ادب بدستور قائم رہا اور اُن کی سرپرستی میں ہمیشہ نئے نئے ادیب پروان چڑھتے رہے۔ برطانوی حکومت کے زمانے میں بڑے سے بڑا منصب جس کی ایک ہندوستانی آرزو کر سکتا تھا۔ شیخ صاحب کے حصّہ میں آیا۔ پنجاب کی مجلسِ قانون ساز کی صدارت اور وزارت پر وہ فائز رہے۔ ہائی کورٹ کے جج وہ بنے۔ وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کی رکنیت پر وہ سرفراز ہوئے۔ وزیرِ ہند (لندن) کے مشیر وہ بنے جمعیتِ اقوام (جنیوا) کے اجلاس میں اُنھوں نے ہندوستان کی نمائندگی کی۔ اِن مناصب کے علاوہ ہندوستان کی ہر قابلِ ذکر انجمن کی صدارت اُن کے حصّے میں آئی۔ مسلم لیگ۔ مسلم ایجوکیشنل کانفرنس۔ ندوۃ العلما۔ اُردو کانفرنس۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کانووکیشن۔ اِن تمام عظیم الشان اداروں کی کرسیٔ صدارت پر وہ وقتاً فوقتاً رونق افروز ہوتے رہے۔ اور اہلِ نظر جانتے ہیں کہ صدارت کا جو ملکہ قدرت نے شیخ صاحب کو عطا کیا تھا وہ مشکل ہی سے کسی اور کے حصّے

میں آیا ہوگا۔ متانت اور وقار کے ساتھ ساتھ بذلہ سنجی اور حاضر جوابی سے وہ ایوان میں ایک نہایت لطیف اور دل خوش کن فضا پیدا کر دیتے تھے۔

اُن کی جان پہچان اور تعلقات کی وسعت کا یہ عالم تھا کہ سر سید احمد خاں سے لے کر سید عطاء اللہ شاہ بخاری۔ اور داغ سے لے کر حفیظ جالندھری تک ہر شخص سے اُن کے یکساں مراسم تھے۔ باتیں کرنے پر آتے یا گذری ہوئی صحبتوں کا حال بیان کرتے تو سماں باندھ دیتے تھے۔ حافظے کی یہ کیفیت تھی کہ نصف صدی قبل کے واقعات اُن کے ذہن میں یوں محفوظ تھے۔ گویا کل کی بات ہے تفصیلات اور جزئیات تک انھیں یاد تھیں۔ ایک روز فنِ خطابت پر گفتگو ہو رہی تھی۔ محفل میں کسی شخص نے سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی سحر کلامی کی بہت تعریف کی۔ شیخ صاحب کہنے لگے "ہاں بھائی عطاء اللہ شاہ بخاری خوب بولتے ہیں۔ لیکن محسن الملک مرحوم بھی کسی سے کم نہ تھے"۔

پھر انھوں نے محسن الملک کی جادو بیانی کا ذکر کرتے ہوئے دو واقعات سنائے کہنے لگے "سنہ ۱۹۰۹ء میں یو پی کے لفٹننٹ گورنر سر انٹونی مکڈانل نے اردو کے خلاف مہم شروع کی تو نواب محسن الملک نے اِس مہم کا جواب دینے کے لیے لکھنؤ میں ایک بہت بڑا جلسہ کیا۔ جس میں میں بھی شریک ہوا۔ محسن الملک نے اس جلسے میں جس جوش و خروش سے تقریر کی۔ اُس کی نظیر میں نے پہلے نہیں دیکھی تھی۔ یوں سمجھئے کہ الفاظ کا لاوا تھا جو اُبل اُبل کر پہاڑیں سے نکل رہا تھا۔ آخر میں محسن الملک نے یہ کہتے ہوئے کہ اگر حکومت اردو کو مٹانے ہی پر تل گئی ہے تو بہت اچھا۔ ہم اردو کی لاش کو گومتی میں بہا کر خود بھی ساتھ ہی مٹ

جائیں گے۔ ایک والہانہ انداز میں یہ شعر پڑھا:۔

چل ساتھ کہ حسرت دلِ محروم سے نکلے
عاشق کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے نکلے

اس شعر کے ساتھ ہال میں تحسین و آفرین کا وہ شور اٹھا کہ یوں معلوم ہوتا تھا گویا چھت اڑ جائے گی؟

پھر دوسرا واقعہ یوں بیان کیا کہ "جب بادشاہ جارج پنجم ولی عہدِ سلطنت کی حیثیت سے ہندوستان آئے تو ہز ہائی نس آغا خاں کی سعی و کوشش سے وہ چند گھنٹوں کے لیے علی گڑھ بھی تشریف لے گئے تھے۔ علی گڑھ کے اربابِ حل و عقد آغا خاں کی اس کرم فرمائی کے بے حد ممنون تھے۔ چنانچہ اسی شب آغا خاں کے اعزاز میں دعوت منعقد ہوئی جس میں نواب محسن الملک نے بڑی فصیح و بلیغ تقریر کی اور آغا خاں کی ان مساعی کا ذکر کرتے ہوئے جو وہ ایم اے او کالج کی بہتری کے لیے مسلسل کرتے رہے تھے کہنے لگے:۔

نمی گویم دریں گلشن گل و باغ و بہار از من
بہار از یار و گل از یار و باغ از یار و یار از من

دوسرا مصرع پڑھتے وقت محسن الملک بار بار اپنی انگلی سے آغا خاں کی طرف اشارہ کرتے تھے۔ اور آخر میں زور سے دایاں ہاتھ اپنے سینے پر مار کر کہنے لگے۔ یار از من۔ اس پر بھی جس زور سے نعرہ ہائے تحسین بلند ہوئے وہ وہ فلک شگاف تھے"۔

ایک روز میں حاضر ہوا تو باتوں باتوں میں پوچھنے لگے کہ "تمہارے خیال

میں اچھی نعت کس نے لکھی ہے۔" میں نے عرض کیا "اس بارے میں میری معلومات کچھ زیادہ نہیں۔ تاہم متاخرین میں امیر اور دورِ حاضر کے شعرا میں ظفر علی خاں نے بعض بے نظیر نعتیں لکھی ہیں۔ البتہ نعتیہ غزل میں ایک اور شخص کا پایہ بہت بلند ہے۔ یعنی بیان ویزدانی میرٹھی"۔

بیان ویزدانی کا نام سن کر شیخ صاحب پھڑک اٹھے۔ اور ایک آہ بھر کر کہنے لگے "بیان ویزدانی کی کیا بات ہے۔ میں ان سے ۱۸۹۷ء میں ملا تھا"۔

پھر تفصیل سے اپنی ملاقات کا حال سنانے لگے "۱۸۹۷ء میں مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس میرٹھ میں ہوا۔ سرسید شاعری کے خلاف تھے۔ اس لیے کانفرنس کے اجلاس میں نظمیں پڑھنے کی اجازت نہیں دیتے تھے۔ چنانچہ کانفرنس میں کوئی نظم نہ پڑھی گئی۔ جب سہ روزہ اجلاس ختم ہو گیا تو میں سرسید کے کیمپ کے باہر کھڑا تھا۔ کہ ایک متقطع صورت بزرگ پالکی میں سے اترے اور سرسید سے ملنے کے خواہاں ہوئے۔ میں نے نام پوچھا تو معلوم ہوا کہ بیان ویزدانی آپ ہی ہیں۔ میں نے سرسید کو اطلاع کی تو وہ اٹھ کر دروازے تک استقبال کو گئے۔ بیان ویزدانی سرسید سے مخاطب ہو کر کہنے لگے۔ میں نے ایک نظم لکھی ہے جس کا عنوان ہے اسلام کا سرنگوں علم۔ ارادہ تھا کہ اسے کانفرنس میں پڑھوں گا۔ لیکن جب معلوم ہوا کہ نظمیں پڑھنے کی ممانعت ہے تو میں اجلاس میں حاضر نہ ہو سکا۔ اب چونکہ اجلاس ختم ہو چکا ہے۔ اور آپ حضرات واپس جا رہے ہیں اس لیے میں نے گوارا نہ کیا کہ آپ میرے شہر میں آئیں اور میں آپ کی ملاقات سے

31042

محروم رہوں۔ وہ نظم اپنے ہمراہ لایا ہوں۔ اگر آپ پسند فرمائیں تو اِس وقت سناؤں۔ سر سید نے نظم سننے کا بے انتہا اشتیاق ظاہر کیا اور برابر کے کیمپ سے سید محمود کو بھی بلا لیا۔ بیان ویزدانی نے بڑے دل نشیں لہجے میں اپنی نظم سنائی۔ سر سید اِس قدر متاثر ہوئے کہ بار بار افسوس کرتے تھے کہ ہائے ایسی بلند پایہ نظم کانفرنس کے کھلے اجلاس میں کیوں نہ پڑھی گئی۔"

یہ واقعہ بیان کر کے شیخ صاحب دیر تک مختلف شعرا کے نعتیہ کلام کا ذکر کرتے رہے اور آخر میں انھوں نے بیان ویزدانی کی وہ مشہور نعتیہ غزل بھی سنائی جس کا مقطع ہے

صورتِ لالہ ہے پُر داغ بیاں کا سینہ
پڑ رہے ہیں تیرے بیمار کے لالے آ جا

علامہ اقبال سے شیخ صاحب کے دوستانہ تعلقات کا علم سب کو ہے۔ خود بانگِ درا کے دیباچے میں انھوں نے تفصیل سے اِن تعلقات کا ذکر کیا ہے۔ جب بانگِ درا مرتب ہوئی تو سوال پیدا ہوا کہ اس کا دیباچہ لکھا جائے یا نہ لکھا جائے۔ بعض لوگ دیباچے کے خلاف تھے اور کہتے تھے کہ کلامِ اقبال اب کسی تمہید و تعارف کا محتاج نہیں۔ لیکن آخر فیصلہ دیباچے کے حق میں ہوا۔ تو دوسرا سوال یہ اٹھا کہ دیباچہ کون لکھے مختلف نام سامنے آتے رہے۔ ایک صاحب جو حضرتِ علامہ کے یہاں اکثر حاضر ہوا کرتے تھے ایک روز کہنے لگے کہ "ڈاکٹر صاحب جو شخص بانگِ درا

پر دیباچہ لکھنے کا مستحق تھا وہ مدت ہوئی مر گیا۔"

ڈاکٹر صاحب نے تعجب سے پوچھا "کون؟"

تو انھوں نے جواب دیا "عبدالرحمٰن بجنوری۔"

ڈاکٹر صاحب کہنے لگے "میں عبدالرحمٰن بجنوری کی علمی و ادبی صلاحیتوں کا بڑا معترف ہوں بلکہ ایک اعتبار سے ممنون بھی ہوں۔ وہ یوں کہ جب اسرارِ خودی شائع ہوئی تو بجنوری نے ایک تنقیدی مضمون لکھا جس میں خودی کے مختلف پہلوؤں پر بحث کرنے کے بعد یہ کہا کہ اقبال فرد کی خودی پر اتنا زور دے رہا ہے کہ اس سے یہ خوف پیدا ہو چلا ہے کہ شاید اس کے پیشِ نظر ملت کا وجود نہیں۔ حالانکہ انفرادی خودی کی تکمیل بھی ملت ہی میں گم ہو کر ہوتی ہے۔

"بجنوری کے اس مضمون کے بعد میں نے ضروری سمجھا کہ رموزِ بے خودی لکھ کر اس قسم کے اندیشوں کا ازالہ کر دوں۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ اگر بجنوری کا مضمون نہ چھپتا تو رموزِ بے خودی لکھی جاتی یا نہ لکھی جاتی۔ لیکن یہ واقعہ ہے کہ بجنوری کا مضمون پڑھ کر مجھے احساس ہوا کہ رموزِ بے خودی کا لکھا جانا بے حد ضروری ہے۔"

یہ واقعہ بیان کر کے ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ "اگر آج عبدالرحمٰن بجنوری زندہ ہوتے تو بھی بانگِ درا پر دیباچہ لکھنے کا سب سے زیادہ حق شیخ عبدالقادر کا تھا۔ اور وہی میری کتاب کا دیباچہ لکھیں گے۔"

چنانچہ بانگِ درا کا دیباچہ شیخ صاحب نے لکھا۔

ایک اور دلچسپ واقعہ یاد آگیا ہے۔ جس زمانے میں شیخ صاحب وزیرِ ہند کی کونسل کے رکن تھے۔ اور انگلستان میں مقیم تھے تو انھوں نے ایک دفعہ مسجدِ ووکنگ میں عید الفطر کی نماز کی امامت بھی کی تھی۔ جب یہ خبر لاہور پہنچی تو علامہ اقبال نے ایک بے تکلف صحبت میں کہا کہ "لو بھئی۔ ایک امامت عبد القادر کے دستِ ستم سے بچی ہوئی تھی ظالم نے اس پر بھی ہاتھ صاف کر دیا ہے۔"

اتفاق سے اس واقعہ کے کچھ عرصہ بعد شیخ صاحب اپنے صاحب زادے احسان قادر کی شادی کی تقریب پر رخصت لے کر لاہور تشریف لائے تو ایک روز باتوں باتوں میں میں نے ان سے عرض کیا کہ آپ کی امامت کی خبر سن کر ڈاکٹر صاحب نے یہ فقرہ چست کیا تھا۔ شیخ صاحب بے اختیار ہنسے۔ اور دیر تک محظوظ ہوتے رہے۔ پھر کہنے لگے۔ "اگر تم ڈاکٹر صاحب سے ملو تو ان سے عرض کرنا کہ عبد القادر نے آپ کے فقرے کے جواب میں آپ ہی کا یہ شعر سنایا تھا۔

جو بے نماز کبھی پڑھتے ہیں نماز اقبال
بلا کے دیر سے مجھ کو امام کرتے ہیں

شیخ صاحب شاعر نہیں تھے۔ لیکن برمحل شعر پڑھنے میں انھیں کمال حاصل تھا۔ استادوں کے سیکڑوں اشعار انھیں یاد تھے۔ اور موقع محل کے مطابق جب وہ کوئی شعر پڑھ دیتے۔ تو سننے والوں کو یوں محسوس ہوتا گویا انگوٹھی میں نگینہ جڑا گیا ہے۔ مدت ہوئی ایک مرتبہ سیماب اکبر آبادی اور سلیم نظامی

گھومتے پھرتے لاہور آ گئے۔ آگرہ سے نکل کر یہ اصحاب پہلے سال بھر دہلی ٹھہرے۔ وہاں کامیابی کی صورت نظر نہ آئی تو قسمت آزمائی کے لیے لاہور تشریف لے آئے۔ اُن دنوں وہ ایک رسالہ بھی نکالتے تھے جس کا نام پیمانہ تھا۔ چنانچہ یہ جہاں جاتے پیمانہ ساتھ ساتھ گردش کرتا تھا۔ مولانا تاجور نجیب آبادی اُس زمانے میں لاہور کی ادبی محفلوں کی روح رواں بنے ہوئے تھے۔ اور اُن کے اہتمام سے مہینے میں دو بار بڑے ٹھاٹھ کا مشاعرہ ہوتا تھا۔ ایک مشاعرے کے صدر شیخ صاحب تھے۔ سیماب اور ساغر نے خوب دھوم دھڑکے سے غزلیں پڑھیں بالخصوص ساغر کے ترنم نے تو وہ رنگ جمایا کہ لوگ جھوم جھوم گئے۔ آخر میں شیخ صاحب صدارتی تقریر کے لیے کھڑے ہوئے تو ساغر کے کلام کی تعریف کرتے ہوئے کہنے لگے ؎

دَور میں ساغر رہے گردش میں پیمانہ رہے

پھر مولانا تاجور کی طرف اشارہ کر کے فرمایا۔ اور ع

مے کشوں کے سر پہ یا رب پیرِ مے خانہ رہے

اِس شعر نے محفل کی محفل کو جس طرح تڑپا دیا وہ نقشہ اب تک آنکھوں کے سامنے ہے۔

مولانا تاجور میرے اُستاد تھے۔ دوست بھی تھے۔ لیکن اُن کی یہ عجیب و غریب عادت مجھے پسند نہ تھی کہ جب وہ کوئی رسالہ نکالتے یا کوئی انجمن قائم کرتے تو کام چلانے کے لیے بڑے آدمیوں کے نام کا سہارا ضرور لیتے تھے۔ چنانچہ جب اُنھوں نے ادبی دُنیا جاری کیا تو سرورق پر سر عبدالقادر کا

نام بطور "ڈائرکٹر آف پالیسی" کے درج تھا۔ شیخ صاحب اُس وقت ہائی کورٹ کے جج بن چکے تھے۔ اور اُنھیں ہرگز اتنی فرصت نہ تھی کہ ادبی دنیا کی پالیسی کو "ڈائرکٹ" کریں۔ تاہم اُنھوں نے از راہِ مروّت اپنا نام استعمال کرنے کی اجازت دے دی۔ مولانا نے رسالہ نکالتے ہی اورینٹل کالج کے اساتذہ پر برسنا شروع کر دیا۔ بالخصوص حافظ محمود شیرانی کے خلاف سب و شتم کا افسوسناک سلسلہ جاری کر دیا۔ اختر شیرانی اُس زمانے میں خیالستان کے ایڈیٹر تھے، اور میں کبھی کبھی اُن کے رسالے میں مضمون لکھتا تھا۔ اختر نے خیالستان میں مولانا تاجور کے خلاف لکھنا شروع کیا۔ اور یوں اچھی خاصی بدمزگی پیدا ہو گئی۔ چنانچہ اختر نے اِس بات پر اظہارِ افسوس کرتے ہوئے کہ سر عبدالقادر نے اپنا نام ایک ایسے رسالے کے سرورق پر بطور ڈائرکٹر کے درج کئے جانے کی کیوں اجازت دے رکھی ہے جس میں اہلِ علم کو گالیاں دی جاتی ہیں، شیخ صاحب کو مخاطب کر کے کہا۔

تم جانو تم کو غیر سے جو رسم و راہ ہو
مجھ کو بھی پوچھتے رہو تو کیا گناہ ہو

پھر مولانا تاجور کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا۔

ہوا ہے شہ کا مصاحب پھرے ہے اتراتا
وگرنہ شہر میں غالب کی آبرو کیا ہے

شیخ صاحب نے خیالستان کا یہ پرچہ دیکھتے ہی اختر کو خط لکھا اور ادبی دنیا کے قابلِ اعتراض مضامین سے اپنی برأت کا اظہار کیا اور ساتھ ہی اختر کو غالب

LIBRARY

کے دو مذکورہ بالا اشعار عین موقع و محل کے مطابق استعمال کرنے پر بے انتہا داد دی۔

ایک مرتبہ یو۔پی کے ایک مشہور شاعر صفدر مرزا پوری لاہور تشریف لائے اُن کا شعر پڑھنے کا انداز ایسا مضحکہ خیز تھا کہ مشاعرے میں لوگ بے اختیار ہنسنے لگ جاتے۔ شیخ صاحب صدر تھے اِس لیے کسی کو ہنسنے کی جرأت نہ ہو سکی۔ صفدر نے شیخ صاحب کی شخصیت اور عظمت سے متاثر ہو کر فوراً یہ شعر کہا ؎

مرکز زبان اُردو کا لاہور ہو گیا
دلّی و لکھنؤ کو پکارا کرے کوئی

شیخ صاحب پانچ برس کے قریب انگلستان میں رہے اور وہاں بھی اپنی زبان کی خدمت میں اُنھوں نے کوئی دقیقہ باقی نہ رکھا۔ "ہندوستانی سپیکنگ یونین" کے نام سے لندن میں ایک انجمن قائم کی۔ زبان تو بہر حال اُردو تھی۔ لیکن مصلحتِ وقت کی خاطر سے اُس کا نام "ہندوستانی" رکھ دیا گیا تھا۔ مدراس۔ بمبئی۔ بنگال۔ آسام۔ برما اور لنکا تک کے باشندے اُس کے حلقۂ رکنیت میں شامل تھے۔ بہت سے انگریز بھی یونین کے جلسوں میں باقاعدہ شریک ہوتے تھے۔ افسوس کہ اِن جلسوں کی کوئی مکمل روئداد نہیں ملتی۔ ورنہ اُس دَور کے بعض واقعات پر اچھی خاصی روشنی پڑ سکتی تھی۔ دیوان آتما نند شرر اُس کے سیکرٹری تھے۔ وہ غالباً آج کل بمبئی میں فلم کا کام کرتے ہیں۔ البتہ شیخ صاحب ملازمت سے سبکدوش ہو کر واپس وطن گئے تو کبھی کبھی اِس یونین کے حالات سنایا کرتے تھے۔ ایک دفعہ کہنے لگے

ہماری یونین کے اجلاس میں کسی صاحب نے بہادر شاہ ظفر کی ایک غزل سنائی جس کا مقطع تھا۔

میری سیدھی بات پر ہوتے تھے وہ ٹیڑھے ظفر
کچھ جو ٹیڑھی میں نے کی تقریر سیدھے ہو گئے

وہیں جلسے میں ایک صاحب مسٹر انستانی بیٹھے ہوئے تھے جو دراصل سندھ کے رہنے والے ہیں۔ لیکن اب مدت سے مشرقی افریقہ میں تجارت کرتے ہیں۔ انھیں یہ شعر اس قدر پسند آیا کہ لکھ کر اپنے ساتھ لے گئے۔ چونکہ مشرقی افریقہ بالخصوص کینیا کے علاقے میں انگریزوں کا رویہ اسی قسم کا تھا کہ وہ سیدھی بات پر ٹیڑھے ہوتے اور ٹیڑھی بات سے سیدھے ہو جاتے۔ اس لیے مسٹر انستانی نے ظفر کے اس شعر کو عنوان بنا کر وہاں کے ایک اخبار میں سیاسی صورتِ حال پر بڑا دلچسپ مضمون لکھا۔ جو قوم پرست حلقوں میں بے حد پسند کیا گیا۔"

ایک دن میں نے شیخ صاحب سے پوچھا کہ "یہ بتائیے۔ ڈاکٹر صاحب نے اسرارِ خودی سر علی امام کے نام کیوں ڈیڈیکیٹ کی تھی۔؟"

جواب میں فرمایا "تم بتاؤ۔"

میں نے عرض کیا کہ سوائے اس کے اور کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی کہ سر علی امام اس زمانے میں ہندوستان کے مسلمانوں میں سب سے ذی اقتدار آدمی تھے۔ وہ وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کے رکن تھے۔ ادھر ڈاکٹر صاحب جنھیں پریکٹس کرتے ہوئے مشکل سے چھ سات سال ہوئے تھے، اپنے دیگر

ہم عصروں کی طرح اِس بات کے خواہش مند ہوں گے کہ انھیں بھی سرکار، دربار میں کوئی اچھا منصب ملے۔ اُنھوں نے یقیناً سوچا ہوگا کہ سر علی امام کے توسّل سے شاید یہ راہ آسان ہو جائے گی۔"

شیخ صاحب کہنے لگے "ممکن ہے تمھاری رائے درست ہو۔ لیکن میرا خیال مختلف ہے۔ جب سر علی امام وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کے رکن تھے تو اُسی زمانے میں عبداللہ یوسف علی گورنمنٹ آف انڈیا میں ڈپٹی سکرٹری تھے۔ عبداللہ یوسف علی پہلے ہندوستانی آئی سی ایس تھے جو حکومتِ ہند میں ڈپٹی سکرٹری کے عہدے پر فائز ہوئے تھے۔ مجھے اُن دنوں شملہ جانے کا اتفاق ہوا۔ اور ایک روز سڑک پر عبداللہ یوسف علی سے مُلاقات ہو گئی۔ اُنھوں نے ایک ضروری معاملے پر گفتگو کرنے کے لیے مجھے اپنے مکان پر مدعو کیا۔ جب میں اُن کے یہاں حاضر ہوا تو وہ رازداری کے لہجے میں کہنے لگے کہ ڈاکٹر اقبال آج کل بہت تیز نظمیں لکھ رہے ہیں۔ حکومتِ ہند کے خفیہ محکمے میں اُن کا فائل کھل گیا ہے۔ آپ اُن سے کہہ دیجیے گا کہ ذرا احتیاط رہیں۔ وہ زمانہ بڑا نازک تھا۔ اور حکومتِ ہند معمولی سے شبہ پر بھی لوگوں کو گرفتار کر لیتی تھی۔ لاہور آکر یہی بات میں نے ڈاکٹر صاحب سے کہی وہ سُن کر چُپ ہو رہے۔ سال بھر کے بعد جب اسرارِ خودی شائع ہوئی تو اُنھوں نے اُسے سر علی امام کے نام سے معنون کیا۔ میرا قیاس ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے شاید یہ سوچا ہوگا کہ اگر کبھی حکومتِ ہند نے اُن پر ہاتھ ڈالنے کا ارادہ کیا۔ یا اُن کے متعلق کسی غلط فہمی میں مبتلا

ہوئی تو سر علی امام اُس کا ازالہ کر دیں گے ..... بھئی یہ سب قیاس کی باتیں ہیں۔ دلوں کا حال تو وہ عالم الغیب ہی جانتا ہے۔ تاہم جب اسرارِ خودی کا دُوسرا ایڈیشن شائع ہُوا تو وہ ڈیڈیکیشن کاٹ دی گئی تھی۔"

شیخ صاحب کو اپنی زندگی میں ہر قسم کا دنیاوی اعزاز حاصل ہُوا۔ لیکن اُن کے مزاج کی اُفتاد ایسی تھی کہ جُوں جُوں مراتب میں اضافہ ہوتا گیا تُوں تُوں اُن کا انکسار بڑھتا گیا۔ اور مروّت ترقی کرتی گئی۔ غرض مند لوگ بے تکلف اُن کے مکان پر جا کر اپنی ضرورتیں بیان کرتے تھے۔ اور وہ ہر ایک کے دُکھ درد کی داستان توجہ سے سُنتے اور حتی الامکان مدد بھی کرتے تھے۔ ہر ہفتے اُن کے پاس شادی بیاہ کی دعوتوں کے بہت سے خطوط آجاتے تھے اکثر لوگوں کو وہ جانتے بھی نہ تھے۔ لیکن کیا مجال کہ کوئی دعوت رد کر دیں۔ غریب امیر یا واقف ناواقف کی کوئی تمیز نہ تھی۔ وہ ہر ایک کے گھر جا کر صاحبِ خانہ کی عزت افزائی کا موجب بنتے تھے۔ میں نے ایک روز اُنھیں تانگے میں سوار موچی دروازے کے اندر ایک چھوٹی سی گلی میں جاتے ہوئے دیکھا۔ میں نے تعجب سے پوچھا "آپ یہاں کیوں کر تشریف لے آئے۔؟"

تانگہ روک لیا۔ اور جیب میں سے ایک چھپا ہُوا رنگین خط نکال کر کہنے لگے "بھئی دیکھو۔ اِن صاحب نے دعوتِ ولیمہ پر بُلایا ہے۔ لیکن مکان کا پتہ نہیں چلتا۔ تم ذرا تانگے میں بیٹھ جاؤ۔ تاکہ مکان تلاش کر لیں۔"

یہ اخلاق۔ یہ مروّت۔ یہ حُسنِ سلوک اُس دَور کے اکابر میں اگر نایاب نہیں تو کمیاب ضرور تھا۔ مولانا صلاح الدین احمد۔ ایڈیٹر ادبی دنیا کے

صاحب زادے وجیہہ الدین احمد کی شادی تھی مولانا نے اپنے بزرگوں کے احترام اور اپنی خاندانی روایت کے مطابق یہ تقریب سعید اپنے جدی مکان میں منائی، جو شاہ عالمی دروازے کے اندر، گمٹی بازار کے قریب، ایک تنگ سی گلی کوچہ ہنومان میں واقع تھا۔ چاروں طرف ہندوؤں کی آبادی تھی اور بیچ میں صرف یہی ایک مکان مسلمانوں کا تھا۔ صحن میں کرسیوں پر مہمان بیٹھے تھے۔ اور میں شیخ صاحب کے قریب بیٹھا باتیں کر رہا تھا۔ کہنے لگے "یہ مکان بڑی تاریخی حیثیت رکھتا ہے۔ مولانا سے کہو کہ اسے اچھی طرح محفوظ کر لیں[1]"

میں نے عرض کیا "وہ کیا تاریخی حیثیت ہے۔ ذرا ہمیں بھی بتائیے"

کہنے لگے "میر غلام بھیک نیرنگ مولانا صلاح الدین احمد کے بڑے بھائی[2] کے بہت دوست تھے۔ اور جب وہ یہاں لاء کالج میں پڑھتے تھے تو اسی مکان میں رہتے تھے۔ اقبال اور میں ان سے ملنے اکثر یہاں آیا کرتے تھے۔ اس کونے میں ایک اکھاڑہ تھا۔ جہاں نیرنگ اور اقبال کشتی لڑا کرتے تھے"

شیخ صاحب جب ۱۹۴۵ء میں ملازمت سے فارغ ہو کر مستقل طور پر لاہور تشریف لے آئے تو ان سے ملاقاتوں کا سلسلہ روز بروز وسیع ہونے لگا۔ میں

---

[1] - افسوس یہ مکان ۱۹۴۷ء کے فسادات میں جل گیا۔

[2] - مولوی ضیاء الدین احمد مرحوم۔

اُن کے دولت کدے کے قریب ہی ٹمپل روڈ پر رہتا تھا۔ اِس لیے آنے جانے میں بہت آسانی تھی۔ اپریل ۱۹۴۷ء میں دہلی میں ایشیائی ممالک کی کانفرنس منعقد ہوئی تو شیخ صاحب اور میں دونوں وہاں گئے۔ بات یہ تھی کہ جس ادارے[1] کے اہتمام سے یہ کانفرنس منعقد ہوئی تھی۔ ہم اُس کے ممبر تھے۔ اور ہمیں باقاعدہ دعوت نامہ موصول ہوا تھا۔ شیخ صاحب سر سلطان احمد کے یہاں ٹھہرے اور میں نے حسبِ معمول مولوی عبدالحق کے ہاں ڈیرا جمایا۔ لیکن دن بھر ہم کانفرنس کے اجلاس میں بسر کرتے تھے۔ ایک روز کانسٹی ٹیوشن ہاؤس میں جہاں تمام مندوبین جمع تھے۔ پنڈت نہرو اور مولانا ابوالکلام آزاد سے بھی ملاقات ہوئی۔ مولانا آزاد نے شیخ صاحب کو اپنے مکان پر چائے کی دعوت دی۔ لیکن شیخ صاحب نے تنہا جانا گوارا نہ کیا اور کہا کہ "میرے ایک دوست بھی میرے ساتھ لاہور سے آئے ہوئے ہیں۔ انھیں بھی دعوت دیجئے۔"

چنانچہ مولانا نے از راہِ کرم مجھ کو بھی مدعو کیا۔ دوسرے روز مولانا کے مکان پر چائے نوشی کے دوران میں جو گفتگو ہوئی وہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے اتنی پُر لطف تھی کہ اب تک نہیں بھولتی۔ مولانا ابوالکلام کے علم و فضل کا پایہ تو ہر اعتبار سے مسلّم ہے۔ لیکن اُن میں ایک عجیب بات یہ ہے کہ بعض اوقات بالکل بے خبر ہو جاتے ہیں۔ باتوں باتوں میں شیخ صاحب سے کہنے لگے کہ "آپ سے ربع صدی کے بعد ملاقات ہوئی ہے۔"

---

[1] INSTITUTE OF INTERNATIONAL AFFAIRS

شیخ صاحب نے کہا "ہائیں ربع صدی! آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ ابھی کل کی بات ہے کہ جون ۱۹۴۵ء میں لارڈ ویول نے شملہ میں لیڈروں کی کانفرنس کی تھی۔ اور آپ قلعہ احمد نگر سے رہا ہو کر آئے تھے تو آپ سے وہاں ملاقات ہوئی تھی۔"

مولانا گھبرا سے گئے اور کہنے لگے "توبہ! مصائب نے حافظے کا کیا حال کر دیا ہے۔"

شیخ صاحب پھر بولے "۱۹۴۷ء میں میں لاہور میں تھا اور آپ بھی چند روز کے لیے وہاں تشریف لائے تھے۔ ایک دن میاں افتخار الدین میرے پاس آئے اور کہنے لگے کہ مولانا آپ سے ملنے کے خواہشمند ہیں۔ چنانچہ میں میاں افتخار الدین کے یہاں آپ سے ملا اور دو گھنٹے باتیں ہوتی رہیں۔ کیا آپ کو یاد نہیں؟"

مولانا نے پھر گھبرا کر مصائب کے ہجوم اور حافظے کی نارسائی کا ذکر کیا۔

شیخ صاحب کہنے لگے "۱۹۳۹ء میں جب میں انگلستان سے واپس آیا اور حکومت ہند نے مجھے کچھ عرصے کے لیے لا ممبر مقرر کیا تو آپ بھی اتفاق سے دہلی میں تشریف فرما تھے۔ ایک روز آصف علی میرے پاس آئے اور کہنے لگے کہ مولانا آپ سے ملنے کے خواہش مند ہیں۔ چنانچہ میں چیلوں کے کوچے میں آصف علی کے مکان پر آپ سے ملا اور بہت دیر گفتگو ہوتی رہی کیا آپ کو یاد نہیں؟"

مولانا نے پھر مصائب کی شدت اور حافظے کی کمزوری کا عذر پیش کیا۔

غرضکہ شیخ صاحب نے ایک ایک کر کے دس مُلاقاتوں کا حال بیان کیا جو ربع صدی میں ہو چکی تھیں۔ اور مولانا ہر بار مصائب کی یورش اور حافظے کی بے بسی کی پناہ لیتے رہے۔ مجھے تعجب ہوا کہ شیخ صاحب جو سن و سال میں مولانا سے کہیں بڑے تھے، پندرہ برس کی عمر میں باپ کے سائے سے محروم ہو گئے تھے اور پھر زندگی کی ذمہ داریوں اور تلخیوں کا تنہا مقابلہ کرتے رہے۔ لیکن مصائب نے اُن کے حافظے پر کوئی اثر نہیں ڈالا اِدھر مولانا کا حافظہ مصائب نے بالکل ختم کر دیا ہے۔

میں نے شیخ صاحب سے پوچھا "مولانا سے آپ کی پہلی ملاقات کب ہوئی تھی؟"

شیخ صاحب بولے "ہائے آپ نے کیا واقعہ یاد دلایا۔ ۱۸۹۹ء یا ۱۹۰۰ء کا ذکر ہے۔ کلکتہ میں ندوہ کا اجلاس تھا۔ میں اور حافظ عبدالرحمٰن سبّاح امرت سری بھی وہاں گئے۔ مسلم انسٹی ٹیوٹ ہال میں جلسہ ہوا اور میری بھی تقریر ہوئی۔ اسٹیج کے عین سامنے بنچ پر مولانا کے والدِ مرحوم صوفی خیرالدین تشریف فرما تھے اور اُن کے دائیں طرف اُن کے بڑے صاحب زادے غلام یٰسین تھے جو اپنے کو ابوالنصر آہ کہتے تھے اور بائیں طرف مولانا بیٹھے تھے۔ مولانا کی عمر یہی پندرہ برس کی ہو گی۔ لیکن پیشانی سے اُس وقت بھی بلند اقبالی کا ستارہ طلوع ہو رہا تھا۔ دُوسرے روز مولانا ہماری قیام گاہ پر تشریف لائے۔ اور میری تقریر کی تعریف کرتے رہے۔ میں نے عرض کیا کہ میں ایک ادبی رسالہ مخزن جاری کرنے والا ہوں۔ آپ بھی اُس کے لیے مضامین لکھیے

مولانا نے وعدہ فرمایا۔ چنانچہ مخزن کے پہلے نمبر میں مولانا کا مضمون شائع ہوا جس کا عنوان تھا نیوز۔ مولانا نے اس انگریزی لفظ سے یہ نکتہ پیدا کیا کہ حرف این اشارہ کرتا ہے شمال کی طرف۔ ای مشرق۔ ڈبلیو مغرب اور ایس جنوب کی طرف۔ چنانچہ نیوز کے معنی خبر کے ہیں جو بیک وقت شمال، مشرق، مغرب اور جنوب کے حالات سے ہمیں آگاہ کرتی ہے۔ چند روز بعد میر غلام بھیک نیرنگ کا انبالہ سے خط آیا جس میں انھوں نے اس مضمون کی بہت مذمت کی اور کہا کہ آئندہ اس قسم کے ہلکے مضامین مخزن میں شائع نہیں ہونے چاہئیں۔ میں نے نیرنگ کو سمجھایا کہ تم صاحب مضمون کو نہیں جانتے۔ مجھے یقین ہے کہ یہ ذہین و فطین نوجوان ایک روز آسمان ادب پر آفتاب و مہتاب بن کر چمکے گا۔ ..... دیکھ لیجئے میری پیش گوئی کس طرح حرف بحرف صحیح ثابت ہوئی۔"

اب شام ہو گئی تھی۔ ہم مولانا سے رخصت لے کر واپس چلے آئے۔

شیخ صاحب فروری ۱۹۵۰ء میں فوت ہوئے۔ انتقال سے چند مہینے قبل ان کے بعض انگریزی مضمونوں کا مجموعہ شائع ہوا تھا۔ یہ مضامین انیسویں صدی کے اردو ادب سے متعلق تھے جو ایک زمانے میں انھوں نے سرجان مینارڈ کی صدارت میں پڑھے تھے۔ میں حاضر ہوا تو اپنے ہاتھ سے چند الفاظ لکھ کر کتاب مجھے عنایت فرمائی۔ وہ نسخہ اب تک میرے پاس محفوظ ہے۔ یا پھر ایک تصویر بھی ہے جس میں شیخ صاحب، عبدالرحمٰن صدیقی مرحوم

اور راقم السطور موجود ہیں۔ یہ دونوں چیزیں اُن کی یادگار ہیں۔ لیکن اِن مادّی یادگاروں سے بالاتر اُن کی محبّت و شفقت ہے۔ اُن کی شرافت و مروّت ہے۔ اُن کی دوست پروری و بندہ نوازی ہے جو ایک متاعِ بے بہا اور دولتِ لازوال کی طرح میرے سینے میں ہمیشہ محفوظ رہے گی۔

لندن ۱۹۵۶ء

ڈاکٹر سیف الدین کچلو

لیجیے، ڈاکٹر کچلو بھی رخصت ہوئے[1]۔ اِنّا للہِ وانّا الیہ راجعون۔

ہمارے بعد بہت روئے ہم کو اہلِ وفا
کہ اپنے مٹنے سے مہر و وفا کا نام مٹا

ڈاکٹر کچلو کے ساتھ برِعظیم ہند کی تاریخ کا وہ انقلاب آفریں باب بھی ختم ہو گیا۔ جس کا آغاز جلیاں والے باغ سے ہوا تھا۔ اور جس کا مصنّف خود کچلو تھا۔

دُنیا کا ہر مورخ، جب اِس برِعظیم کی آزادی کی جدّوجہد کی تاریخ پر قلم اُٹھاتا ہے۔ تو اِبتدا ۱۳ اپریل ۱۹۱۹ء سے کرتا ہے۔ جس روز امرتسر کے جلیاں والے باغ میں۔ جنرل ڈائر نے ایک پُر امن ہجوم پر گولی چلا کر ۴۰۰ آدمیوں کو جان سے مار ڈالا۔ اور ۱۵۰۰ کو زخمی کیا تھا۔

---

[1] ڈاکٹر کچلو کا انتقال دہلی میں ۹ اکتوبر ۱۹۶۳ء کو ہوا تھا۔

جلیاں والا باغ کوئی سرسبز خطہ یا کوئی گل و گلزار کا قطعہ نہیں تھا۔ بلکہ ایک ناہموار اور کھردری زمین کا مستطیل نما میدان تھا۔ جو شہر امرتسر کی گنجان آبادی کے عین درمیان میں واقع تھا۔ چاروں طرف اونچے اونچے مکان تھے۔ اور ایک جانب چھ فٹ اونچی دیوار تھی۔ جس نے اس میدان کو شہر کے دوسرے علاقے سے جدا کر رکھا تھا۔ باغ میں داخل ہونے کا صرف ایک راستہ تھا۔ جو تنگ سی گلی میں واقع تھا۔ اسی راستے سے لوگ اندر جاتے اور باہر آسکتے تھے۔

جب مارچ ۱۹۱۹ء میں رولٹ ایکٹ کے خلاف۔ ہندوستان بھر میں ایجی ٹیشن شروع ہوئی۔ اور گاندھی جی نے ستیہ گرہ کی تحریک کا آغاز کیا۔ تو امرتسر میں ڈاکٹر کچلو اس تحریک کے لیڈر بنے۔ ۳۰ مارچ کو سارے ملک میں رولٹ ایکٹ کے خلاف ہڑتال ہوئی۔ اور تمام کاروبار یک لخت بند ہو گیا۔ اس قسم کی مکمل ہڑتال پہلے کبھی نہ دیکھی گئی تھی۔ ۱۴ اپریل کو پنجاب کے لفٹننٹ گورنر سر مائیکل اوڈائر نے ڈاکٹر کچلو کو زبان بندی کا حکم دے دیا۔ کہ آئندہ کسی جلسے میں تقریر نہ کریں۔ ۱۸ اپریل کو امرتسر میں پھر ہڑتال ہوئی۔ اور ۱۰ اپریل کو سر مائیکل اوڈوائر کی ہدایات کے تحت امرتسر کے ڈپٹی کمشنر مائلز اروِنگ[1] نے صبح دس بجے ڈاکٹر کچلو کو اپنے مکان پر بلایا۔ اور طے شدہ سکیم کے مطابق انھیں فوج کی حراست میں ایک موٹر میں بٹھا کر دھرم سالہ بھیجدیا۔

یہ خبر آگ کی طرح شہر میں پھیل گئی۔ دکانیں بند ہو گئیں۔ اور لوگ جگہ جگہ

---

[1] MILES IRVING

اکٹھے ہونا شروع ہو گئے۔ تیس ہزار انسانوں کے ہجوم نے ریل کا پل عبور کر کے سول لائن میں داخل ہونے کی کوشش کی۔ تاکہ کمشنر اور ڈپٹی کمشنر کے بنگلوں کے سامنے جا کر واویلا کریں۔ پولیس اور فوج کے چند جوانوں نے آگے بڑھنے کا راستہ روک رکھا تھا۔ جب ہجوم نے بے تاب ہو کر پتھر پھینکنا شروع کئے۔ تو فوج اور پولیس نے گولی چلا دی۔ ہجوم کے دو، تین آدمی مرے اور کچھ مجروح ہوئے۔

اب وہی ہجوم، زخمی شیر کی طرح، رنج اور غصے سے بھرا ہوا۔ پلٹ کر شہر پر پل پڑا۔ ٹاؤن ہال۔ تار گھر اور ڈاک خانے کو آگ لگا دی نیشنل بنک الائنس بنک اور چارٹرڈ بنک کو لوٹ لیا۔ نیشنل بنک کی عمارت کو آگ لگا کر اس کے انگریز مینجر سٹورٹ اور اسسٹنٹ مینجر سکاٹ کو قتل کر دیا۔ الائنس بنک کا مینجر ٹامسن بھی مارا گیا۔

کوتوالی کی عمارت، ان بنکوں سے صرف تین سو گز کے فاصلے پر تھی۔ جہاں پچھتر مسلح جوان موجود تھے۔ لیکن پولیس نے سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ اور جنبش تک نہ کی۔

بجلی گھر کا انگریز مینجر ایلنڈز اور تار گھر کا افسر رابنسن بھی قتل کر دیئے گئے۔ ان واقعات کے بعد۔ ہجوم نے دوبارہ ریل کا پل عبور کر کے سول لائن کی طرف جانے کی کوشش کی۔ اندازہ ہے کہ ہجوم میں چالیس ہزار کے قریب آدمی تھے۔ فوج اور پولیس کے گھڑ سواروں نے ڈپٹی کمشنر کے حکم سے پھر گولی چلائی۔ اور بیس پچیس آدمی مرے۔ ہجوم نے لاشیں اٹھائیں۔

اور چیختا چلاتا ہوا شہر کی طرف لوٹ آیا۔

اب صورتِ حال یہ تھی کہ شہر پر عوام کا قبضہ ہو گیا تھا۔ اور سول لائن میں جہاں انگریز افسروں کے چند بنگلے تھے، فرنگی راج کی ٹمٹماتی ہوئی شمع روشن تھی۔ شہر سے تمام انگریزوں اور اینگلو انڈین لوگوں نے بھاگ کر گوبند گڑھ کے قلعہ میں پناہ لے لی تھی۔

۱۱ اپریل کو رات کے نو بجے بریگیڈیئر جنرل ڈائر، جالندھر چھاؤنی سے چل کر امرتسر پہنچ گیا۔ اُس کے ہمراہ ۷۵ انگریز اور ۷۱ ہندوستانی سپاہی تھے۔ اگلے ہی روز ڈپٹی کمشنر مائلز اِروِنگ اور کمشنر کچن نے شہر کا نظم و نسق اُس کے حوالے کر دیا۔

۱۲ اپریل کا دن گذر گیا۔ ۱۳ کو اتوار تھا۔ ڈائر صبح کے وقت ایک چھوٹا سا جلوس بنا کر نکلا۔ آگے آگے شہر کا کوتوال، سفید گھوڑے پر سوار تھا پیچھے امرتسر کا نائب تحصیلدار ملک فتح خاں ایک ٹم ٹم میں بیٹھا تھا۔ اُس کے پیچھے ایک موٹر میں ڈائر۔ امرتسر کا ڈپٹی کمشنر۔ اور کپتان پولیس تھے۔ اور اُن کے پیچھے فوجی دستہ تھا۔

شہر کے مختلف مقامات پر اس جلوس نے ڈھول بجا بجا کر اُردو اور پنجابی میں منادی کی۔ کہ آج سے امرتسر پر فوج کا راج ہو گیا ہے۔ شہر سے باہر جانے کی کسی کو اجازت نہیں۔ چار سے زیادہ آدمی کہیں جمع نہیں ہو سکتے۔ آٹھ بجے شام کے بعد کسی کو گھر سے باہر قدم رکھنے کی اجازت نہیں۔ کوئی جلوس نہیں نکل سکتا۔ کوئی جلسہ نہیں ہو سکتا۔ اگر کسی نے اِن احکام کی خلاف ورزی کی۔

تو فوجی قواعد کے مطابق سزا دی جائے گی۔

اسی روز دوپہر کے ساڑھے بارہ بجے ڈائر کو معلوم ہوا۔ کہ شہر کے لوگ کہیں جلسہ کرنے کا انتظام کر رہے ہیں۔ چار بجے سہ پہر کو کپتان پولیس ریہل نے آکر بتایا کہ جلیاں والے باغ میں لوگ جمع ہیں اور جلسہ ہو رہا ہے۔ ڈائر اسی وقت دو بکتر بند گاڑیاں جن میں مشین گنیں بھی تھیں۔ اور نوے فوجی جوان لے کر باغ کی طرف روانہ ہوا۔

جلسے کے منتظمین نے کرسی صدارت پر ڈاکٹر کچلو کی تصویر رکھ دی تھی اور ایک شخص ہنس راج کھڑا تقریر کر رہا تھا۔ ڈائر تنگ گلی میں سے ہوتا ہوا جلسہ گاہ کے دروازے پر پہنچا۔ بکتر بند گاڑیاں اندر نہ جا سکتی تھیں۔ اس لیے انھیں مجبوراً باہر ہی چھوڑنا پڑا۔

ڈائر نے پہنچتے ہی گولی چلانے کا حکم دیا۔ اور جب تک سپاہیوں کا اسلحہ ختم نہیں ہو گیا گولی چلتی رہی۔ جلیاں والے باغ میں داخل ہونے اور نکلنے کا راستہ ایک ہی تھا۔ جس پر ڈائر نے قبضہ کر لیا تھا۔ جب گولیوں کی بارش شروع ہوئی تو خلقت دیوانہ وار ادھر اُدھر بھاگنے لگی۔ لیکن باہر جانے کا راستہ مسدود ہو چکا تھا۔

چار سو انسانوں کو مار کر اور ۱۵۰۰ کو زخمی کر کے ڈائر اطمینان سے واپس اپنی قیام گاہ رام باغ میں جا کر سو گیا۔ کرفیو کی وجہ سے کوئی شخص رات کو آٹھ بجے کے بعد گھر سے نکل نہیں سکتا تھا۔ اس لیے رات بھر لاشیں وہیں پڑی رہیں۔ اور زخمی چیختے چلاتے رہے۔

اقبال نے اس حادثۂ خوں چکاں سے متاثر ہو کر، جلیاں والے باغ پر وہ اشعارِ آب دار لکھے تھے۔ جو افسوس کہ بانگِ درا میں جگہ نہ پا سکے ؎

ہر زائرِ چمن سے یہ کہتی ہے خاکِ باغ
غافل نہ رہ جہان میں گردوں کی چال سے
سینچا گیا ہے خونِ شہیداں سے اس کا تخم
تو آنسوؤں کا بخل نہ کر اس نہال سے

جلیاں والے باغ کے بعد جب پنجاب میں مارشل لا کی عدالت قائم ہوئی۔ تو ڈاکٹر کچلو کو حبسِ دوام بعبورِ دریائے شور کی سزا ملی لیکن دسمبر ۱۹۱۹ء میں وزیرِ ہند، مسٹر مانٹیگو کے حکم سے مارشل لا کے تمام قیدیوں کو رہا کر دیا گیا۔

ستمبر ۱۹۲۰ء میں لالہ لاجپت رائے کے زیرِ صدارت، کانگریس کا خاص اجلاس کلکتہ میں ہوا۔ تو گاندھی جی نے پہلی بار ترکِ موالات کی قرارداد پیش کی اور تائید ڈاکٹر کچلو نے کی۔ اس کے بعد کچلو اور ترکِ موالات گویا ہم معنی الفاظ بن گئے تھے۔ تا آنکہ اکتوبر ۱۹۲۱ء میں۔ انھیں کراچی کے مشہور مقدمۂ بغاوت میں۔ مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی۔ مولانا حسین احمد مدنی۔ مولانا نثار احمد کانپوری اور پیر غلام مجدد کے ساتھ دو سال کے لیے جیل بھیج دیا گیا۔

دسمبر ۱۹۲۴ء میں انھوں نے بلگام (احاطۂ بمبئی) میں آل انڈیا خلافت کانفرنس کے سالانہ اجلاس کی صدارت کی۔ گاندھی جی اس موقع پر کانگریس کے

صدر تھے۔ ۱۹۲۷ء میں وہ آل انڈیا مسلم لیگ کے جنرل سیکرٹری تھے۔ اور جب سائمن کمیشن کی آمد پر لیگ دو حصّوں میں تقسیم ہو گئی۔ تو سر محمد شفیع نے اپنی لیگ کا اجلاس اسلامیہ کالج لاہور کے حبیبیہ ہال میں کیا تھا۔ اور مسٹر جناح کی لیگ کا اجلاس کلکتہ میں ہوا تھا۔ مسٹر جناح اور ڈاکٹر کچلو اس زمانے میں گویا یک جان دو قالب بن گئے تھے۔ انہی دنوں مولانا ظفر علی خاں نے اپنے مخصوص رنگ میں یہ نظم لکھی تھی ؎

مچا رکھا ہے غل پنجاب کے رجعت پسندوں نے
کہ دشمن قوم کے اور ملک کے ہیں ڈاکٹر کچلو
کوئی گالی نہیں ایسی جو ان کو دی نہ جاتی ہو
مسلّط ہو گئے ہیں جب سے مسلم لیگ پر کچلو
یہ استعلیق پھبتی ان پہ ہر محفل میں اڑتی ہے
کہ عیسیٰ ہیں اگر جینا[1] تو ہیں عیسیٰ کے خر کچلو
کبھی پھیکی نہ پڑتی جلسۂ لاہور کی رونق
لگا دیتے اگر اٹھ کر نہ کلکتہ کی کر کچلو
غرض جس رنگ میں دیکھو جہاں ڈھونڈو وہی وہ ہیں
یہاں کچلو، وہاں کچلو، ادھر کچلو ادھر کچلو
یہ عزت پا نہ سکتے گر نہ اتنی گالیاں کھاتے
گن ان کے گائیں گھر میں بیٹھ کر اب عمر بھر کچلو

---

[1] بمبئی میں جناح کا تلفظ جینا کیا جاتا تھا۔

دسمبر ۱۹۲۹ء میں کانگریس کا سالانہ اجلاس لاہور میں دریائے راوی کے کنارے ہوا۔ تو ڈاکٹر کچلو مجلس استقبالیہ کے صدر تھے۔ ۱۹۳۰ء میں انھوں نے ستیہ گرہ کی تحریک میں شرکت کی۔ اور دو سال کے لیے جیل بھیج دیئے گئے۔

جیل سے نکلے تو اُن کی مالی حالت سخت خراب ہو چکی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ ۱۹۱۹ء کے بعد انھوں نے جم کر پریکٹس کی نہیں تھی۔ کثیر العیال آدمی تھے۔ اور گھر کا خرچ بہت وسیع تھا۔ امرتسر میں کئی لاکھ کی جائداد تھی۔ وہ بھی آہستہ آہستہ ٹھکانے لگی۔

۱۹۳۳ء میں وہ لاہور اُٹھ آئے کہ ہائی کورٹ میں باقاعدہ پریکٹس کر کے مالی حالت کو کسی قدر درست کیا جائے۔ سال ڈیڑھ سال کے قریب مزنگ کے اڈے کے قریب ایک مکان میں رہے۔ پھر ٹمپل روڈ پر ۱۲ نمبر کی کوٹھی میں آ گئے۔ جس کے نصف حصے میں غلام رسول خاں مرحوم کا قیام تھا۔

ڈاکٹر کچلو سے میری ملاقات تو خاصی پرانی تھی۔ لیکن دوستی ٹمپل روڈ کی اسی کوٹھی میں استوار ہوئی۔ بات یہ تھی کہ غلام رسول خاں مرحوم پنجاب صوبہ مسلم لیگ کے سیکرٹری تھے۔ اور لیگ کا دفتر اُن کے مکان ہی میں تھا۔ میں جائنٹ سیکرٹری تھا۔ اور دفتری کام سارا میرے سپرد تھا۔ اس لیے میرے وقت کا بیشتر حصہ وہیں گذرتا تھا۔ یوں بھی غلام رسول خاں اور کچلو پرانے دوست تھے۔

کچلو بے انتہا فراخ دل، متواضع، وسیع مشرب اور مخیر آدمی تھے۔ جو کچھ

کماتے دوسروں پر خرچ کر ڈالتے تھے۔ میں نے بارہا دیکھا کہ غریب قومی کارکن آتے اور اپنی بچی ضرورتیں بیان کرتے تھے۔ کوئی کہتا کہ گھر میں بیماری ہے اور علاج کے لیے پیسے نہیں۔ کوئی کہتا کہ کپڑے پھٹ گئے ہیں۔ نیا جوڑا بنوانا ہے۔ کوئی کہتا کہ بچے کا نام اسکول سے کٹ گیا ہے اور داخلے کی فیس درکار ہے۔ کچلو بے دریغ اپنی جیب میں ہاتھ ڈالتے اور جو کچھ موجود ہوتا نکال کر دے دیتے اور اگر کمی رہ جاتی۔ تو اندر پیغام بھیج کر بیوی سے منگوا لیتے۔

ڈاکٹر کچلو اور پنڈت جواہر لال نہرو، ایک ساتھ ستمبر ۱۹۰۷ء میں کیمبرج میں داخل ہوئے تھے۔ کچلو علی گڑھ سے اور نہرو ہیرو سے آئے تھے۔ کچلو پیٹر ہاؤس میں تھے۔ اور نہرو ٹرنٹی کالج میں۔ کچلو نے تاریخ اور قانون کی ڈگری لی۔ اور نہرو نے سائنس کی۔ ۱۹۱۱ء میں انھوں نے بیرسٹری کا امتحان پاس کیا۔ اور مونسٹر (جرمنی) جا کر تاریخ ہی میں ڈاکٹریٹ لی۔ کیمبرج میں کچلو کرکٹ بھی کھیلتے تھے اور یونیورسٹی ٹیم کے ممبر تھے۔ وہ کہتے تھے۔ کہ نہرو اس زمانے میں تنہائی پسند آدمی تھے۔ اور کھیل کود میں شریک نہیں ہوتے تھے تاہم کچلو اور نہرو کی دوستی کی بنیاد کیمبرج ہی میں پڑی۔ تصدق احمد خاں شروانی خواجہ عبدالمجید۔ ڈاکٹر سید محمود۔ اور سین گپتا کیمبرج میں کچلو کے ہم عصر طلبہ میں شریک تھے۔ ان لوگوں نے بھی آگے چل کر سیاسی تحریکوں میں بڑا نام پیدا کیا۔

میں نے ڈاکٹر کچلو کی اس زمانے کی تصویریں دیکھی ہیں۔ بالکل صاحب

لوگوں کی سی آن بان اور وضع قطع تھی۔ تحریکِ خلافت میں انھوں نے ڈاڑھی بڑھالی تھی۔ اور کھدر کا لباس پہن لیا تھا۔ جن لوگوں نے کچلو کو ابتدائی دور میں دیکھا تھا وہ انھیں اس حلیے میں دیکھ کر پہچان بھی نہ سکتے تھے۔

علامہ اقبال کچلو کے بڑے مداح تھے۔ اور اس کی وجہ کچلو کا "کیریکٹر" تھا۔ کانگرس کی تحریک میں کیا ہندو کیا مسلمان کیا سکھ، اگر کسی شخص نے اپنا گھر بار لٹایا تو وہ ڈاکٹر کچلو تھے۔ خلافت کا لاکھوں روپیہ خرد برد ہوا۔ بیسیوں آدمیوں نے قومی سرمائے سے ہاتھ رنگے۔ لیکن کچلو اس وقت بھی ایک ایک کوڑی اپنی جیب سے خرچ کرتے تھے۔ وہ بیک وقت آل انڈیا خلافت کمیٹی اور انڈین نیشنل کانگرس دونوں کے سکرٹری تھے۔ لیکن دورے کے وقت ریل کا کرایہ تک اپنی گرہ سے ادا کرتے تھے۔ بیس بیس ہزار کے مجمع میں کھڑے ہو کر تقریر کرتے تو اپنی شیروانی کے پلو کو ہاتھ سے پکڑ کر ہلاتے اور بلند آواز سے کہتے۔ کہ یہ دامن پاک ہے۔

بلاشبہ اُن کا دامن پاک تھا۔ اور یہی ایثار۔ قربانی اور پاک دامانی تھی۔ جس کے اقبال بھی مداح تھے۔ کچلو کا دل یقیناً شیر کا دل تھا لیکن اُن کی علمی قابلیت کا میں چنداں معترف نہ تھا۔ انھوں نے تحریری کام بالکل نہیں کیا۔ اس لیے اُن کی صلاحیتِ تحریر اور زورِ قلم کے متعلق کوئی فیصلہ صادر کرنا دشوار ہے۔

جب ۱۹۳۷ء میں ہندوستان کے نئے آئین کے تحت صوبائی اسمبلی کے الیکشن ہوئے تو ڈاکٹر کچلو کو امرتسر شہر سے کھڑا کرنے میں بڑا ہاتھ علامہ اقبال

کا تھا۔ کانگرس کے ٹکٹ پر اُن کی کامیابی کا کوئی امکان نہیں تھا۔ مسلم لیگ کے ٹکٹ پر وہ کھڑے ہونا چاہتے نہیں تھے۔ علامہ مرحوم نے ایک درمیانی راستہ تلاش کیا۔ اور اُنھیں انڈی پنڈنٹ کھڑا ہونے پر رضامند کر لیا۔

مرزا جلال الدین مرحوم بیرسٹر ایٹ لا یہ حکایت مشہور کرنے کے ذمے دار ہیں۔ کہ جب علامہ اقبال اکتوبر ۱۹۲۶ء میں پنجاب لیجسلیٹو کونسل کی ممبری کے لیے شہر لاہور سے کھڑے ہوئے تھے اور اُن کا مقابلہ ملک محمد دین سے ہوا تھا تو ڈاکٹر کچلو نے اقبال کی مخالفت اور ملک محمد دین کی حمایت کی تھی ــــ پاکستان اور ہندوستان کے بعض مصنفوں نے مرزا صاحب کی اس روایت کا ذکر اپنی کتابوں میں بھی کیا ہے۔

میرے نزدیک یہ کہانی سرے سے غلط ہے۔ بلکہ حقیقت بالکل برعکس ہے۔ کیونکہ ڈاکٹر کچلو نے علامہ مرحوم کی جی کھول کر مدد کی تھی۔ میں اس سلسلے میں صرف ایک واقعہ کا ذکر کرنا کافی سمجھتا ہوں۔

لاہور کے مسلمانوں نے علامہ مرحوم کی الیکشن کی حمایت میں ایک بہت بڑا جلسہ ٹکسالی دروازے کے اندر کیا تھا۔ خود علامہ نے فرمایا تھا۔ کہ اس جلسے کی صدارت کے لیے ڈاکٹر کچلو کو امرتسر سے بلواؤ۔ چنانچہ ڈاکٹر کچلو لاہور تشریف لائے۔ جلسے کی صدارت فرمائی اور علامہ اقبال کی حمایت میں ایک زوردار تقریر کی۔ اِس جلسے کی ایک خصوصیت مجھے اب تک یاد ہے وہ یہ کہ علامہ مرحوم اپنے ساتھ اسرارِ خودی کا انگریزی ترجمہ بھی لائے تھے جو کیمبرج کے پروفیسر نکلسن نے کیا تھا اور اس کے دیباچے کا کچھ حصہ علامہ

نے لوگوں کو پڑھ کر سنایا تھا۔

لاہور کے گورنمنٹ کالج کے سابق پرنسپل قاضی محمد اسلم صاحب اس جلسے میں موجود تھے۔ قاضی صاحب آج بھی خدا کے فضل سے پنجاب یونیورسٹی میں فلسفے کے پروفیسر ہیں۔ اور میری اس گذارش کی شہادت دے سکتے ہیں بلکہ تصدیق بھی فرما سکتے ہیں۔

ڈاکٹر کچلو کو ۱۹۵۳ء میں روسی حکومت نے سٹالن پیس پرائز بھی دیا تھا۔ جو ایک لاکھ روپے کے قریب تھا۔ لیکن انھوں نے یہ پوری رقم ہندوستان کی پیس کمیٹی کے حوالے کر دی۔ اور ایک کوڑی بھی اپنے پاس نہ رکھی۔ حالانکہ خود اُن پر خاصی تنگ دستی کا عالم طاری تھا۔ میری اُن کی آخری ملاقات ۱۹۵۴ء میں لندن میں ہوئی تھی۔ وہ بین الاقوامی پیس کانفرنس میں شریک ہونے سٹاک ہام جا رہے تھے۔ اور دو روز یہاں بھی ٹھہر گئے تھے۔ میں ملنے گیا تو بڑی محبت سے اُٹھ کر بغل گیر ہوئے۔ مزاج میں وہی قلندری اور سکندری کا امتزاج موجود تھا۔ بہت سی پرانی یادیں تازہ کر کے ہنستے ہنساتے رہے۔ حالات کی نامساعدت یا زمانے کی ناسازگاری سے پریشان ہونا وہ جانتے ہی نہ تھے۔ آنکھوں کی بینائی البتہ کمزور ہو گئی تھی۔ کہتے تھے روس جا کر آپریشن کرواؤں گا۔

ڈاکٹر کچلو خط لکھنے کے معاملے میں بے انتہا کاہل اور بخیل تھے۔ میں نے انھیں بیسیوں خطوط لکھے ہوں گے۔ لیکن صرف ایک مرتبہ انھوں نے جواب دیا تھا۔ ملاقات ہوتی تو بار بار معذرت کرتے۔ کہ بھائی معاف کرنا۔ تمھارے

خطوں کا جواب نہیں دے سکا۔ کیا کروں خط لکھنے کا چور ہوں۔ یوں اُن کی محبت و شفقت اور گرمجوشی کا جواب نہیں تھا۔ ایک دفعہ لاہور کی وائی۔ ایم۔ سی۔ اے نے مجھ سے لیکچروں کی فرمائش کی۔ کُل چھ لیکچر ہوئے۔ دو جلسوں کی صدارت کے لیے میں نے ڈاکٹر کچلو سے عرض کیا۔ وہ اُن دنوں امرتسر میں پریکٹس کرتے تھے۔ اور بہت مصروف تھے۔ لیکن دن بھر کے کاموں کو نپٹا کر شام کو امرتسر سے چل کر لاہور آتے اور جلسے کی صدارت کر کے رات کی گاڑی سے واپس چلے جاتے تھے۔

میں ایک ضروری کام سے جنوری ۱۹۴۹ء میں دہلی گیا۔ اور دو مہینے اُن کے ہاں ٹھہرا۔ پنڈت نہرو ہندوستان کے وزیرِ اعظم تھے۔ اور ڈاکٹر کچلو کا مکان پنڈت نہرو کی عالی شان کوٹھی سے بالکل قریب تھا۔ اور پنڈت جی صبح و شام اُن کے مکان کے سامنے سے گذرتے تھے۔ ڈاکٹر کچلو اُن دنوں بالکل بے کار تھے۔ پریکٹس ترک کر چکے تھے۔ امرتسر کی جائداد بھی مدت ہوئی بک چکی تھی۔ آمدنی کا کوئی ذریعہ باقی نہ تھا۔ گذر بسر خدا جانے کس طرح ہوتی تھی۔ لیکن کیا مجال کہ کچلو یا بیگم کچلو کے ماتھے پر شکن بھی آئی ہو — وہی مہمان نوازی۔ عزیز پروری اور گرم جوشی تھی۔ جو عمر بھر اُن کا شیوہ رہا۔

ایک دن میری موجودگی میں پنڈت نہرو بھی تشریف لائے۔ ڈاکٹر کچلو بیمار ہو گئے تھے۔ اور پنڈت جی مزاج پرسی اور عیادت کے لیے آئے تھے گھنٹہ بھر بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ ڈاکٹر کچلو انھیں اُسی پرانے بے تکلفانہ انداز میں اپنے جواہر کہہ کر خطاب کرتے تھے۔ لیکن مجھے آج رہ رہ کر یہ احساس ہوتا

ہے کہ جہاں تک ڈاکٹر کچلو کا تعلق ہے۔ پنڈت نہرو نے حقِ رفاقت ادا کیا نہ حقِ دوستی۔ بھارت کا پورا ملک پنڈت جی کے زیرِ نگیں تھا۔ اُن کے ایک اشارے سے لوگ لکھ پتی نہیں کروڑ پتی بن گئے۔ لیکن اُن کی پڑوس میں، کچلو جیسا عظیم المرتبت انسان افلاس اور تنگ دستی میں مبتلا ہو کر زندگی کے دن کاٹ رہا تھا۔ نہرو کو ہر بات معلوم تھی۔ لیکن اُنھوں نے عمداً کیجئے یا سہواً کچھ نہیں کیا۔ یہ دوست فراموشی اور سنگ دلی کی کالک پنڈت نہرو کے دامن سے کبھی نہیں چھٹ سکتی۔ بیگم کچلو اُس زمانے میں بھی صبر و شکر کا پیکر بنی ہوئی تھیں۔ گھر کا خرچ خدا جانے کس طرح پورا ہوتا تھا۔ بچے سب پڑھتے تھے۔ دو بڑے لڑکے تعلیم سے فارغ ہو چکے تھے۔ لیکن کہیں پر سرکار نہیں ہوئے تھے۔ تاہم اُس نیک دل خاتون نے کبھی شکایت کا ایک لفظ بھی اپنی زبان سے نہیں نکالا۔

ڈاکٹر کچلو کے عروج کے زمانے میں۔ اُن کا حکم امرتسر کے ہندوؤں۔ مسلمانوں۔ سکھوں پر قانون کی طرح چلتا تھا۔ میونسپل کمیٹی کے انتخاب میں، تمام اُمیدواروں نے اپنی اپنی درخواستیں لکھ کر ڈاکٹر کچلو کے حوالے کر دی تھیں۔ کہ جسے چاہیں ممبر نامزد کر دیں۔ کسی وارڈ میں کوئی اُمیدوار مقابلہ نہیں کرے گا۔

جب پنجاب میں اکالیوں کی ایجی ٹیشن زوروں پر تھی۔ اور سکھوں کو اندیشہ تھا۔ کہ مبادا پولیس دربار صاحب میں گھس کر اکال تخت کی بے حرمتی کرے۔ تو اُنھوں نے دربار صاحب کی کنجی ڈاکٹر کچلو کے حوالے کر دی تھی۔

کہ اس امانت کے لیے کچلو سے زیادہ اعتبار والا آدمی اور کوئی نہ تھا۔

یہ تاریخی واقعہ ہے کہ دربار صاحب کا سنگِ بنیاد گورو ارجن دیو جی نے ۱۵۸۸ء میں حضرت میاں میر صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے دستِ مبارک سے رکھوایا تھا۔ ساڑھے تین سو سال بعد جب دربار صاحب پر نازک وقت آیا تو بھی اس مقدس مقام کی حفاظت کے لیے سکھوں کی نظرِ انتخاب ایک مسلمان پر پڑی۔ جس کا نام سیف الدین کچلو تھا۔

یہ باتیں آج کہانیاں معلوم ہوتی ہیں۔ ایک زمانہ تھا کہ ڈاکٹر کچلو کے دوستوں ملاحظوں اور نیازمندوں کا حلقہ پشاور سے مدراس تک پھیلا ہوا تھا۔ لیکن اب تو اُن کی جان پہچان کے آدمی بھی خال خال نظر آتے ہیں —— رہے نام اللہ کا۔

لندن ۱۹۶۶ء

آغا حشر

میں سکول کی چھٹی جماعت میں پڑھتا تھا جب پہلی مرتبہ میں نے تھیٹر کا تماشا دیکھا۔ والدِ مرحوم اُن دنوں بہ سلسلۂ ملازمت لاہور میں مقیم تھے۔ اور اُنہی کے ساتھ میں یہ تماشا دیکھنے گیا تھا۔ بھاٹی دروازے کے باہر میلارام کے منڈوے میں بمبئی کی تھیٹریکل کمپنی آئی ہوئی تھی۔ جہاں صیدِ ہوس کا کھیل دکھایا گیا تھا۔

اُس وقت تھیٹر دیکھ کر جو تحیّر کا سماں مجھ پر طاری ہوا تھا اُس کا تاثر اب تک ذہن کے گوشوں میں چھپا ہوا ہے۔ صیدِ ہوس غالباً شیکسپیئر کے کنگ لیئر کا چربہ تھا جسے آغا حشر نے بڑی چابک دستی سے اپنے الفاظ میں کاغذ پر اُتارا تھا۔ وِلن کا پارٹ مشہور ایکٹر ماسٹر غلام قادر نے کیا تھا۔ مجھے یاد ہے سٹیج کے چاروں طرف سیاہ پردے لٹک رہے تھے۔ روشنی بہت مدھم کر دی گئی تھی۔ نقلی آسمان پر کہیں اِکّا دُکّا ستارہ چمک رہا تھا۔ اس پُراسرار

ماحول میں یکایک ایک کونے سے ماسٹر غلام قادر سٹیج پر داخل ہوئے۔ ہاتھ میں خنجر تھام رکھا تھا۔ اور ٹھہر ٹھہر کر ایک نظم کے چند شعر پڑھتے تھے۔ جس کا یہ پہلا مصرع یاد رہ گیا ہے۔ ؎

فلک پر بادل ہے چھایا

ماسٹر غلام قادر لاہور کے رہنے والے تھے۔ اُن کا آبائی مکان موچی دروازے کے اندر تکیہ سادھواں میں تھا۔ بڑے خوب صورت آدمی تھے۔ کھلتا ہوا گندمی رنگ۔ لمبا قد۔ بڑی بڑی مونچھیں۔ ستواں ناک۔ شربتی آنکھیں۔ آواز میں طنطنہ اِس پائے کے ایکٹر اُس زمانے میں ہندوستانی سٹیج کو بہت کم میسر آئے تھے۔

اِس واقعہ کے دس بارہ سال بعد میں نے پھر ایک مرتبہ اُنھیں لاہور ہی میں دیکھا تھا۔ اُس وقت وہ سٹیج کے کھیل کو ترک کر کے سینما میں چلے گئے تھے اور میڈن تھیٹرز میں کام کرتے تھے۔ "کلین شیو" ہو گئے تھے۔ لیکن فلمی دنیا میں وہ بالکل نہ چمک سکے۔ اُن کی اداکاری کے جوہر صرف تھیٹر میں کھلتے تھے۔

اِس طرح آغا حشر کے دو ایک کھیل دیکھ کر مجھے اُن کے نام سے شناسائی ہوئی تھی۔ لیکن ملاقات کا شرف ۱۹۳۴ء میں حاصل ہوا جب وہ کلکتہ سے لاہور تشریف لائے اور پھر جیتے جی اُنھوں نے یہ شہر چھوڑ کر کہیں اور جانا گوارا نہ کیا۔ حتیٰ کہ لاہور ہی کی مٹی میں دفن بھی ہوئے۔ اُس زمانے میں آغا کی صحت اِس قدر خراب تھی کہ دیکھ کر دھڑکا ہوتا تھا کہ شاید قدرت اُنھیں زندگی کے آخری دن پورے کرنے کے لیے یہاں کھینچ لائی ہے۔ دیس کو دس روڈ پر

انھوں نے ایک کوٹھی کرائے پر لے لی تھی۔ اور حشر پکچرز کے نام سے فلم سازی کا کام بھی شروع کر دیا تھا۔ کوٹھی کے دروازے پر انھوں نے اپنے نام کا بورڈ آویزاں کیا تھا۔ اس پر لکھا تھا "انڈین شیکسپیئر آغا حشر کاشمیری"۔

آغا جب کلکتہ کو خیر باد کہہ کر مستقل طور پر لاہور آ گئے تو ان کے متعلق طرح طرح کی افواہیں پھیلنے لگیں۔ بعض کہتے تھے کہ ان کے پاس بے اندازہ دولت ہے اور وہ میڈن تھیٹرز کا جواب تیار کریں گے۔ بعض لوگوں نے یہ مشہور کر رکھا تھا کہ آغا بالکل فلاش ہیں اور کلکتہ سے بھاگ کر پردہ پوشی کے لیے یہاں آئے ہیں۔ چند افراد کو یہ بھی کہتے سنا گیا تھا کہ آغا کلکتہ میں بہت ارزاں ہو گئے تھے اور اب پھر سے اپنی ساکھ بٹھانے کے لیے لاہور آ گئے ہیں۔ بہر حال اسی زمانے میں ان کے ساتھ ایک عورت بھی تھی جو ان کی زندگی کے ہر پہلو پر چھائی ہوئی تھی۔ میری مراد امرتسر کی مشہور مغنیہ مختار بیگم سے ہے۔ مختار شکل و صورت کے اعتبار سے تو معمولی تھی لیکن اپنی خوش نوائی اور خوش ادائی سے اسی نے ایک عالم کو مسخر کر رکھا تھا۔ آغا صاحب کو اس سے جو تعلق خاطر تھا وہ عشق کے قریب قریب پہنچ گیا تھا۔ آغا کی معیت میں لاہور آنے سے پہلے وہ کلکتہ کے میڈن تھیٹرز میں ان کی لکھی ہوئی دو فلموں میں کام کر چکی تھی۔ اور وہیں یہ ملاقات بھی پختہ ہوئی تھی۔

مجھے آغا حشر سے اب تک ملنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ اور ان کے عام طرز بود و ماند کے متعلق جو کچھ میں نے سن رکھا تھا اس کے پیش نظر میں ان کی خدمت میں حاضر ہونے کا چنداں شوقین بھی نہیں تھا۔ میں نے آغا کی

انانیت، خودستائی اور بے پناہ تعلّی و تفاخر سے لبریز گفتگو کی جو داستانیں سُنی تھیں وہ بڑی دلچسپ اور عجیب و غریب تھیں۔ اِتفاق کی بات کہ اُنہی دنوں میرے مرحوم دوست منصور احمد اُن کے ہاں آنے جانے لگے۔ منصور مرحوم ادبی دُنیا کے ایڈیٹر تھے۔ ایک روز اُنھوں نے مجھ سے کہا کہ "تم آغا سے اب تک نہیں ملے؟ وہ تو بڑے دلچسپ آدمی ہیں۔ آج چلو میرے ہمراہ وہاں"

میں نے کچھ تامّل کیا تو کہنے لگے کہ "بذلہ سنجی اور لطیفہ گوئی ادب کی ایک خاص صنف ہے۔ اور یہی چیز ہمیں کشاں کشاں وہاں لے جاتی ہے۔ آغا کی حاضر جوابی اور فقرے بازی دیکھنے اور سُننے کی چیز ہے"

چنانچہ میں اُس شام منصور احمد کے ساتھ آغا صاحب کے ہاں پہنچ گیا۔ آغا شاذ ہی کسی کو خاطر میں لاتے ہوں گے۔ لیکن منصور احمد کی وہ واقعی عزت کرتے تھے۔ اُن سے بڑی گرم جوشی سے ملے۔ منصور نے بہت اچھے اور خوش نما لفظوں میں میرا تعارف کرایا۔ اور آغا صاحب نے گہری نظروں سے مجھے سر سے پاؤں تک دیکھا۔

اِس ملاقات کے بعد میرا اُن کے ہاں آنا جانا شروع ہو گیا۔ اور بات چیت میں اچھی خاصی بے تکلفی بھی پیدا ہو گئی تھی۔ آغا کی باتوں میں جو طنطنہ اور تبختر ہوتا تھا وہ سُننے والوں کو لُطف دے جاتا۔ لیکن کبھی کبھی حیران بھی کر دیتا تھا یہ اُن کا خاص رنگ تھا جو آہستہ آہستہ طبیعت کا جزو بن گیا تھا۔ گالی دینے میں بھی وہ بہت تیز تھے۔ محفل میں اکثر نوک جھونک ہوتی رہتی تھی۔ اور کبھی کبھی

وہ مختار بیگم کو بھی اپنی پھبتیوں کا ہدف بنا لیتے تھے۔ ایک روز مختار کی موجودگی میں مجھ سے پوچھنے لگے "اس عورت کے متعلق تمھاری کیا رائے ہے؟"

میں نے عرض کیا "جو قتالۂ عالم آغا حشر ایسے گھاگ کے قلب و نظر کو شکار کرے وہ بلاشبہ لاکھوں میں ایک ہے"

اس پر ہنسے اور بہت خوش ہوئے۔ پھر مختار بیگم سے کہنے لگے "سنتی ہو کیا رائے ہے تمھارے متعلق لوگوں کی"

عجیب اتفاق ہے کہ ادھر چند سال ہوئے مختار بیگم لندن آئیں تو مجھ سے بھی ملیں۔ اور یوں ہم نے لاہور سے چھ ہزار میل دور بیٹھ کر پھر سے آغا حشر کی پرانی صحبتوں کی یاد تازہ کی۔ اُن کے قیام لندن کے دوران میں بعض خوش ذوق احباب کی ایک منتخب محفل بھی منعقد ہوئی جہاں مختار بیگم نے چند غزلیں گا کر سنائیں۔ اُنھی کی زبانی معلوم ہوا کہ آغا نے یہ شعر مختار کو مخاطب کر کے کہا تھا کہ

شہیدِ عشق کے ماتم میں چشمِ ناز پُرنم ہو
مبارک اُس کا مرنا جس کے مرنے کا تجھے غم ہو

آغا صاحب کا رہن سہن عجیب تھا۔ پیسہ اُن کی ہتھیلی پر ٹھہر نہیں سکتا تھا اُنھوں نے لاکھوں کمائے اور بے دریغ خرچ کر ڈالے۔ کبھی وہ لکھ پتی بن جاتے اور کبھی اُن کی جیب میں پھوٹی کوڑی بھی نہ ہوتی۔ گھر میں ہر چیز اُدھار پر آتی تھی۔ اِس طرح ہزاروں کا قرض چڑھ جاتا تھا۔ پھر جب کہیں سے بڑی سی رقم وصول ہوتی تو قرض خواہوں کو سو کی بجائے سوا سو دے کر اگلا پچھلا حساب

صاف کر دیتے تھے۔ لاہور میں عام لوگوں کو ان کی طرزِ زندگی سے آگاہی نہ تھی۔ ایک روز دو دکان دار آ گئے۔ ملازموں نے بتایا کہ ان کے ہاں سے سودا سلف آتا رہا ہے۔ اور اب یہ روپے کا تقاضا کر رہے ہیں۔ اس وقت محفل جمی ہوئی تھی اور آغا بلبلِ ہزار داستان بنے ہوئے چہک رہے تھے۔ انھوں نے دکان داروں کی طرف دیکھ کر کہا "روپیہ مانگنے آئے ہو؟"

دکان داروں نے دبی زبان میں کہا "جی"

آغا چمک کر بولے "یہ لوگ جو اوب سے میرے اِرد گرد بیٹھے میری باتیں سن رہے ہیں۔ اِن کو جانتے ہو؟"

دکان دار بچارے چپ رہے۔

آغا نے ہم میں سے ایک ایک کی طرف انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے بلند آواز میں کہنا شروع کیا۔

"دیکھو! یہ ہندوستان کے سب سے بڑے ادبی رسالے کے ایڈیٹر ہیں۔ یہ ہندوستان کے سب سے بڑے غزل گو شاعر ہیں۔ یہ ہندوستان کے سب سے بڑے افسانہ نویس ہیں۔ یہ ہندوستان کے سب سے بڑے صحافی ہیں۔ یہ ہندوستان کے سب سے بڑے مزاح نگار ہیں۔"

اور پھر اپنی چھاتی پر ہاتھ رکھ کر اور کرسی سے دو اِنچ اوپر اٹھ کر رعد کی سی گرج دار آواز میں بولے "اور میں ..... میں ڈرامے کا خدا ہوں۔ ..... جاؤ۔ بھاگ جاؤ۔"

دکان دار بوکھلا سے گئے اور چپکے سے اٹھ کر الٹے پاؤں واپس

چلے گئے۔

اسی طرح ایک دن مالک مکان کے گماشتے کی جو شامت آئی تو کرایہ مانگنے آ گیا۔ آغا ایک دم اپنے مخصوص لہجے میں چمک کر بولے "کہاں ہے تمہارا مالک؟"

اُس نے کہا "کشمیر گئے ہیں وہ۔"

آغا نے کہا "اُس کو لکھ دو کہ ہری سنگھ سے کرائے کی رقم لے لے۔ میں ہری سنگھ کو خط لکھ دوں گا۔"

گماشتے نے پوچھا "ہری سنگھ کون؟"

آغا سے اب مزید صبر نہ ہو سکا۔ تعدد سے بولے "کشمیر کا راجہ۔ اور کون تمہارا باوا؟"

ایک دن میں نے پوچھا کہ "کوٹھی کے دروازے پر جو بورڈ لٹک رہا ہے اُس پر آپ کے نام کے ساتھ انڈین شیکسپیئر بھی لکھا ہوا ہے۔ کیا یہ لفظ آپ کی منظوری سے لکھا گیا ہے؟"

فرمایا "ہاں، میں نے خود لکھوایا ہے۔ تمام ہندوستان مجھے انڈین شیکسپیئر کہتا ہے۔ پھر میں کیوں اپنے نام کے ساتھ یہ لقب استعمال نہ کروں؟"

"مجھے کچھ حیران سا دیکھ کر کہنے لگے "خوشامد روح کی غذا ہے۔ جب لوگ میری تعریف کرتے ہیں تو میں بہت خوش ہوتا ہوں۔"

اتنے میں ایک ملازم پاس سے گذرا۔ کہنے لگے "جب دنیا مجھے انڈین شیکسپیئر کہتی ہے۔ اور آپ لوگ یہاں آ کر میری تعریف کرتے ہیں تو میرے

ملازم دل میں یقیناً خوش ہوتے ہوں گے کہ وہ کتنے بڑے آدمی کی نوکری کر رہے ہیں۔"

ایک روز میں نے عرض کیا کہ "سنا ہے جب آپ نے انجمنِ حمایتِ اسلام کے جلسے میں اپنی نظم شکریۂ یورپ پڑھی تھی تو بہت سے ثقہ لوگوں نے اعتراض کیا تھا کہ آغا حشر کو پروگرام میں کیوں جگہ دی گئی ہے۔

فرمایا "ثقہ لوگوں سے تمھاری کیا مراد ہے؟"

میں نے کہا "یہی اکابرِ قوم کی قسم کے لوگ۔"

کہنے لگے "ہاں۔ چند برخود غلط لوگوں نے اعتراض کیا تھا کہ جس پلیٹ فارم پر حالی، شبلی اور نذیر احمد اپنی خوش نوائی کے جوہر دکھا چکے ہیں۔ وہاں ایک بھانڈ کو کیوں بلایا گیا ہے۔ گویا اُن کے نزدیک ایک ڈرامہ نگار کا مرتبہ بھانڈ کے برابر ہے۔ یہ ہمارے ادب کی تحقیر اور فن کی تذلیل ہے۔ خیر، بات آئی گئی ہوئی۔ جب میں نظم پڑھ چکا تو چاروں طرف سے خوب خوب داد ملی۔ سٹیج سے اُترتے وقت میں نے کرسیوں کی اُس قطار کی طرف بھی دیکھا جہاں یہ اکابرِ قوم کی قسم کے لوگ بیٹھے تھے۔ یعنی میاں محمد شفیع۔ نواب ذوالفقار علی خاں۔ میاں فضلِ حسین۔ میاں سراج الدین۔ نواب فتح علی خاں۔ ڈاکٹر اقبال وغیرہ۔ میں نے اُن کو مخاطب کر کے کہا کہ میرے اور آپ کے راستے الگ الگ ہیں میں نے عمداً آپ کے کام کی طرف توجہ نہیں کی ورنہ یہ کرسیاں میں آسانی سے اپنے لیے خالی کروا سکتا تھا۔ اس پر باقی تو چپ رہے۔ صرف ڈاکٹر اقبال نے مسکرا کر کہا "بے شک۔ بے شک۔"

ایک دن یونہی باتوں باتوں میں مجھ سے پوچھ بیٹھے کہ "تمھارا مکان کہاں ہے؟"

میں اُن دنوں اسلامیہ کالج کے قریب مہر چند سٹریٹ میں رہتا تھا۔ میں نے پتا بتایا تو ٹھیک طرح سمجھ نہ سکے۔

میں نے عرض کیا "برانڈرتھ روڈ پر رام گلی کے موڑ کے بالمقابل مہر چند سٹریٹ شروع ہوتی ہے۔"

کہنے لگے "وہی رام گلی جہاں مولوی ظفر علی خاں کے اخبار کا دفتر بھی رہا ہے۔"

میں نے کہا "جی ہاں۔ وہی رام گلی۔"

ایک دن دوپہر کے وقت میرے مکان کے نیچے کوئی شخص زور زور سے مجھے آواز دے رہا تھا۔ میں نے کھڑکی میں سے جھانک کر دیکھا تو ایک تانگے پر جس کی چھت ٹوٹی ہوئی تھی۔ آغا حشر بیٹھے تھے۔ اور کوچبان کھڑا مجھ کو پکار رہا تھا۔ میں لپک کر نیچے گیا۔ اور تعجب سے پوچھا کہ "آپ یہاں کیونکر تشریف لے آئے؟ چلئے اُوپر۔"

کہنے لگے "زینہ تو میں چڑھ نہیں سکتا۔ البتہ نیچے جگہ ہو تو وہاں بیٹھ جاؤں گا۔"

میں نے عرض کیا "نیچے بھی کمرہ موجود ہے۔ لیکن اُوپر والی جگہ اچھی ہے پہلے یہ فرمائیے کہ آج اتنی گرمی میں کیونکر ذرّہ نوازی فرمائی آپ نے؟"

اُنھوں نے تانگے والے کی طرف دیکھ کر اور ایک بڑی سی گالی دے کر کہا

"اس سے پوچھ لو۔"

تانگے والا گردن جھکائے چپ کھڑا تھا۔ پھر خود ہی گویا ہوئے کہ "میں کئی دن سے اپنے تانگے کے لیے ایک گھوڑا خریدنے کی فکر میں تھا۔ ایک شخص نے بتایا کہ برانڈرتھ روڈ پر حمایت اسلام کے دفتر کے پاس ایک اچھا بکاؤ گھوڑا موجود ہے۔ میں گھر سے برانڈرتھ روڈ جانے کے لیے نکلا اور یہ (بڑی سی گالی دے کر) تانگے والا مجھے برانڈرتھ روڈ کی بجائے شاہی مسجد قلعہ اور سرکلر روڈ کی طرف لے گیا۔ ایک گھنٹہ وہاں خراب کرتا رہا۔ اور اب برانڈرتھ روڈ پر آیا تو میں گرمی سے نڈھال ہو چکا تھا۔ رام گلی کا موڑ دیکھ کر مجھے مہر چند سٹریٹ کا نام اور تمہارے مکان کا پتا یاد آیا۔ اور یوں تمہارا ٹھکانہ مل گیا۔"

میں نے چاہا کہ آغا تھوڑی دیر غریب خانے پر آرام فرمائیں لیکن وہ نہ مانے۔ تانگے میں بیٹھے ہی بیٹھے انھوں نے پانی پیا۔ پھر پوچھنے لگے —

"قومی کتب خانہ کہاں ہے؟"

میں نے عرض کیا "قریب ہی تو ہے۔"

کہنے لگے "میرے ساتھ چلو۔ وہاں سے کتابیں خرید لیں۔"

قومی کتب خانے کے سامنے تانگہ رکا تو میں نے اندر جا کر شیخ محمد نصیر ہمایوں کو بتایا کہ آغا حشر آئے ہیں۔ ہمایوں صاحب بھاگ کر باہر سڑک پر آئے۔ اور ہم دونوں نے آغا صاحب کو ہاتھوں کا سہارا دے کر نیچے اتارا۔ بڑی مشکل سے وہ دکان کی چند سیڑھیاں چڑھ کر اندر داخل ہوئے۔ ہمایوں صاحب

کی کتابوں سے بھری ہوئی الماریاں غور سے دیکھتے رہے۔ پھر چند کتابیں پسند فرمائیں۔ دام دینے کے لیے بٹوا نکالا تو ہمایوں صاحب نے قیمت لینے سے انکار کر دیا۔ اور کہا کہ "یہ فخر کیا کم ہے کہ آغا حشر خود میری دکان پر تشریف لائے ہیں"

آغا صاحب نے بہت اصرار سے قیمت ادا کی۔ اور واپس تشریف لے گئے۔

۱۹۳۵ء کے اوائل میں میری اور اختر شیرانی کی مشترکہ ادارت میں رسالہ رومان نکلا۔ رومان کے سرورق پر اختر کا یہ شعر درج تھا۔

ذرّے ذرّے کا دل اِک محشرِ نظارہ ہے
ساری دُنیا مرے رُومان کا گہوارہ ہے

پہلا نمبر شائع ہوا تو میں اور اختر دونوں آغا صاحب کی خدمت میں پرچہ نذر کرنے کے لیے حاضر ہوئے رسالہ دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ کچھ دیر ورق گردانی فرمائی۔ دو چار منٹ سید جمال الدین افغانی کی تصویر کو غور سے دیکھتے رہے۔ جوش ملیح آبادی کی غزل۔

محفلِ عشق میں وہ نازشِ دوراں آیا
اے گدا خواب سے بیدار کہ سلطاں آیا

ساری کی ساری پڑھ ڈالی اور مسکرا دیے۔ پھر سر سید کے اپنے ہاتھ کی لکھی ہوئی فارسی کی غزل

غلاطوں طفلکے باشد زیونانے کہ من دارم

مسیحا رشک می دارد زدرمانے کہ من دارم

کا عکسی فوٹو دیکھ کر بہت مسرور ہوئے۔ اور کہا کہ "یہ تبرک آپ کو کہاں سے ہاتھ لگ گیا"۔

جب سرورق کا شعر دیکھا تو چیں بہ جبیں ہو کر کہا "بہت بھدا شعر ہے کس کا ہے؟"

اختر چھپنے والی اسامی تو نہ تھے لیکن یہ سن کر شرما گئے۔ میں نے عرض کیا "اختر صاحب کی تراوشِ فکر ہے"۔

کہنے لگے "ہاں۔ اختر ایسے شعر کہتا ہے؟"

اختر نے کہا "آغا صاحب۔ کیا کیا جائے۔ آپ شعر نہ لکھیں گے تو مجبوراً ہمیں کو خانہ پری کرنا پڑے گی"۔

آغا نے دو منٹ توقف کر کے فرمایا "آئندہ یہ شعر سرورق پر لکھو۔

کہو زاہد سے کیوں ہے اِس قدر فردوس پر نازاں

ہزاروں جنتیں آباد ہیں تخیلِ اختر میں

میں نے عرض کیا "اسی زمین میں کچھ اور بھی ارشاد کیجئے تاکہ مکمل غزل ہو جائے"۔

آغا صاحب نے بیٹھے بیٹھے دس بارہ شعر کی غزل لکھوا دی۔ جس کے صرف دو شعر یاد رہ گئے ہیں۔

یہی اِک عشوۂ رنگین سے دل کو مست کرتی ہے
وہ دُختِ چار دہ سالہ جو ہے آغوشِ ساعت میں
نہ پُوچھ اے بے وفا کیوں تک رہا ہوں تیری صُورت کو
مُقدّر کی کہانی پڑھ رہا ہوں تیرے تیور میں

اُنہی دنوں منصور احمد مرحوم ادبی دُنیا کا ڈراما نمبر نکالنے والے تھے۔ آغا صاحب نے اُن کو اپنے تازہ کھیل رستم و سہراب کا ایک باب اشاعت کے لیے دیا۔ ایک روز منصور احمد نے آغا صاحب سے کہا کہ "آپ ڈراما کیوں کر لکھتے ہیں؟ اس سوال کا مفصّل جواب عنایت کیجئے تاکہ میں ادبی دنیا میں شائع کروں۔"

آغا صاحب نے جواب میں پندرہ منٹ تقریر کی جسے منصور مرحوم قلم بند کرتے گئے۔ مجھے اُس تقریر کا صرف ایک فقرہ یاد رہ گیا ہے جو حُسنِ اتفاق سے آغا کی زندگی کے ایک خاص پہلو پر روشنی ڈالتا ہے۔

"منصور صاحب! بعض لوگ کہتے ہیں کہ آغا حشر شراب پی کر ڈراما لکھتا ہے۔ میں آپ سے سچ کہتا ہوں۔ میں نے آج تک شراب پی کر ایک لفظ نہیں لکھا۔"

آغا صاحب کا انتقال ۲۸ اپریل ۱۹۳۵ء کو ہوا تھا۔ میں اپنے وطن بٹالہ گیا ہوا تھا۔ وہیں یہ اندوہناک خبر سُنی۔ افسوس کہ اُن کے جنازے میں شریک نہ ہو سکا۔ لاہور کو یہ فخر ہے کہ اُس کی سرزمین میں آغا حشر ایسا نادرۂ روزگار شخص دفن ہے۔ لیکن افسوس کہ اہلِ لاہور کو اب تک یہ توفیق

نہیں ہوئی کہ کم از کم حشر کے چند ڈرامے ہی صحت کے ساتھ شائع کر دیئے جائیں۔ حشر کا نام زندہ رکھنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ اُس کا کام زندہ رکھا جائے۔

مولانا صلاح الدّین احمد

مولانا صلاح الدّین احمد کے والدِ مرحوم و مغفور مولوی احمد بخش صاحب جب گورداسپور کے ہائی سکول میں اُردو اور فارسی کے مدرّس تھے تو میرے والدِ مرحوم وہاں پڑھتے تھے اور مولوی صاحب کے شاگرد تھے۔ مولانا صلاح الدین احمد کے بڑے بھائی مولوی ضیاء الدین احمد مرحوم اُس وقت بالکل بچّے تھے۔ اور مولوی صاحب اکثر اُنھیں اپنے ہمراہ سکول لے جایا کرتے تھے۔ والدِ مرحوم فرماتے تھے کہ مولوی احمد بخش صاحب کلاس کو درس دیتے اور ضیاء الدین احمد کھیلتے رہتے تھے۔

مولانا صلاح الدّین احمد کے سب سے بڑے بھائی حافظ فیروز الدین صاحب بدورانِ ملازمت میرے والدِ مرحوم کے ہم عصر تھے۔ اور خود مولانا، لاہور کے اسلامیہ کالج میں میرے بڑے بھائی ذوالفقار علی خاں صاحب کے کلاس فیلو تھے لیکن عجیب

اتفاق ہے کہ مولانا کی دوستی کا شرف اِس خاکسار کو حاصل ہُوا۔ دوستی بھی ایسی کہ آج ماضی پر نظر ڈالتا ہوں تو زندگی کی سب سے قیمتی متاع یہی دوستی نظر آتی ہے جس کے طفیل غموں کا بوجھ ہلکا ہُوا۔ خوشی کی لازوال گھڑیاں نصیب ہوئیں ہمدردی، غم خواری اور دلداری کی نعمتیں میسّر آئیں۔ اور ہم خیالی، ہم فکری اور ہم ذوقی کی دولت ہاتھ آئی۔

۱۹۳۵ء سے لے کر فروری ۱۹۵۳ء تک غالباً ایک دن بھی ایسا نہ گزرا ہوگا کہ میں مولانا سے ملنے اُن کے دفتر میں نہ گیا ہوں۔ بیماری اور سفر کی اِستثنائی حالت میں البتہ اِن ملاقاتوں میں ناغہ ہونا ناگزیر تھا۔ یُوں، گرمی سردی، جاڑا، برسات کوئی موسم ہو۔ ہر روز سرِ شام میرے قدم خود بخود ادبی دُنیا کے دفتر کی جانب اُٹھ کھڑے ہوتے تھے۔ اِدھر مولانا بھی دن بھر کے کاموں کو نپٹا کر میرے منتظر رہتے۔ ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ، اپنی کرسی سے اُٹھ کر مصافحہ کرتے۔ میں ہمیشہ عرض کرتا۔ یہ کھڑے ہونے کا تکلّف آپ کیوں کرتے ہیں۔ خواہ مخواہ شرمسار کرتے ہیں آپ مجھے۔

ہنس کر فرماتے۔ نہیں، حفظِ مراتب کا پاس ضروری ہے۔

سال بھر کے ۳۶۵ دنوں کو اٹھارہ سے ضرب دیجئے۔ پھر خود ہی غور فرمایئے کہ اِن تمام روزانہ ملاقاتوں کی رُوداد ایک مختصر سے مضمون میں قلم بند ہو تو کیوں کر ہو۔ زندگی، معاشرت، سیاست، ادب، تاریخ، مذہب، قانون، فلسفہ، مزاح تفنّن، غرضکہ کائنات کا کوئی پہلو ایسا نہ تھا، جس پر ہم نے گھنٹوں باتیں نہ کی ہوں۔ مولانا کے فیضِ صحبت سے میں نے بہت کچھ حاصل کیا۔ اُن کے تجربات

سے بہت کچھ سیکھا۔ اُن کے مزاج کی دلآویزی۔ نرمی اور یک رنگی سے حسبِ استعداد بہت کچھ استفادہ کیا۔

ہر شخص کی زندگی میں ایک وقت آتا ہے جب اُسے مستقبل کے بارے میں دو ٹوک فیصلہ کرنا پڑتا ہے۔ مولانا کی زندگی میں یہ وقت ۱۹۲۱ء میں آیا تھا جب وہ لاہور کے سناتن دھرم کالج میں فورتھ ایئر میں پڑھتے تھے اور بی اے کے امتحان میں صرف تین مہینے باقی رہ گئے تھے۔ خلافت اور ترکِ موالات کی تحریکیں اِس زور سے اُٹھی تھیں کہ پورا برِ عظیم اس زلزلے سے ہل گیا تھا۔ اِن تحریکوں کی سب سے بڑی زد طلبہ پر پڑی، جنھیں کالجوں اور یونیورسٹیوں سے منقاطعہ کرنے کی تلقین کی گئی تھی۔ مولانا نے بھی وقت کی آواز پر لبیک کہا اور تعلیم ترک کر دی۔ لاہور میں اُنہی دنوں لالہ لاجپت رائے نے ایک نیشنل یونیورسٹی قائم کی تھی۔ مولانا وہاں داخل ہو گئے اور چند ماہ بعد اسی یونیورسٹی کا امتحان پاس کر کے گاندھی جی کے ہاتھ سے ڈگری حاصل کی۔

جب ۱۹۲۱ء میں مانٹیگو چیمسفرڈ اصلاحات نافذ ہوئی تھیں تو برطانوی حکومت نے فیصلہ کیا تھا کہ آئندہ انڈین سول سروس اور انڈین پولیس کے امتحان انگلستان کے علاوہ ہندوستان میں بھی ہوا کریں گے۔ لیکن اِن عہدوں کے لیے موزوں اُمیدواروں کی پہلی قسط مقابلے کے امتحان کے ذریعہ سے نہیں بلکہ حکومت کی نامزدگی سے حاصل کی جانے والی تھی چنانچہ ۱۹۲۱ء میں آئی۔ سی۔ ایس اور انڈین پولیس کی جملہ اسامیوں کے لیے تمام اُمیدواروں کا تقرر نامزدگی ہی سے عمل میں آیا تھا۔ اِن اُمیدواروں کا انٹرویو ۱۹۲۰ء

میں ہوا۔ جہاں مولانا صلاح الدین احمد کو حکومتِ بمبئی کی طرف سے طلب کیا گیا تھا
انٹرویو میں مولانا کامیاب ہو گئے۔ اور چند ہی مہینے بعد انھیں اے۔ ایس۔ پی
کے عہدے کی پیش کش ہونے والی تھی کہ وہ بے دریغ ترکِ موالات کا جھنڈا ہاتھ میں
اٹھا کر تحریکِ خلافت میں کود پڑے۔

اگر اُس وقت یہ سیاسی ہنگامہ برپا نہ ہوتا اور ہماری اجتماعی زندگی عام
ڈگر پر جاری رہتی تو مولانا بھی معمول کے مطابق اے۔ ایس۔ پی بھرتی ہو کر انسپکٹر جنرل
کے عہدے سے ریٹائر ہوتے۔ اب یہ کام سوچنے والوں کا ہے کہ فیصلہ کریں
کہ مولانا کے لیے سرکاری ملازمت زیادہ عزت اور نیک نامی کا باعث بنتی یا
جو حالات بعد میں رونما ہوئے وہ اُن کے لیے زیادہ اعزاز کا موجب ثابت
ہوئے۔ مولانا محمد علی مرحوم بھی تو انڈین سول سروس میں داخل ہوتے ہوتے
رہ گئے تھے۔ اگر وہ آئی۔ سی۔ ایس بن جاتے تو زیادہ سے زیادہ یہی ہوتا
کہ حکومتِ ہند کے ڈپٹی سیکرٹری کے منصب تک پہنچ کر پنشن پاتے۔ یہ بیس لاکھ
ایڈیٹر کامریڈ اور بطلِ حریت تو کبھی نہ بن سکتے تھے۔

جب ۱۹۲۱ء میں مولانا نے اُس ملازمت کو ٹھکرایا جو انگریزی راج میں
ہندوستانی نوجوانوں کے خوابوں کی معراج تھی تو پھر یقین کیجیے گا کہ انھوں نے
اپنی زندگی کے آخری دن تک کبھی پلٹ کر پیچھے نہیں دیکھا اور ایک لمحہ کے لیے
بھی اپنے فیصلے پر تاسف، ندامت اور افسوس کا اظہار نہیں کیا۔

اِس واقعہ کے پورے بیالیس سال بعد، جب اُن کے فرزندِ دوم معز الدین احمد
نے مقابلے کا امتحان پاس کر کے پاکستان کی سول سروس میں شرکت کی تو مولانا نے

جس حسرت و اندوہ سے بھرا ہوا خط مجھ کو لکھا۔ اُس کے ایک ایک لفظ سے ظاہر ہوتا تھا کہ بیٹے نے باپ کی مرضی کے خلاف سول سروس کو ترجیح دی ہے باپ کی خواہش تھی کہ بیٹا سرکاری منصب کے جاہ و جلال سے بے نیاز ہو کر علمی زندگی اختیار کرے۔ میں نے مولانا کو جواب دیا کہ وہ زمانہ لد گیا جب ہم نے آنکھیں بند کر کے زندگی کے خار زار میں قدم رکھا تھا۔ اور خدا کو حاضر و ناظر سمجھ کر عہد کیا تھا کہ ہر قسم کی تنگی ترشی برداشت کریں گے۔ لیکن کبھی حرفِ شکایت زبان پر نہیں لائیں گے۔ اب دنیا کا رنگ ڈھنگ اور ہے۔ پاکستان کی معاشرت و معیشت بدل گئی ہے۔ بچے کو خوشی سے سول سروس میں جانے دیجیے۔

مولانا جیسے مزاج کے، خاموش پسند انسان تھے۔ اُنھوں نے قوم کی آواز پر لبیک کہہ کر تعلیم تو ترک کر دی۔ لیکن عملاً سیاست سے اپنے آپ کو وابستہ نہ کر سکے۔ اُس زمانے کی سیاست تھی بھی یہی نعروں، جلسوں اور جلوسوں کا مرکب اور مولانا اِس قسم کے ہنگاموں سے دور رہنا چاہتے تھے۔ مسلمان نوجوان کے لیے دوگونہ عذاب تھا۔ تجارت اور صنعت و حرفت کے علاوہ بنکوں، بیمہ کمپنیوں درآمد و برآمد کے کاروباری اداروں اور کارخانوں پر ہندوؤں کا اجارہ تھا جہاں قومی کام کرنے والے ہندو نوجوانوں کے لیے روزگار کی بیسیوں راہیں کھلی تھیں۔ خود لالہ راجپت رائے نے ترکِ موالات ہی کے زمانے میں لکشمی انشورنس کمپنی کے نام سے ایک بہت بڑی بیمہ کمپنی لاہور میں قائم کر دی تھی تاکہ جن ہندو نوجوانوں نے وکالت اور تعلیم ترک کی تھی انھیں اس کمپنی میں ملازمت مل سکے

چنانچہ پنڈت کے سنتانم - لالہ بھیم سین سچر - ڈاکٹر گوپی چند بھارگو۔ کرشن گوپال دت وغیرہ کو معاش کی قطعاً کوئی دقت پیش نہ آسکی - اِس کے برعکس جن مسلمان نوجوانوں نے تعلیم ترک کی تھی - اُن کا عبرت ناک انجام آج بھی یاد آتا ہے تو رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں -

مولانا کو اِس دوران میں، قوتِ لایموت کے لیے بڑی محنت اور شبانہ روز مشقت کرنا پڑی - اُن کے خاندان میں کسی شخص نے تجارت نہیں کی تھی - یوں بھی کسی بنک کا سہارا لیے بغیر تجارت کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا - پنجاب کے مسلمانوں کا کوئی بنک نہیں تھا - ہندوؤں کے بنکوں کی حالت یہ تھی کہ کسی کاروباری مسلمان کو قریب نہیں آنے دیتے تھے - مولانا کچھ عرصہ بمبئی اور احمد آباد میں کام کرتے رہے - پھر بیمار ہو کر واپس لاہور آ گئے - یہاں بعض اخبارات و رسائل میں کام کیا - کچھ دنوں روزنامہ مسلم آؤٹ لک سے بھی منسلک رہے سردار دیوان سنگھ مفتون، جنھوں نے بعد کو ایڈیٹر ریاست کی حیثیت سے بڑی شہرت حاصل کی تھی - اُن دنوں لاہور سے اپنا اخبار پنتھ نکالتے تھے - مولانا اور سردار مفتون کی دوستی اُسی زمانے میں اُستوار ہوئی تھی - مولانا کو پتھری کی شکایت بھی تھی - جس کی وجہ سے بار بار کام میں تعطل پیدا ہو جاتا تھا - تشخیص سے پتا چلا کہ سنگِ گردہ ہے - امرتسر کے مشہور سرجن ڈاکٹر میر ہدایت اللہ مرحوم نے بڑا کامیاب آپریشن کر کے پتھری نکال دی - لیکن کبھی کبھار درد کا حملہ پھر بھی ہو جاتا تھا -

۱۹۳۰ء میں مولانا نے یکے بعد دیگرے، ایڈورٹائزنگ اکسپرٹ اور

پبلسٹی لمیٹڈ کے نام سے اشتہارات کی دو فرمیں قائم کیں۔ یہاں بھی ننانوے فی صد مشتہرین ہندو تھے۔ اور تجارتی میدان کلیتہً انہی کے قبضے میں تھا۔ مقابلہ ایسا سخت تھا کہ مولانا گویا بتیس دانتوں میں ایک زبان بن کر رہ گئے تھے۔ لیکن مولانا کی کاروباری دیانت۔ معاملہ فہمی۔ عقل مندی۔ صلح جوئی۔ تحمل مزاجی اور دفتری باقاعدگی کی وجہ سے اُن لوگوں کو بھی مولانا پر اعتبار کرنا پڑا جو عام حالات میں کبھی کسی مسلمان کے ساتھ لین دین پر تیار نہ ہو سکتے تھے۔ لاہور کی ماڈل ٹاؤن سوسائٹی کے بانی دیوان کھیم چند ہمارے دوست تھے۔ وہ کہا کرتے تھے کہ مسلمانوں میں صرف ایک صلاح الدین احمد دیکھا ہے جس نے اپنے حسنِ اخلاق سے ہندوؤں کو بھی اُس کے ساتھ کاروباری تعلقات قائم کرنے پر مجبور کر دیا ہے۔

۱۹۳۳ء میں مولانا نے ادبی دنیا، مولانا تاجور نجیب آبادی سے خرید لیا۔ مولانا تاجور رسالے نکالنے اور انجمنیں قائم کرنے کے بہت شوقین تھے۔ لیکن چونکہ مستقل مزاجی اور یکسوئی کی نعمت سے بڑی حد تک محروم تھے۔ اس لیے اُن کے کام اُن کے ارادوں کی بلندی کا ساتھ نہ دے سکتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ادبی دنیا نکالا تو انھوں نے بہت ٹھاٹھ سے تھا لیکن چار ہی سال میں بالکل ٹھپ ہو کر رہ گیا۔

مولانا کو ادبی دنیا خریدنے کا خیال یوں ہوا تھا کہ اُن کے نہایت عزیز دوست منصور احمد ایک طویل بیماری کے بعد انہی دنوں تندرست ہوئے تھے۔ اور مولانا چاہتے تھے کہ اُن کے ذوق کی رعایت سے ایک ادبی رسالہ ضرور ہونا چاہیئے جسے وہ ایڈٹ کریں۔ چنانچہ ادبی دنیا منصور احمد ہی کے پاسِ خاطر سے خریدا

گیا تھا۔

منصور مرحوم بڑے بے نظیر اور پیارے دوست تھے۔ شعر و ادب کا ایسا پاکیزہ اور شستہ مذاق رکھتے تھے کہ اُس کی مثال آج مشکل ہی سے ملے گی۔ اخلاق کے اعتبار سے بھی اُن کا پایہ بہت بلند تھا۔ میں اُنھیں انسان نہیں فرشتہ کہا کرتا تھا۔ کم سخن تھے، لیکن دوستوں پر جان چھڑکتے تھے! افسوس کہ منصور احمد نے عین عالمِ شباب میں انتقال کر کے اپنے احباب کو ایسا جانکاہ صدمہ پہنچایا کہ آج بھی اُن کی یاد آتی ہے تو زخم سے ٹیسیں اُٹھنے لگتی ہیں۔

جب مئی ۱۹۳۷ء میں منصور احمد کا انتقال ہُوا تو مولانا نے مجھ سے اور حفیظ ہوشیارپوری صاحب سے کہا کہ آپ دونوں اس رسالے کی ایڈیٹری کا بار اُٹھا لیجئے۔ حفیظ صاحب انجمنِ اُردو کے سیکرٹری تھے اور میں پنجاب صوبہ مسلم لیگ کا جائنٹ سیکرٹری تھا۔ جہاں میرا تمام وقت سیاسی سرگرمیوں میں صرف ہوتا تھا۔

میں نے معذرت کی کہ اوّل تو مجھے سیاسی مصروفیتوں کی وجہ سے فرصت بالکل نہیں ملتی۔ دوم مجھے اندیشہ ہے کہ کہیں میرے سیاسی مشاغل کی وجہ سے رسالے کو نقصان نہ پہنچے۔ لیکن مولانا کو خاکسار سے جو حُسنِ ظن تھا۔ اُس نے اِس قسم کی رکاوٹوں کو حائل نہ ہونے دیا۔ چنانچہ حفیظ صاحب اور راقم التحریر کے نام ادبی دنیا کے سرورق پر باقاعدہ جون ۱۹۳۷ء سے شائع ہونا شروع ہوئے تاہم مجھے ندامت سے اس بات کا اعتراف کرنا ہے کہ میں نے ایک روز بھی دفتر میں بیٹھ کر کسی مضمون کے مسودے کی اصلاح نہیں کی۔ کبھی کاپیاں نہیں پڑھیں کبھی

پروف نہیں دیکھے۔ کبھی مضمون نگاروں سے مراسلت نہیں کی۔ یہ سارا کام خود مولانا کرتے تھے۔ البتہ شام کو میں بلاناغہ دفتر ادبی دنیا کا پھیرا ضرور کرتا تھا۔

ڈیڑھ سال اسی طرح گذر گیا۔ بالآخر تنگ آکر میں نے عرض کیا کہ خدا کے واسطے آپ خود اپنا نام رسالے کے سرِ ورق پر شائع کیجئے۔ یہ ہمارا بہروپ اب ختم ہونا چاہیئے۔ چنانچہ جنوری ۱۹۳۹ء سے، ہماری پیہم منت سماجت کے بعد مولانا نے باضابطہ ادبی دنیا کی ایڈیٹری سنبھال لی۔ البتہ میراجی کو بطور جائنٹ ایڈیٹر کے اپنے ساتھ شامل کر لیا۔ میراجی اُن دنوں بے کار تھے۔ اور اُن کے والد بابو مہتاب دین سے مولانا کے پرانے مراسم بھی تھے۔ میراجی بڑے دلچسپ انسان تھے۔ مطالعہ بے حد وسیع تھا۔ نثر اور نظم دونوں پر قادر تھے۔ لیکن ظاہری وضع قطع ایسی بنا رکھی تھی کہ خواہ مخواہ راہ چلتے لوگوں کی توجہ کو اپنی جانب کھینچ لیتے تھے۔ نام ثنا اللہ تھا۔ لیکن عوام و خواص میں میراجی ہی کے نام سے مشہور ہوئے ؎

ہوئی مدت کہ حسرت مر گیا پر یاد آتا ہے
وہ وضعِ پارسا اُس کی، وہ عشقِ پاکباز اُس کا

مولانا کا طرزِ تحریر اتنا مرصع و مطلا اور مجلی و منور تھا کہ سید علی عباس جلالپوری فرماتے تھے کہ میں ہمیشہ اُن کی نگارشات دو دفعہ پڑھتا ہوں پہلی بار اُن کے اسلوبِ بیان سے لطف اندوز ہوتا ہوں۔ اور مطالب سے قطعِ نظر کر لیتا ہوں دوسری دفعہ مطالب پر بھی غور کرتا ہوں۔

بات یہ ہے کہ مولانا ہنوز ایف۔ اے کے طالب علم تھے جب انھوں

نے منصور احمد کے ساتھ مل کر ایک ادبی رسالہ خیالستان جاری کیا تھا جو خاصا کامیاب ہوا تھا۔ اور علامہ اقبال نے بھی تعریف کی تھی۔ اُس کے بعد تحریکِ خلافت کے سیاسی ہنگاموں۔ ترکِ تعلیم کی صعوبتوں۔ عائلی زندگی کی گراں باریوں اور حصولِ معاش کی مشکلوں نے انھیں اتنی مہلت ہی نہ دی کہ اپنے اس دیرینہ شوق کی تکمیل کی طرف توجہ کر سکیں۔

اب جو ادبی دنیا کی ایڈیٹری کا بار شانوں پہ آپڑا تو اُن کے خامۂ جواہر چکاں کے وہ جوہر کھل کر چمکنے لگے جو مدت سے حالاتِ نامساعد کی وجہ سے مختلف پردوں میں مستور تھے۔ مولانا یوں تو محبت و شفقت اور لطف و مروت کے پیکر تھے لیکن جہاں زبان و بیان اور ادب کا سوال آجاتا وہ کسی قسم کے ذاتی تعلقات کو خاطر میں نہ لاتے۔ بڑے بڑے انشا پردازوں کے رشحاتِ قلم بے تکلفی سے یہ کہہ کر واپس کر دیتے کہ افسوس ہے ادبی دنیا میں شائع ہونے کے قابل نہیں مشہور اور بلند بانگ ناموں سے مرعوب ہونا وہ جانتے ہی نہ تھے۔ اس معاملے میں وہ قطعی بے لحاظ واقع ہوئے تھے۔ اور یہی بے لحاظی تھی جس نے ادبی دنیا کو اُردو زبان کا مستند ترین رسالہ بنا دیا تھا۔

۱۹۳۷ء سے ۱۹۴۷ء تک یہ دس سال کا عرصہ، ادبِ اُردو کے فروغ کا ایک ایسا زرّیں دور تھا جس کی سج دھج اور چمک دمک سے بڑے بڑوں کی آنکھیں چندھیا گئی تھیں۔ لاہور اس ادبی احیا کا مرکز اور مولانا صلاح الدین احمد اس دور کے خالق تھے۔ ادبی دنیا میں اگر کسی شخص کا افسانہ یا ڈرامہ چھپ جاتا تو لوگ چاروں طرف سے اُسے تہنیت و مبارکباد کے تحفے پیش کرتے تھے

کسی مضمون نگار کے نام کے ساتھ اگر مولانا اپنے مخصوص انداز میں چند سطروں کا تعریفی نوٹ لکھ دیتے تو لوگ اُسے ہاتھوں ہاتھ لیتے تھے۔

بایں ہمہ وہ ہر وقت جوہرِ قابل کی تلاش میں رہتے تھے۔ اُنھوں نے ڈھونڈ ڈھونڈ کر وہ ادیب اور انشا پرداز پیدا کیے جن کی اگر بروقت حوصلہ افزائی اور دستگیری نہ کی جاتی تو آج دُنیا اُن کے ناموں سے بھی آشنا نہ ہوتی۔ میں ذاتی طور پر ایک نہیں۔ دو نہیں۔ تین نہیں۔ دسیوں ایسے ادیبوں کو جانتا ہوں جن کے مسوّدوں کی مولانا اِس کاوش سے اصلاح کرتے تھے کہ اصل روشنائی کی بجائے ہر طرف صفحۂ قرطاس پر مولانا کے قلم کی سُرخ روشنائی پھیل جاتی تھی۔ یہی نو آموز قلم کار مولانا کی اُنگلی پکڑ کر زبان و ادب کے میدان میں وارد ہوئے اور دیکھتے ہی دیکھتے مولانا نے اُنھیں افسانہ نگار۔ ڈرامہ نویس۔ نقّاد۔ شاعر اور ادیب بنا دیا۔ آج یہ لوگ غالباً بادۂ پندار سے بدمست ہیں اور مولانا کے احسان کیا اُن کی عظمت کے بھی منکر ہوں گے۔ بہرحال دنیا میں ہمیشہ سے یہی کچھ ہوتا آیا ہے۔ ؏

تم خداوند ہی کہلاؤ خُدا اور سہی

ادبی دُنیا کا دفتر آہستہ آہستہ ایک لٹریری کلب بن گیا تھا۔ جہاں دُور دُور سے لوگ کھنچے چلے آتے تھے۔ مولانا کی وضعداری کا یہ عالم تھا کہ ہر شخص کے ساتھ خندہ پیشانی اور محبت سے پیش آتے کبھی اِشارے کنائے سے بھی ظاہر نہ ہونے دیتے تھے کہ اُن کا قیمتی وقت باتوں میں ضائع ہو رہا ہے اور بہت سا کام کرنا ہے۔ چائے کا دَور تو صبح سے شام تک چلتا رہتا تھا اور ہر ملاقاتی کے لیے

تازہ چائے بن کر آتی تھی۔

بہت کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ پنجاب کی انجمنِ ترقی پسند مصنفین کی بنیاد ادبی دُنیا کے دفتر ہی میں رکھی گئی تھی۔ ترقی پسندوں کے امام، ملک راج آنند جب پہلی مرتبہ لاہور میں وارد ہوئے تو اُن کی پذیرائی کے لیے جو جلسہ ایبٹ روڈ کے ہوٹل میں ہوا تھا۔ اُس کی صدارت بھی مولانا صلاح الدین احمد ہی نے فرمائی تھی۔ لیکن بہت جلد ہمیں پتا چل گیا کہ اِس انجمن میں ترقی پسندی تو بلاشبہ چاروں طرف چھائی ہوئی ہے۔ البتہ ادب کا کہیں سُراغ نہیں ملتا۔ اس کے بعد مولانا اور راقم التحریر علیحدہ ہوگئے۔ اور یہ انجمن بیشتر اُنہی لوگوں کے کام آتی رہی جنھیں ترقی پسندی کا نعرہ نسبتہً زیادہ عزیز تھا۔

برسوں یہ معمول رہا کہ باری مرحوم۔ کرشن چندر۔ مولانا اور راقم التحریر شام کو دفتر ادبی دُنیا سے نکلتے اور خراماں خراماں انارکلی تک جاتے۔ وہاں سے ہمارے راستے مختلف ہو جاتے تھے۔ لیکن مال روڈ سے انارکلی تک کی مسافت کم از کم تین گھنٹے میں طے ہوتی تھی۔ قدم قدم پر رُکتے اور پھر سے باتوں میں منہمک ہو جاتے تھے۔ خدا جانے وہ کیا موضوع تھے اور کیا باتیں تھیں کہ ختم ہونے میں نہ آتی تھیں چاروں طرف راہگیروں کی دھکم پیل جاری تھی۔ موٹروں اور گاڑیوں کا شور برپا تھا۔ اور ہم سڑک کے کنارے کھڑے اپنی رام کہانی میں مصروف۔ باری مرحوم یکایک چونک کر کہتے۔ یارو! ہم ضرور کسی روز موٹر کے نیچے آکر مریں گے۔ اِس پر قہقہہ لگتا اور ہم آگے بڑھ جاتے۔

ایک روز دیکھا کہ سڑک کے کنارے ایک شخص بیٹھا بھٹے بھون رہا تھا۔ باری

نے کہا، یارو بھٹے کھائیں۔ ہم نے ایک ایک پیسے کے تین بھٹے خریدے اور مزے سے کھاتے ہوئے چلے جا رہے تھے کہ عین سامنے سے سر عبدالقادر آ گئے۔ باری نے بھٹا چھپانے کی کوشش کی۔ میں نے کہا جھا نپلزم مت کرو۔ شیخ صاحب نے دیکھ لیا ہے۔

سر عبدالقادر قریب آئے تو مولانا نے اپنا بھٹہ دونوں ہاتھوں پر رکھ کر بڑے ادب سے پیش کیا۔ اور عرض کیا کہ شوق فرمائیے۔ شیخ صاحب زور سے ہنسے اور کہنے لگے۔ بھائی، اب ہمارے دانت کہاں بھٹا کھانے کے۔ بس آپ ہی کھائیے۔

نیلے گنبد کے چوک کے پاس پہنچ کر، ہم نگینہ بیکری میں داخل ہو جاتے اور وہاں جو کچھ ہوتا اس کی داستان سنانے کا حق میرے سوا اور لوگوں کو بھی ہے مثلاً ڈاکٹر سید عبداللہ۔ پروفیسر علم الدین سالک۔ شیخ غلام محی الدین۔ خواجہ عبدالوحید۔ حمید اللہ صدیقی۔ جگن ناتھ آزاد۔ گوپال متل وغیرہ ــــ آہ

یہ قصہ ہے جب کا کہ آتش جواں تھا

برسوں لوہاری دروازے کے باہر میاں محمد حنیف کی دکان پر روزانہ محفل جمتی رہی۔ شام ہوتے ہوتے حنیف صاحب سڑک کے کنارے کرسیاں بچھوا دیتے تھے۔ اور ایک ایک کر کے شرکاء محفل کی آمد شروع ہو جاتی۔ التزاماً روزمرہ آنے والوں میں حمید اللہ صدیقی۔ عبدالرحمٰن۔ کرم الٰہی۔ حسن عباس۔ چودھری عبداللہ۔ باری۔ مولانا صلاح الدین احمد۔ مرزا عبداللہ انور بیگ اور یہ خاکسار شامل تھے۔ اس محفل کے رکن رکین کرم الٰہی تھے۔ جو پوسٹ آفس میں ملازم تھے لیکن کیا انسان اور باغ و بہار آدمی تھے کہ اگر کسی وجہ سے نہ آتے تو مجلس اس طرح

سونی ہو جاتی کہ کسی کا بات کرنے کو جی نہ چاہتا تھا۔

ہمارا تیسرا اڈا عرب ہوٹل تھا۔ لیکن وہاں جو محفلیں برپا ہوتی تھیں اُن کی روح رواں مولانا چراغ حسن حسرت تھے۔ اور ہم لوگ گویا اُنہی کے چاروں طرف گردش کرتے تھے۔ ۱۹۳۹ء کے بعد یہ اڈا اُجاڑ ہو گیا۔ وجہ یہ ہوئی کہ حسرت خانہ نشین ہو گئے۔ اللہ بخش سلیم کوئٹہ چلے گئے۔ میں فلیمنگ روڈ سے ٹمپل روڈ پر اُٹھ آیا۔ باری نے وہ محلہ چھوڑ کر پرانی انارکلی میں مکان لے لیا اور مولانا صلاح الدین احمد نے بھی آنا بند کر دیا۔

دوستوں کے مکانوں پر جا کر دھما چوکڑی مچانے کے ہم خلاف تھے۔ البتہ کبھی کبھی حمید اللہ صدیقی کے بالاخانے پر مختصر سی محفل ضرور جمتی تھی۔ جس میں صاحب خانہ کے علاوہ باری۔ مولانا صلاح الدین احمد اور راقم التحریر شرکت کرتے تھے۔ صدیقی صاحب چونکہ انارکلی میں رہتے تھے۔ اس لیے اُن کے مکان پر دستک دینا نسبتہً آسان تھا۔

مجھے ہر مہینے ایک آدھ بار دہلی یا بمبئی جانا پڑتا تھا۔ جنگ کے زمانے میں سفر بہت مشکل ہو گیا تھا کیونکہ ریل میں جگہ نہیں ملتی تھی۔ ریزرو کروانے پر بھی سیٹ کا ملنا یقینی نہیں ہوتا تھا۔ اِس مشکل کا حل یہ تجویز کیا گیا تھا۔ کہ سر شام ہی سے سٹیشن پر پہنچ کر گاڑی کے کسی ڈبے میں بستر بچھا دیا جائے۔ اس وقت ریل گاڑیاں شیڈ میں کھڑی ہوتی تھیں اور کہیں ڈیڑھ، دو گھنٹے کے بعد پلیٹ فارم پر آتی تھیں۔

مولانا صلاح الدین احمد گھر سے قیمہ اور پراٹھے پکوا کر لاتے تھے۔ اور باری۔

مولانا اور راقم التحریر تینوں پلیٹ فارم کی بنچ پر بیٹھ کر خوب سیر ہو کر کھاتے تھے۔ مولانا کی اہلیہ محترمہ نے دو، ایک بار کہا بھی کہ ماشق صاحب تو سفر پر جاتے ہیں۔ اُن کی اور بات ہے۔ یہ آپ اور باری صاحب کو کیا ہو گیا ہے کہ سٹیشن پر جا کر قیمہ اور پراٹھے کھاتے ہیں۔ لیکن یہ شکایت بھی سُنی اَن سُنی بن کر رہ گئی۔

جولائی کے مہینے میں انبہ خوری کا جشن منایا جاتا تھا۔ یعنی دفتر ادبی دُنیا کی سال بھر کی ردّی بکتی تو اُس رقم سے آم کھائے جاتے تھے۔ اس پروگرام کی تکمیل ادبی دنیا کے جنرل مینجر ایف۔ ایم۔ ساقی کے سپرد تھی۔ جو لوہاری دروازے کی دُکانوں سے چُن چُن کر بنارس کا لنگڑا، بمبئی کا الفانسو اور دینا نگر کا پٹکا خرید کر لاتے تھے۔

لاہور میں کبھی کوئی نمائش لگتی یا کوئی سرکس یا کوئی کارنیول آتا تو ہمارے لیے ٹکٹ خریدنا بھی ساقی صاحب ہی کا فرض تھا۔ مولانا کی تینوں بچیاں صبیحہ۔ سہیلہ اور بانو اُس وقت بہت چھوٹی تھیں اور سکول کے ابتدائی درجوں میں پڑھتی تھیں۔ میں مولانا سے عرض کرتا کہ بچیوں کو بھی یہ رونق دکھا دیں تو کیا حرج ہے۔ چنانچہ ساقی صاحب جا کر تینوں بچیوں کو اپنے ساتھ لوا لاتے۔ اور وہ بجلی سے چلنے والی موٹروں اور جھولوں میں بیٹھ کر بہت خوش ہوتی تھیں۔

مولانا نے اپنے فرزندِ اکبر وجیہہ الدین احمد کی شادی کی تقریب اپنے جدّی مکان میں منائی تھی جو لاہور کے گمٹی بازار میں ایک تنگ سی گلی کوچہ ہنومان کے اندر واقع تھا۔ چاروں طرف ہندوؤں کی آبادی تھی اور بیچ میں صرف یہی ایک مکان مسلمانوں کا تھا۔ دعوتِ ولیمہ پر سر عبدالقادر۔ ڈاکٹر شیخ محمد اقبال۔ قاضی محمد اسلم

وغیرہ بہت سے احباب تشریف لائے تھے اور صحن مہمانوں سے بھرا ہوا تھا
میں سر عبدالقادر کے پاس بیٹھا باتیں کر رہا تھا۔ اور شیخ صاحب بار بار دائیں بائیں
دیکھتے تھے۔ میں نے کسی قدر تعجب سے پوچھا "شیخ صاحب کیا تلاش کر رہے
ہیں آپ؟"

بولے "بھائی، تلاش تو کچھ نہیں کر رہا۔ لیکن اس مکان کو بڑی حیرت سے
دیکھ رہا ہوں۔ کیونکہ پچاس سال کے بعد یہاں آیا ہوں۔ اور در و دیوار کو دیکھ کر
یادوں کا ہجوم بادل کی طرح ذہن میں اُمڈ آیا ہے۔"

میں نے پوچھا "یادیں کون سی؟"

فرمایا "جس زمانے میں میر غلام بھیک نیرنگ لاء کالج میں پڑھتے تھے تو اسی
مکان میں رہتے تھے۔ میر صاحب، مولوی ضیاء الدین احمد کے بڑے دوست تھے
اقبال مرحوم اور میں اکثر اُن سے ملنے یہاں آیا کرتے تھے۔ ہمارے ایک دوست
کدار ناتھ چوپڑہ بھی ہمارے ساتھ تھے۔ مولوی ضیاء الدین احمد اور میر نیرنگ کو کسرت
کا بہت شوق تھا اُس کونے میں ایک اکھاڑہ بھی اُنھوں نے بنا رکھا تھا۔ جہاں
کشتی لڑتے تھے۔ کبھی کبھی اقبال مرحوم کو شوق آتا تو وہ بھی لنگوٹ باندھ کر اکھاڑے
میں اُترتے۔ اور میر صاحب کے ساتھ اُن کا دنگل بڑا لطف دیتا تھا۔"

پھر ایک ٹھنڈی سانس بھر کر کہنے لگے "یہ مکان ایک تاریخی یادگار ہے
جسے محفوظ کر لینا چاہیئے۔"

مارچ ۱۹۴۷ء میں جب فرقہ وارانہ فسادات کی آگ شدت سے بھڑکی
تو یہ مکان بھی نذرِ آتش ہو گیا تھا۔ اس حادثے سے صرف چند گھنٹے قبل مولانا اپنے

سارے کنبے کو لے کر ایک مسلمان دوست کے ہاں پناہ گزیں ہوئے تھے۔ اگر خدانخواستہ
ہیں پڑے رہتے تو زندہ بچنا محال تھا۔ شیخ صاحب کو مکان کے جلنے کا حال معلوم ہوا
بار بار افسوس کرتے تھے۔

میں ۱۱ فروری ۱۹۵۳ء کو لاہور سے رخصت ہوا تو مولانا اسٹیشن پر تشریف
ئے تھے۔ اگرچہ موسم خراب تھا اور گاڑی بھی لیٹ ہو گئی تھی۔ لیکن وہ آخر وقت
پلیٹ فارم پر موجود رہے۔ کسے معلوم تھا کہ یہ ہماری آخری ملاقات ہے
ر پھر کبھی دوبارہ ملنا نصیب نہ ہو گا۔

مولانا خط لکھنے کے معاملے میں بہت کاہل تھے۔ کاموں کا ہجوم رہتا تھا۔
فرصت بھی نہیں ملتی تھی۔ میں مسلسل پان، سات خط لکھتا تو جواب دیتے لیکن
ہمیشہ معذرت کرتے تھے کہ کیا کروں خط لکھنے کا چور ہوں۔ اہلیہ محترمہ کے
انتقال سے اُن کا سکونِ قلب درہم برہم ہو گیا تھا۔ میں نے تعزیت کے مکتوب
ں لکھا کہ موت برحق ہے۔ آج نہیں تو کل آئے گی لیکن خدا کا شکر کیجئے کہ
مرحومہ اپنی زندگی میں تینوں بیٹیوں کی شادیاں کر گئیں ورنہ یہ بوجھ آپ سے
ی نہ اُٹھتا۔ جواب میں فرمایا کہ اِس سانحہ پر سیکڑوں خطوط موصول ہوئے ہیں۔
ن جو ڈھارس آپ کے خط سے بندھی ہے، کسی اور سے نہیں۔ اور آخر میں یہ
ی لکھا کہ خدا آپ کو دوستوں کی غم خواری اور دل جوئی کے لیے سلامت رکھے۔

آج رہ رہ کر یہ خیال میرے ذہن میں اُبھرتا ہے کہ کیا میں اِسی لیے باقی رہ
ا ہوں کہ ایک ایک کر کے دوستوں کے نوحے لکھوں اور اُن کی موت پر آنسو
ہاؤں۔

میرا دل غم کدۂ دلِ عزیزاں تو نہیں
میرا سینہ ہے اِلٰہی یہ چراغاں تو نہیں

مولانا کی صحت بالعموم اچھی رہتی تھی۔ کھانا اِشتہا سے کھاتے تھے۔ میں جب تک لاہور میں رہا۔ ہمارا معمول بن گیا تھا کہ اکثر دوپہر کا کھانا اکٹھے کھاتے تھے۔ پُرانی انارکلی میں ہمارے ایک دوست حکیم صاحب نے ہوٹل کھول رکھا تھا۔ چند سال دوپہر کو وہاں جمع ہوتے رہے۔ پھر اُس کے قریب ہمارے ایک اور دوست آغا صاحب نے بہت اچھا ہوٹل بنا لیا تھا۔ تو ہم وہاں منتقل ہو گئے۔ البتہ جب ۱۹۴۹ء میں ادبی دنیا کا دفتر مال روڈ کی موجودہ عمارت میں آ گیا تو اُس کے سامنے بیڈن روڈ کی بغل میں ایک چھوٹا سا ہوٹل تھا۔ ہم دوپہر کو اُٹھ کر وہاں چلے جاتے تھے۔

میرا ارادہ جنوری ۱۹۶۴ء میں واپس وطن جانے کا تھا، لیکن یکایک کچھ ایسی مجبوریاں حائل ہو گئیں کہ نہ جا سکا۔ مولانا کو معلوم ہوا تو انھوں نے رنج و افسوس سے بھرا ہوا خط لکھا کہ آ جاتے تو اچھا تھا۔ مرنے سے پہلے ایک بار ملاقات ہو جاتی۔ زندگی کا کیا اعتبار ہے۔ آج ہم ہیں کل نہیں ہوں گے۔

بات دراصل یہ تھی کہ مولانا کو ذیابیطس نے پریشان کر دیا تھا اور دل کی تکلیف کے آثار بھی نظر آنے لگے تھے۔ اب اُن کے ہر خط میں چل چلاؤ کا ذکر ہوتا تھا۔ میں اسے بھی اُن کی شوخیِ تحریر کا ایک نمونہ سمجھ کر خاموش رہتا۔ لیکن کیا خبر تھی کہ وقتِ آخر تیزی سے آ رہا ہے اور ۱۴ جون کو وہ ہم سے ہمیشہ کے لیے جدا ہو جائیں گے۔

میں بارہ سال کی غربت کاٹنے کے بعد جنوری ۱۹۶۵ء میں لاہور گیا تو

زمین و آسمان بدلے ہوئے پائے۔ ملک الشعراء طالبِ آملی جب ایران چھوڑ کر لاہور گیا تو بے اختیار پکار اُٹھا تھا ؎

گمانم نیست کاندر ہفت کشور — بود شہرے بہ آب و تابِ لاہور

میاں بکشا و خوش واکش کہ در ہند — فراغت نیست جز در خوابِ لاہور

خدایا زندۂ جاوید دارش — بہ آبِ خضر یعنی آبِ لاہور

افسوس کہ طالبِ آملی کی یہی کیفیت مجھ پر وارد نہ ہو سکی۔ کسی زمانے میں لاہور کی خاکِ پاک ہماری آنکھوں کا سرمہ اور اُس کا پانی آبِ کوثر سے کم نہ تھا۔ لیکن اب کی میں نے جلد محسوس کر لیا کہ جس لاہور کو میں جانتا پہچانتا تھا وہ ختم ہو چکا ہے۔ سوچا کہ وطن میں رہ کر غریب الوطن کی زندگی بسر کرنے سے تو یہی بہتر ہے کہ پردیس ہی میں پڑا رہوں۔ چنانچہ چار مہینے وہاں گذار کر واپس لندن چلا آیا۔ اور اب؟ اب، بقولِ غالب

آئندہ و گذشتہ تمنا و حسرت است

یک کاشکے بود کہ بصد جا نوشتہ ایم

سیّد فضل علی

مولانا تاجور نجیب آبادی اپنی وفات سے دو ہفتے پہلے ایک دن اتفاقیہ نگینہ بیکری میں مل گئے۔ اور دیر تک باتیں کرتے رہے۔ کہنے لگے کہ "فضل علی کی کتاب تخیلات ایف۔ اے کے اردو نصاب میں شامل کر لی گئی ہے۔ تم اس کے لیے ایک اچھا سا مقدمہ لکھ دو۔"

مولانا اور فضل علی پرانے دوست تھے۔ اور میں دونوں کا نیاز مند تھا۔ مولانا کے ارشاد کے جواب میں میں نے عرض کیا کہ "تخیلات کے مضامین میں جن کرداروں کی سیرت نگاری کی گئی ہے وہ فرضی نہیں بلکہ حقیقی ہیں۔ اور میں ان میں سے صرف چند ایک کو جانتا ہوں۔ اس لیے جب تک آپ ان شخصیتوں کے متعلق مجھ کو تفصیلی معلومات بہم نہ پہنچائیں میرا حاصل مقدمہ لکھا نہیں جا سکتا۔"

مولانا نے میری رائے سے اتفاق فرمایا۔ اور وعدہ کیا کہ بہت جلد فضل علی

کے ذاتی حالات اور تخیلات کے کرداروں کے متعلق ضروری مواد میرے پاس بھیج دیں گے۔ لیکن افسوس کہ اِس ملاقات کے چند ہی روز بعد مولانا کا دفعتہً اِنتقال ہو گیا۔ اور مقدمہ نگاری کا ارادہ عملی صورت اختیار نہ کر سکا۔

ابھی پچھلے دنوں میں نے بازار سے تخیلات کا ایک نسخہ خریدا جسے دیکھ کر سخت صدمہ ہوا۔ پبلشر نے زر اندوزی کی ہوس میں کتاب کا ستیاناس کر دیا ہے، کتابت بے حد خراب ہے۔ اور ہر صفحے پر اغلاط کی اس قدر بھرمار ہے کہ جگہ جگہ عبارت بے معنی اور نفسِ مضمون غائب ہو کر رہ گیا ہے۔ کاش یونیورسٹی کے اربابِ اقتدار نصاب مرتب کرنے کے بعد اس طرف بھی توجہ فرمایا کریں کہ درسی کتابوں کی طباعت و کتابت ہر اعتبار سے درست ہونی چاہیئے ورنہ معلّم، متعلّم اور مصنّف تینوں پر ظلم ہو گا۔ بالخصوص افضل علی ایسے مصنّف جن کی متاعِ ادب میں سب سے گراں مایہ چیز اُن کا اسلوبِ بیان ہے کتابت کی اغلاط کے تو قطعاً متحمل نہیں ہو سکتے۔

افضل علی سیالکوٹ کے رہنے والے تھے۔ لیکن اُن کا آبائی وطن مُراد آباد تھا۔ جب ۱۸۴۹ء میں پنجاب میں انگریزی حکومت قائم ہوئی تو مختلف سرکاری محکموں میں بالعموم اور محکمہ بندوبست میں بالخصوص یُو۔ پی کے اکثر افراد ملازم ہو کر پنجاب آ گئے۔ افضل علی کے دادا سیّد قائم علی اور نانا دونوں بہ سلسلۂ ملازمت مراد آباد سے نقلِ مکانی کر کے یہاں آ گئے اور سیالکوٹ میں رہنے لگے۔ سیّد قائم علی لاہور کے کوتوال ہو گئے تھے۔ اور افضل علی کے نانا بندوبست کے محکمے میں ملازم تھے۔ افضل علی کے والد ڈسٹرکٹ جج کی کچہری میں ریڈر تھے

میٹرک تک افضل علی کی تعلیم سیالکوٹ میں ہوئی۔ چودھری ظفر اللہ خاں (پاکستان کے وزیر خارجہ) اور سید انعام اللہ شاہ سکول میں افضل علی کے ہم سبق اور یار غار تھے۔ میٹرک کے بعد افضل علی لاہور کے فارمن کرسچین کالج اور چودھری ظفر اللہ خاں گورنمنٹ کالج میں داخل ہو گئے۔ تاہم دوستی کا رشتہ روز بروز قوی ہوتا گیا۔ چودھری صاحب نے ایک مرتبہ ذکر کیا تھا کہ ان دنوں ان کے حلقۂ احباب میں چھ آدمی شریک تھے۔ وہ خود، انعام اللہ اور افضل علی۔ باقی تین نام راقم التحریر کو اس وقت یاد نہیں۔

افضل علی کی صحت بچپن سے خراب تھی۔ ایف اے کا امتحان دینے سے پہلے وہ بہت بیمار ہو گئے۔ اور مجبوراً پڑھائی چھوڑنی پڑی۔ دو سال کے بعد پھر کالج میں داخل ہوئے۔ لیکن بی اے میں دوبارہ بیماری کا حملہ ہوا۔ اور پھر کالج کو خدا حافظ کہنا پڑا۔ اس دوران میں ان کے دوست چودھری ظفر اللہ خاں بی اے کر کے انگلستان چلے گئے۔ اور جب وہ ۱۹۱۴ء میں بیرسٹر بن کر آئے تو افضل علی ابھی ایم اے میں پڑھتے تھے۔

افضل علی ایم اے کے طالب علم تھے۔ جب انھوں نے مضمون نگاری شروع کی۔ مولانا تاجور ان دنوں رسالہ مخزن کے ایڈیٹر تھے اور افضل علی کے خاندان سے ان کے دیرینہ مراسم تھے۔ افضل علی کی نسبت اپنے ماموں سید نذر الباقر کی بیٹی سے قرار پا چکی تھی۔ سید نذر الباقر کی بڑی صاحبزادی سجاد حیدر یلدرم مصنف خیالستان کی اہلیہ تھیں۔ اس طرح یلدرم اور افضل علی آپس میں ہم زلف تھے۔

افضل علی نے قیس متعلم ایم اے کلاس کے فرضی نام سے مضمون لکھنے شروع کیے۔ جب پیامِ قیس۔ بہن بھائی کی خط و کتابت۔ جہنم سے ایک خط۔ فریبِ آرزو وغیرہ مضامین شائع ہوئے تو دھوم مچ گئی۔ خیالات کی ندرت۔ طرزِ نگارش کی جدت اور مزاح کی چاشنی نے بڑے بڑے کہنہ مشق انشا پردازوں کو بھی اس ماجرا طراز ہستی کی طرف متوجہ کیا جو قیس کے فرضی نام کے پردے میں یہ گل کھلا رہی تھی۔ مدیرِ مخزن کو بے شمار خطوط موصول ہونا شروع ہوئے کہ یہ قیس کون ہے مولانا تاجور کچھ عرصہ تو خاموش رہے۔ پھر انھوں نے مجبور ہو کر اس فرضی نام کی نقاب اٹھا دی۔ اور دنیا کو معلوم ہوا کہ آسمانِ ادب پر ایک درخشندہ ستارہ طلوع ہوا ہے جس کا نام افضل علی ہے۔

انہی دنوں مولانا تاجور کو مراد آباد جانے کا اتفاق ہوا اور وہ افضل علی کے ماموں سید نذر الباقر سے بھی ملے۔ سید نذر الباقر کے گھر میں علم و ادب کا ہمیشہ چرچا رہا ہے۔ افضل علی کی منسوبہ بھی نہایت شستہ ادبی مذاق رکھتی تھیں۔ انھوں نے مخزن میں اشاعت کے لیے مولانا کو ایک مضمون دیا جو دراصل افضل علی کی ادب طرازیوں کا ایک جامع جواب تھا۔ مضمون کا عنوان غالباً یہ شعر تھا۔

دیکھیں تو کس طرح نہیں ہوتا انھیں اثر
لو آج نامہ لکھتے ہیں خونِ جگر سے ہم

یہ مضمون بھی فرضی نام سے شائع ہوا۔ لیکن افضل علی فوراً سمجھ گئے کہ یہ ادب پارہ کس کے خامۂ عنبر شمامہ کی تراوش ہے۔ وہ مولانا کے سر پر سوار ہو گئے

کہ اصلی مسودہ انھیں دکھایا جائے۔ مولانا نے آئینِ صحافت کی آڑ لے کر مسودہ دکھانے سے انکار کر دیا۔

افضل علی کو قدرت کی طرف سے انشا پردازی کا حیرت انگیز ملکہ عطا ہوا تھا۔ لیکن اُن کی ادبی جولانیاں ایم اے پاس کرنے کے بعد بالکل ختم ہو گئیں۔ انھوں نے جو کچھ لکھا اُس کا نوّے فی صد حصّہ ایم اے کے اِنہی دو برسوں کی یادگار ہے۔ وہ کہا کرتے تھے۔ کہ اُن کے خیالات کی آمد بالعموم اُس وقت ہوتی تھی۔ جب کوئی پرانا دوست ملتا اور گزشتہ دنوں کی یاد تازہ ہو جاتی۔ یا کبھی حسنِ اتفاق سے بعض احباب اکٹھے ہو جاتے اور محفل ہائے دوبریا ہوتی۔ رات کی خاموشی میں نیوٹن ہال کی بالائی منزل کے ایک کمرے میں تخیلات کے بیشتر مضامین افضل علی کے تہمان خانۂ دماغ سے نکل کر صفحۂ قرطاس کی زینت بنے۔

افضل علی نے اپنے مضامین میں جن کرداروں کی سیرت کشی کی ہے۔ وہ سب اُن کے ملنے والے تھے۔ نام فرضی ہیں۔ لیکن شخصیتیں حقیقی ہیں۔ مثلاً مظہر الاسلام کا نام چودھری ظفر اللہ خاں کے لیے رکھا گیا ہے جس ہستی کو بلاغت اللہ اور ظریف ناموں سے پکارا گیا ہے۔ وہ اُن کے بچپن کے دوست سید انعام اللہ شاہ تھے۔ ایڈیم سن کے پس پردہ گورنمنٹ کالج لاہور کے سابق پروفیسر ملک احمد حسین جلوہ گر ہیں۔ پیامِ قیس میں چغتائی کے لقب سے جس شخص کو یاد کیا گیا ہے۔ اُن کا نام محمد حسین تھا اور وہ لاہور شہر کے اندرونی حصّہ میں نواب غلام محبوب سبحانی کی حویلی میں رہا کرتے تھے۔ فرہاد ہندی۔ عزادار حسین شعیب۔ آذری۔

حاجی جوشف - زبیری - شمسہ آذری - سب حقیقی افراد تھے - صرف نام فرضی تھے - مولانا تاجور اور انعام اللہ شاہ اِن سب کو جانتے تھے - لیکن ان دونوں کے اٹھ جانے کے بعد اب صرف چودھری ظفر اللہ خاں ہی ایک ایسے شخص ہیں جو اگر چاہیں تو اِن شخصیتوں کے حقیقی خدوخال ہم کو دکھا سکتے ہیں - ملک احمد حسین اور سید محمد شاہ[1] ایڈووکیٹ پاک پٹن بھی اگر توجہ فرمائیں تو اس ضمن میں بہت کچھ حاصل ہو سکتا ہے -

افضل علی ایم اے کر کے کچھ مدت کے لیے حکومت پنجاب کے پبلسٹی بورڈ میں ملازم ہو گئے تھے - پھر انھیں انکم ٹیکس آفیسر کا عہدہ مل گیا - اُن کی پہلی شادی سید نذر الباقر کی صاحبزادی ثروت آرا سے ہوئی - لیکن وہ جلد فوت ہو گئیں - اُنھوں نے دوسری شادی اپنے بڑے ماموں سید فیض العسکری کی صاحبزادی سے کی - تخیلات کا پہلا ایڈیشن افضل علی نے ذاتی اہتمام سے نہایت دیدہ زیب کتابت و طباعت کے ساتھ ۱۹۲۰ء میں شائع کیا تھا - لیکن یہ پورا ایڈیشن کسی کتب فروش کی دُکان پر بکنے کی بجائے مفت خور دوستوں کی نذر ہو گیا - افضل علی اُس زمانے میں بے کار تھے - اور ابھی انکم ٹیکس کے محکمے میں ملازم نہیں ہوئے تھے - بعد میں ایک مرتبہ اُنھوں نے راقم التحریر سے کہا کہ بے کاری کے دنوں میں چونکہ اور کوئی کام تھا نہیں - اِس لیے بعض دوستوں نے مشورہ دیا کہ اپنے متفرق مضامین جمع کر کے کتاب چھپوا دو - چنانچہ قرض لے کر تخیلات طبع کرائی گئی - اور وہ

---

[1] افسوس کہ سید محمد شاہ صاحب بھی مئی ۱۹۶۷ء میں فوت ہو گئے -

قرض اب تک نہیں اُترا۔"

ظاہر ہے کہ قرض دینے والے چودھری ظفر اللہ خاں ہوں گے۔ پھر واپس کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

میں بچپن میں افضل علی کے نام اور کام سے واقف ہو گیا تھا۔ تخیلات جب میرے مطالعہ سے گزری تو میں سکول میں پڑھتا تھا۔ بعد میں شیخ کرامت علی مرحوم نے، جو افضل علی کے ساتھ کالج میں پڑھتے رہے تھے، وقتاً فوقتاً مجھے اُن کے حالات سنائے۔ میرے دل میں اُن سے ملنے کا شوق تھا۔ لیکن کم و بیش آج سے بیس سال پہلے جن حالات میں اُن سے ملاقات ہوئی وہ بجائے خود بے حد دلچسپ تھے۔

دسمبر کے آخری دن تھے اور بڑے دن کی تعطیل تھی۔ میں اپنے وطن بٹالہ گیا ہوا تھا۔ وہاں میرے ایک دوست جو احمدی عقائد رکھتے تھے ہمارے ہاں مہمان ٹھہرے ہوئے تھے۔ وہ جماعت احمدیہ کے سالانہ جلسے پر قادیان جا رہے تھے۔ اور مجھ سے ملنے کے لیے راستے میں بٹالہ ٹھہر گئے تھے۔ انھوں نے اصرار کیا کہ میں بھی قادیان چلوں۔ اِس خیال سے کہ چلو ذرا جلسے کی رونق اور گہما گہمی دیکھ لیں گے۔ میں ان کے ساتھ قادیان چلا گیا۔

رات گئے جلسہ ختم ہوا۔ اب ہمیں شب باشی کی فکر ہوئی۔ اِتنے میں امام جماعت احمدیہ کے چھوٹے بھائی مرزا شریف احمد صاحب مل گئے۔ اور وہ ہمیں اپنے دولت کدے پر لے گئے۔ ہم نے ان کے گھر میں قدم رکھا تو دیکھا کہ سامنے کھانے کی میز کے گرد چار اصحاب بیٹھے دادِ پُر خوری دے رہے تھے۔

اِن میں چودھری ظفر اللہ خاں۔ سیّد انعام اللہ شاہ اور چودھری بشیر احمد کے علاوہ ایک لمبے قد کے لحیم شحیم شخص تھے۔ جن کو میں نہیں جانتا تھا۔

مرزا شریف احمد ہمیں برابر کے کمرے میں لے گئے۔ اور کہنے لگے کہ تھوڑی دیر انتظار کیجئے ابھی آپ کے لیے کھانا آتا ہے۔ ہم نے اپنا رختِ سفر کھولا اور آرام کرسیوں پر دراز ہو گئے۔ اِتنے میں سیّد انعام اللہ شاہ۔ چودھری بشیر احمد اور وہ لمبے قد کے لحیم شحیم شخص طعام سے فارغ ہو کر ہمارے کمرے میں آ گئے۔ سیّد انعام اللہ شاہ اور چودھری بشیر احمد سے میری واقفیت تھی۔ اِس لیے دونوں سے اِدھر اُدھر کی باتیں ہونے لگیں۔ میں نے انعام اللہ شاہ سے پوچھا "کہیئے شاہ صاحب۔ آج کل سیّد افضل علی کہاں ہیں؟"

اُنھوں نے فوراً جواب دیا "آپ کو نہیں معلوم؟ اُن کا تو انتقال ہو گیا۔"

میں نے چونک کر پوچھا "کب؟"

شاہ صاحب بولے "چھ مہینے ہوئے۔ ہیضے سے فوت ہو گئے وہ تو۔"

اور ساتھ ہی انعام اللہ شاہ کے چہرے پر شرارت آمیز تبسّم کے آثار نمایاں ہونا شروع ہوئے۔ انعام اللہ شاہ اوّل درجے کے ہنسوڑ اور ظریف الطبع واقع ہوئے تھے۔ میں نے اُن کے چہرے کی کیفیت دیکھی تو چپ ہو گیا۔ اِتنے میں وہ لمبے قد کے لحیم شحیم شخص بولے "آپ افضل علی کو کیونکر جانتے ہیں؟"

میں نے عرض کیا "اُن کے ادبی مضامین کے ذریعہ سے۔ اگرچہ اُن سے ملنے کا اتفاق اب تک نہیں ہوا۔"

یہ گفتگو ہو رہی تھی کہ چودھری ظفر اللہ خاں ہمارے کمرے کے دروازے

پر آکر کھڑے ہو گئے۔ اور کہنے لگے "افضل علی! ذرا اِدھر آؤ تو"

چودھری صاحب کے اِن الفاظ کے ساتھ ہی اِن تینوں نے بے تحاشا قہقہہ بلند کیا۔ اور چودھری صاحب کھسیانے سے ہو گئے۔ معلوم ہوا کہ وہ لمبے قد کے لحیم شحیم شخص ہی افضل علی تھے۔

یوں افضل علی سے میری پہلی ملاقات ہوئی اور بعد میں اُن سے نہایت مخلصانہ مراسم قائم ہو گئے۔ افضل علی شیعہ تھے۔ لیکن چودھری ظفر اللہ خاں اور سید انعام اللہ شاہ کی دوستی کی وجہ سے ہر سال اُن کے ساتھ قادیان کے جلسے میں ضرور شریک ہوتے تھے۔ اُس زمانے میں وہ غالباً ایبٹ آباد میں تعینات تھے۔ اِس واقعہ کے بعد اُن سے راقم التحریر کی خط و کتابت بھی شروع ہو گئی تھی۔

۱۹۳۵ء میں وہ اسسٹنٹ انکم ٹیکس کمشنر ہو کر لاہور آ گئے اور گاہے گاہے ملاقات ہونے لگی۔ میں نے بارہا اُنھیں لکھنے لکھانے کی طرف راغب کیا۔ لیکن وہ قلم توڑ چکے تھے۔ کہا کرتے تھے "انکم ٹیکس کے بہی کھاتوں نے دماغ نچوڑ لیا ہے۔ اب انشا پردازی کا شعور کہاں سے لاؤں"

ادیبوں اور شاعروں کی صحبت سے بھی گھبراتے تھے۔ میں نے کئی مرتبہ انھیں لاہور کے ادبی حلقوں میں لے جانے کی کوشش کی۔ لیکن وہ ہر بار کنّی کاٹ جاتے تھے۔ افضل علی کے پھیپھڑے ابتدا سے خراب تھے۔ انکم ٹیکس کے جان لیوا کام نے اُس مرض کو جو کسی حد تک دب چکا تھا پھر جگا دیا اور اُن پر بخار اور کھانسی کے دورے پڑنے لگے۔ آہستہ آہستہ وہ بالکل صاحبِ فراش

ہو گئے۔ بیماری کے دنوں میں اُنھوں نے بستر پر لیٹے لیٹے ایک مختصر سا مضمون مسافر کے عنوان سے لکھ کر مجھ کو دیا۔ جو اسی زمانے میں لاہور کے مشہور رسالہ ادبی دنیا میں چھپ گیا تھا۔ بالآخر مئی ۱۹۳۷ء میں اُن کا انتقال ہو گیا۔ اور یہیں لاہور میں دفن ہوئے۔

اختر شیرانی

آج کہتے ہیں مر گیا اختر
آہ وہ عشق پیشہ شعر طراز

رسالہ "ہمایوں" کے ابتدائی دور کا ذکر ہے جب مولانا تاجور نجیب آبادی اُس کے جائنٹ ایڈیٹر تھے، گرمیوں کی لمبی تعطیل میں لاہور کے کالج بند ہوئے تو مولانا اپنے وطن تشریف لے گئے اور جاتے ہوئے "ہمایوں" کی ترتیب و تدوین کا کام اختر شیرانی کے سپرد کر گئے۔ اُسی زمانے میں اختر کے تین مضامین "ہمایوں" میں شائع ہوئے جن میں ایک افسانہ تھا جس کا عنوان تھا "پیکِ نغمہ" اور دوسرا انجی خاکے تھے۔ ایک ڈپٹی نذیر احمد دہلوی۔ اور دوسرا مولوی سید احمد مؤلف "فرہنگ آصفیہ" کا۔ اِن مضامین کے علاوہ ایک نظم بھی چھپی جس کا عنوان تھا "چاندنی رات میں مغلیہ شاہزادیوں کی چوگان بازی"۔

اختر شیرانی کو غالباً لاہور کے بعض لوگ پہلے بھی جانتے ہوں گے۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ ادبی ذوق رکھنے والا طبقہ اختر کے نام سے اُس وقت آشنا ہوا جب اُن کی یہ نظم اور تین مضامین یکے بعد دیگرے "ہمایوں" میں شائع ہوئے۔

اُنہی دنوں کا واقعہ ہے، میں ایک روز بڑے ڈاک خانہ کے چوک میں کھڑا تھا اور میرے دوست ہادی حسین سابق ایڈیٹر "ہزار داستان" بھی میرے ساتھ تھے کہ ایک تیز و طرار نوجوان ہمارے پاس سے گزرا جو سر سے ننگا تھا لیکن بال بڑے سلیقے سے آراستہ کئے ہوئے تھے۔ جسم پر چھوٹا کوٹ اور کھلی موہری کا پاجامہ پہن رکھا تھا۔ اور چہرہ صحت و شباب کی چمک سے روشن تھا، ہادی حسین نے اُس کی طرف اشارہ کر کے کہا "یہ ہیں اختر شیرانی"۔

اختر کی یہ پہلی جھلک اب تک میرے ذہن میں محفوظ ہے۔ اس کے بعد بھی انہیں سرِ راہ گاہے دیکھنے کا اتفاق ہوا لیکن گفتگو کی نوبت کبھی نہ آئی۔ اُن کا کلام بھی اکثر رسائل میں چھپنے لگا تھا۔ بالخصوص وحید کیلانی مرحوم کے قوس قزح میں اُن کی بیشتر نظمیں شائع ہوتی تھیں۔ خود اختر نے بھی ایک رسالہ "بہارستان" جاری کر رکھا تھا۔ جس کے بعض پرچے میری نظر سے بھی گزرے تھے۔

اختر کو پہلی مرتبہ دیکھنے کے دو تین برس بعد کا ذکر ہے، گرمیوں کی ایک شام کو میں ہوا خوری کے لیے شملہ پہاڑی پر ٹہل رہا تھا کہ خلافِ توقع سامنے سے اختر نمودار ہوئے۔ ہم دونوں ایک دوسرے کی طرف بڑھے اور بے تکلفی سے مصافحہ کیا۔ ہم چونکہ ایک دوسرے کے نام و مقام سے بخوبی واقف تھے اس لیے جب باغ میں ٹہلتے ہوئے اس طرح اچانک ملاقات ہو گئی تو اس بات کی قطعاً

ضرورت نہ تھی کہ کوئی شخص تعارف کی رسم ادا کرتا تو ہم ہاتھ ملاتے۔ اس ملاقات میں چند منٹ باتیں بھی ہوئیں اور پھر ہم جدا ہو گئے۔

۱۹۳۰ء میں اختر نے "خیالستان" جاری کیا تو مجھ کو میرے وطن یعنی بٹالہ کے پتے سے خط لکھ کر مضمون کی فرمائش کی۔ مجھے اس زمانے میں قصے کہانیاں لکھنے کا بہت شوق تھا۔ اور جنوری ۱۹۳۰ء کے "ہمایوں" کے سالگرہ نمبر میں میری ایک کہانی "زندگی" شائع ہوئی تھی۔ جو اختر کو بہت پسند آئی تھی۔ انھوں نے اسی قسم کی کہانی "خیالستان" کے لیے بھی طلب کی۔ میں نے تعمیلِ ارشاد میں ایک افسانہ "روح کی بیداری" بھیجدیا جسے اختر نے ایک بڑے لمبے تعریفی نوٹ کے ساتھ "خیالستان" میں شائع کیا۔ اس کے بعد گویا میرے اور اختر کے باقاعدہ دوستانہ مراسم قائم ہو گئے۔

۱۹۳۱ء سے ۱۹۳۶ء تک میں لاہور کی ریلوے روڈ پر مہر چند سٹریٹ میں مقیم تھا۔ مہر چند سٹریٹ میں داخل ہوں تو بائیں ہاتھ کی قطار میں آخری مکان میرا تھا۔ برانڈرتھ روڈ سے بھی اس طرف آنے کا راستہ تھا۔ اس زمانے میں میرے مکان سے متصل اسلامیہ کالج کا ہیلی ہوسٹل تھا۔ اختر فلیمنگ روڈ پر رہتے تھے جو میرے مکان سے بمشکل دس پندرہ منٹ کا فاصلہ تھا۔ اس لیے ہمیں ایک دوسرے کے ہاں آنے جانے میں ہر وقت آسانی تھی۔ اس پانچ سال کے عرصے کو میری اور اختر کی دوستی کے شباب کا زمانہ کہنا چاہیے۔

اختر اپنے والد حافظ محمود شیرانی کے ساتھ رہتے تھے۔ جو ۱۹۲۰ء سے ۱۹۳۰ء تک اسلامیہ کالج میں فارسی کے لیکچرر تھے۔ اور ۱۹۳۰ء کے بعد اورینٹل کالج

میں تشریف لے گئے تھے۔ حافظ صاحب کا شمار ہندوستان کے فضلائے اجل میں ہوتا تھا۔ اُنھوں نے اپنی ساری عمر علم کی تحصیل و ترویج میں بسر کر دی۔ شبلی کی شعر العجم پر حافظ صاحب نے جو تنقید لکھی تھی اُس کا جواب اعظم گڑھ کے اکابر اپنی متحدہ کوشش سے بھی نہ دے سکے تھے۔ حافظ صاحب کے لہجے میں اگرچہ کہیں کہیں تلخی آگئی تھی لیکن اِس سے قطع نظر کر کے دیکھا جائے تو وہ تنقید آج بھی ایک بھاری پتھر کی طرح اپنی جگہ قائم ہے۔ جسے کوئی شخص ہلا نہیں سکا۔ فارسی ادب پر حافظ صاحب کی نظر حیرت انگیز طور پر وسیع تھی، افسوس کہ اُن کے نتائجِ فکر کو انگریزی میں قلم بند نہ کیا جا سکا۔ ورنہ انگلستان کے مشہور مستشرقین براؤن اور نکلسن بھی اُن کا لوہا ماننے پر مجبور ہو جاتے۔

حافظ صاحب ۱۹۰۵ء سے ۱۹۱۴ء تک مسلسل نو سال انگلستان میں مقیم رہے۔ اُن کے والد نے جو ریاست ٹونک کے بہت بڑے رئیس تھے، اپنے بچے کو بیرسٹری کی تعلیم کے لیے انگلستان بھیجا تھا۔ لیکن تعجب کی بات یہ ہے کہ حافظ محمود شیرانی اُس وقت انگریزی بالکل نہیں جانتے تھے۔ صرف فارسی میں منشی فاضل کے درجے تک تعلیم حاصل کی تھی۔ انگریزی اُنھوں نے انگلستان آکر سیکھی۔

یہاں آئے ہوئے انھیں بمشکل سال بھر ہوا تھا کہ والد کا انتقال ہو گیا اور بھائیوں نے جائداد پر قابض ہو کر روپیہ بھیجنا بند کر دیا۔ حافظ صاحب کو پردیس میں سخت تنگی اور پریشانی کا سامنا کرنا پڑا۔ اُسی زمانے میں علامہ اقبال، سر عبدالقادر، سر عبداللہ المامون سہروردی اور سر سلطان احمد وغیرہ بھی بغرضِ تعلیم لندن میں

مقیم تھے اور حافظ صاحب سے ان سب کے دوستانہ تعلقات قائم ہو چکے تھے۔ علامہ اقبال اور سر عبدالقادر کی کوشش سے حافظ صاحب کو انڈیا آفس لائبریری میں سر ٹامس آرنلڈ کے تحت ایک ملازمت مل گئی جس سے نان و نمک کی سبیل پیدا ہو گئی۔

اس کے علاوہ حافظ صاحب نے محض اپنی ذاتی قابلیت کی بنا پر لندن کی مشہور پبلشنگ فرم لیوزک کے ہاں بھی ملازمت حاصل کر لی۔ لیوزک ایک بین الاقوامی شہرت کا ادارہ ہے جو گزشتہ ستر سال سے انگلستان میں مشرقی علوم کی کتابیں شائع کر رہا ہے۔ فارسی، عربی، سنسکرت اور چینی زبان کی بہترین کتابیں خواہ کسی ملک میں طبع ہوئی ہوں لیوزک کے ہاں مل سکتی ہیں۔ برٹش میوزیم کے عین سامنے لیوزک کا دفتر آج بھی موجود ہے۔

انڈیا آفس لائبریری اور لیوزک نے حافظ محمود شیرانی کو فکرِ معاش سے تو بے نیاز کر دیا لیکن وطن کی یاد اُن کے دل سے محو نہ ہو سکی۔ آخر نو سال کے قیام کے بعد وہ واپس ہندوستان چلے گئے۔ اُن کا ارادہ تھا کہ ٹونک میں کچھ عرصہ ٹھہر کر اور اپنے عزیزوں سے مل کر واپس انگلستان آ جائیں گے لیکن اُنھیں وہاں پہنچے ابھی تھوڑے دن ہوئے تھے کہ پہلی عالمگیر جنگ شروع ہو گئی اور واپس انگلستان جانے کی تمام راہیں بند ہو گئیں۔

جب یہ محاربۂ عظیم ختم ہوا تو حافظ صاحب نے انگلستان جانے کا ارادہ ترک کر دیا۔ اور اس کی بجائے لاہور جا کر اسلامیہ کالج میں نوکری کر لی۔ اس ملازمت کے حصول میں اُن کی زیادہ مدد سر عبدالقادر اور علامہ اقبال نے کی۔ اُن کے پاس

سوائے منشی فاضل کے اور کوئی تعلیمی سند نہ تھی۔ لیکن سر عبدالقادر اور علامہ اقبال اُن کے علمی تجربے سے خوب واقف تھے اس لیے ان حضرات کی سعی و کوشش سے تمام مشکلیں رفع ہو گئیں۔

اب حافظ صاحب کا کنبہ بھی لاہور آ گیا تھا اور اختر کو انھوں نے اورینٹل کالج میں داخل کرا دیا۔ حافظ صاحب کا ارادہ تھا کہ اختر کو منشی فاضل کا امتحان پاس کرنے کے بعد باقاعدہ انگریزی تعلیم دلائیں گے۔ لیکن اُن کی یہ خواہش کبھی پوری نہ ہو سکی۔ اختر کو شعر و سخن کا شوق ٹونک ہی میں پیدا ہو گیا تھا۔ لاہور کی فضا نے اس شوق کو اور تیز کر دیا۔ چنانچہ انھوں نے منشی فاضل کے جھنجھٹ سے فارغ ہو کر باقاعدہ شعر و ادب کو اپنا واحد مشغلہ بنا لیا۔ ابتدا میں مولانا تاجور نجیب آبادی سے اصلاح لی لیکن پھر اُن کا مذاقِ سلیم ہی اُن کی رہنمائی و رہبری کے لیے کافی ثابت ہوا۔

اختر کا نام محمد داؤد خاں تھا لیکن وہ اختر شیرانی کے نام سے ہندوستان بھر میں مشہور ہوئے۔ اور بہت کم لوگوں کو اُن کا اصل نام معلوم تھا۔ شیرانی افغانوں کے ایک قبیلے کا نام ہے اور اختر چونکہ شیرانی الاصل تھے اس لیے انھوں نے اپنے نام کے ساتھ اپنے قبیلے کا نام بھی چسپاں کر لیا۔ تاکہ امتیازی نشان باقی رہے۔

۱۹۲۶ء تک اختر نے شراب نہیں چکھی تھی۔ اسی سال مولانا تاجور نے لاہور کی مشہور فرم عطر چند کپور اینڈ سنز کے سرمائے اور خان بہادر شیخ نور الٰہی کی اعانت سے ایک اُردو مرکز قائم کیا۔ تاکہ اُردو نظم و نثر کے تمام ذخیرے کی چھان پھٹک کر کے اُس میں سے بہترین اور جاندار حصے کو الگ کر لیا جائے۔ اِس کام کے لیے

انھوں نے جگر مراد آبادی، اصغر گونڈوی، فہیم بیگ چغتائی، یاس عظیم آبادی (جو بعد میں یگانہ لکھنوی کہلانے لگے تھے) اور مہر محمد خاں شہاب مالیر کوٹلوی کو لاہور بلایا۔ اختر شیرانی اور فاخر ہریانوی بھی باقاعدہ اُردو مرکز سے منسلک ہو گئے تھے۔

اُنھی دنوں سیماب اکبر آبادی اور ساغر نظامی نے بھی لاہور کو اپنا مسکن بنا لیا تھا۔ چنانچہ اِن دو ورِ نزدیک کے سخنورانِ کامل کی نغمہ سنجیوں سے لاہور کی فضا یوں گونجنے لگی جیسے برات میں یکایک بہت سی شہنائیاں بجنے لگتی ہیں۔ ہر طرف شعر خوانی کی محفلیں منعقد ہونا شروع ہو گئی تھیں۔ ہر شام کہیں نہ کہیں مشاعرہ ضرور ہوتا تھا۔ جہاں طوطیانِ خوش گفتار اپنے نغموں سے سامعین کو وجد میں لاتے تھے۔ سر محمد شفیع اور سر عبدالقادر جیسے بزرگوں کو اِن مشاعروں کی صدارت کرنے سے ہمیشہ خوشی ہوتی تھی۔ علامہ اقبال کے دولت کدے پر بھی گاہے گاہے جگر، اصغر، یاس اور سیماب جمع ہوتے تھے۔ لاہور کی ادبی تاریخ میں یہ مختصر سا دورِ زریں ہمیشہ یادگار رہے گا۔

مولانا تاجور نے اپنی زندگی میں کوئی ٹھوس علمی یا ادبی کام نہیں کیا۔ لیکن اہلِ پنجاب پر اُن کا یہ احسان ہمیشہ تازہ رہے گا کہ اُنھوں نے اس صوبے کے نوجوانوں میں شعر و ادب کا مذاق خوب پیدا کیا۔ اِس مقصد کے لیے اُنھوں نے جو طریقہ اختیار کیا وہ بہت آسان تھا لیکن بہت مؤثر بھی ثابت ہوا۔ یعنی مشاعرے۔ مولانا تاجور بہت بڑے "مشاعرہ باز" تھے۔ اور اُن کے اہتمام سے لاہور میں بڑے ٹھاٹھ کے مشاعرے ہوتے تھے۔ جن سے تعلیم یافتہ نوجوانوں میں شعر سمجھنے اور

شعر کہنے کا شوق پیدا ہوتا تھا۔

جگر مراد آبادی اُس زمانے میں جی کھول کر شراب پیتے تھے۔ اور اُن کی صحبت نے اختر کو بھی اس بلائے بے درماں کا شکار کر دیا۔ چنانچہ آگے چل کر یہ حالت ہوئی کہ اختر اور شراب لازم و ملزوم ہو کر رہ گئے۔ یہاں تک کہ اختر کو شراب سے الگ کر کے دیکھنا ممکن ہی نہ تھا۔

اختر کے شعور نے جب آنکھ کھولی تو دُنیائے سخن میں اقبال کا طوطی بول رہا تھا۔ اور ہندوستان کا ہر چھوٹا بڑا شاعر اقبال کی پیروی کرنا باعثِ فخر ہی نہیں بلکہ موجبِ ثواب سمجھا جاتا تھا۔ اِدھر ترکِ موالات اور خلافت کی تحریکوں نے بھی قومی شاعری کو فروغ دینے میں بڑا حصّہ لیا تھا۔ چنانچہ ۱۹۲۰ء سے ۱۹۴۰ء تک کی اُردو شاعری پر ایک نظر ڈالی جائے تو اس میں نام نہاد "فلسفہ" "قوم پرستی" "انقلاب پسندی" اور "استعمار دشمنی" کی وہ بھرمار نظر آتی ہے کہ یوں معلوم ہوتا ہے گویا ہندوستان کے شاعروں نے قسم کھائی تھی کہ سب کچھ کہیں گے لیکن شعر نہیں کہیں گے۔

انتہا یہ ہے کہ سیماب اکبر آبادی اور احسن مارہروی ایسے کہنہ مشق اُستادوں نے بھی اپنا رنگ ترک کر کے اقبال کی نقل میں گویا بزعمِ خود "فلسفہ" کو شعر کا جامہ پہنانا شروع کر دیا تھا۔ جوش ملیح آبادی فطری طور پر رامش و رنگ اور عیش و طرب کے شاعر ہیں اور اُن کے کلام کا وہی حصّہ باقی رہنے کے قابل ہے جس میں انھوں نے مئے کہنہ و معشوقِ جواں کی شان میں دلآویز قصیدے لکھے ہیں۔ لیکن حیرت ہے کہ جوش بھی قبولِ عام حاصل کرنے کے شوق میں روشِ عام

کا شکار ہو گئے۔ اور انھوں نے انقلاب۔ انقلاب کے ارزاں اور بے معنی نعرے لگانا شروع کر دیئے۔ اس پر مزید ستم یہ ہوا کہ ہمارے ہاں ترقی پسند ادب کی تحریک شروع ہو گئی جس نے رہی سہی شاعری کا جنازہ نکال کر رکھ دیا۔

اس ماحول میں اگر اختر شیرانی بھی اسی رَو میں بہہ جاتے تو کچھ تعجب کی بات نہ تھی۔ میری نگاہ میں اختر کی شاعرانہ عظمت کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ انھوں نے ایسی فضا میں سانس لینے کے باوجود جہاں شعوری ہی نہیں بلکہ غیر شعوری طور سے بھی لوگ اقبال کی پیروی کرنے پر مجبور تھے اس نوع کی شاعری کرنے سے گریز کیا اور اس کی بجائے اپنی فطرت کے حقیقی نقش و نگار سے اردو شاعری کے ایوان کو آراستہ کرنا شروع کیا۔

مجھے ایک دلچسپ واقعہ یاد آگیا ہے جس کا ذکر کئے بغیر آگے چلنے کو جی نہیں چاہتا۔ مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی کے بڑے بھائی مولانا ذوالفقار علی گوہر مذہب میں احمدی عقائد رکھتے تھے۔ اور مستقل طور پر قادیان میں مقیم تھے۔ میرے والدِ مرحوم سے اُن کے دوستانہ مراسم تھے۔ چنانچہ جب کبھی قادیان سے بٹالہ آتے ہمارے ہاں ضرور تشریف لاتے تھے۔

مولانا ذوالفقار علی گوہر شاعری میں داغ کے شاگرد تھے۔ اور ہمیشہ اپنے اُستاد کا ذکر بڑی محبت اور عزت سے کرتے تھے۔ داغ کم و بیش چوبیس سال رام پور میں رہے، گوہر کا وطن بھی رام پور تھا اس لیے انھیں داغ کی بے شمار باتیں یاد تھیں۔ ایک دفعہ داغ کا ذکر کرتے ہوئے کہنے لگے کہ "میں نے ایک روز عرض کیا کہ زمانے کا رنگ بدل گیا ہے۔ نئی تعلیم نے انگریزی خیالات پیدا کر دیئے

ہیں۔ قومی نوحہ خوانی زیادہ مؤثر ہوتی ہے۔ نیچرل شاعری پر لوگ ٹوٹ ٹوٹ کر گرتے ہیں۔ حضرتِ استاد نے فرمایا۔ نیچرل شاعری کیسی ہوتی ہے کچھ سناؤ۔ میں نے مسدسِ حالی کے کچھ بند سنائے۔ سن کر خاموش ہو گئے اور دیر تک خاموش رہے۔ پھر فرمایا "کبھی کبھی سنا دیا کرو لیکن یہ چیز میرے بس کی نہیں ہے۔"

داغ کے اس جواب میں بڑی عبرتیں اور نصیحتیں پوشیدہ ہیں۔ ہمارے ہاں بہت سے اچھا شعر کہنے والے صرف اس لیے تباہ ہو گئے کہ انھوں نے اپنے حقیقی رنگ اور فطری جوہر سے ہٹ کر صرف عارضی واہ واہ حاصل کرنے کے لیے "عوامی" اور "قومی" شاعری کا بہروپ بھرنا شروع کر دیا۔ ترقی پسند ادب کی تحریک نے سب سے بڑا نقصان جو ہمیں پہنچایا وہ یہی تھا کہ بعض نہایت خوش فکر و خوش گو شاعر جنھیں مبدأ فیاض سے شعر کا نکھرا ہوا مذاق عطا ہوا تھا "انقلاب" اور "مزدور" کے چکر میں پڑ کر اپنی شاعرانہ صلاحیتیں ضائع کر بیٹھے۔

داغ خوب جانتے تھے کہ وہ مسدسِ حالی کی قسم کی چیز لکھنے کے اہل نہیں اور یہی بات اُن کی صحیح شاعرانہ بصیرت کے ثبوت میں پیش کی جا سکتی ہے۔ میں اختر شیرانی کی شاعرانہ عظمت کا اس لیے قائل ہوں کہ انھوں نے قبولِ عام کی سند حاصل کرنے کے شوق میں وقت کی راگنی نہیں گائی۔ اور اقبال کا رنگ اختیار نہیں کیا بلکہ اپنی وہبی قوت سے کام لے کر شاعری کے دھارے کا رُخ بالکل دوسری طرف موڑ دیا۔ اختر کی کامیابی کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہو گا کہ ایک عرصۂ دراز تک اُردو کے نوخیز شعرا نے انھی کی پیروی کو اپنا شعار بنا لیا تھا۔

اختر کی شاعری میں ایک لفظ بار بار آتا ہے اور وہ لفظ ہے "سلمیٰ"۔ اس نام

نے اختر کی ذات اور اُن کے کلام کے ساتھ بہت سی حکایتیں، روایتیں اور داستانیں وابستہ کر دی ہیں۔ بہت سے لوگوں نے اِس نام کی آڑ میں اپنا ڈھنڈورا پیٹنا شروع کر دیا ہے۔ اور بعض ستم ظریف تو یہ دعوے کرنے سے بھی نہیں ہچکچاتے کہ اختر جب رات کو سلمیٰ سے ملنے جاتے تھے تو وہ مکان کے باہر پہرہ دیا کرتے تھے۔

اختر سے میری دوستی کم و بیش بیس سال تک چلتی رہی۔ میں نے اِس دوران میں اُن سے ایک مرتبہ بھی سلمیٰ کے متعلق استفسار نہیں کیا۔ کہ یہ اُن کا سراسر ذاتی اور نجی معاملہ ہے جس میں کسی دُوسرے شخص کو دخل دینے کا کوئی حق نہیں۔ ایک روز اختر نے خود ہی یہ قصہ چھیڑ دیا۔ اور کسی قدر تعجب کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ "آپ پہلے شخص ہیں جنھوں نے دوستانہ بے تکلفی کے باوجود سلمیٰ کے بارے میں کبھی کچھ نہیں پوچھا۔"

میں نے عرض کیا "یہ آپ کا ذاتی معاملہ ہے۔ مجھے دخل در معقولات کا کوئی حق نہیں۔ یُوں بھی آپ کی نجی زندگی کے بارے میں جستجو کرنے کی جرأت مجھے کیونکر ہو سکتی ہے۔"

اختر اِس جواب سے بہت خوش ہوئے۔ اور جب دوسرے روز میرے ہاں آئے تو اُن کے ہاتھ میں ایک کاپی تھی کہنے لگے "یہ کاپی میری حیاتِ معاشقہ کی مکمل داستان ہے اسے ضرور ملاحظہ فرمائیے گا۔ اِس میں میرے اور سلمیٰ کے تمام خطوط موجود ہیں۔ اخفائے راز کے لیے میں نے اپنا نام کوکب رکھا ہے۔"

وہ کاپی بہت دنوں میری میز کی دراز میں پڑی رہی۔ آخر ایک روز میں نے

اُسے کھول کر پڑھنا شروع کیا۔ پہلے صفحے پر عنوان درج تھا "ایک شاعر کا خواب"
اس کے بعد کوکب اور سلمیٰ کے خطوط درج تھے۔ میں نے بہ مشکل چند صفحے پڑھے تھے
کہ مجھے محسوس ہوا کہ کوکب اور سلمیٰ کے خطوط لکھنے والی ہستی ایک ہی ہے۔ دونوں
طرف بالکل ایک ہی قسم کی مجلّا و مطلّا عبارت درج تھی۔ وہی حسین و جمیل ترکیبیں
وہی پرشکوہ استعارے، وہی دلآویز محاورے اور وہی مرصّع الفاظ بار بار دہرائے
جا رہے تھے۔ میں اختر کے اندازِ تحریر سے اچھی طرح واقف تھا۔ مجھے یہ دیکھ کر
بے حد تعجب ہوا کہ جو خطوط سلمیٰ سے منسوب کئے گئے تھے وہ تمامتر اختر کے اپنے
لکھے ہوئے تھے۔ اختر کو ایک زمانے میں فیضی کے کلام سے بہت ربط رہ چکا تھا۔
چنانچہ سلمیٰ کے خطوط میں جگہ جگہ فیضی کے اشعار درج تھے۔"

میں سمجھ گیا کہ یہ "شاعر کا خواب" سراسر اختر کے اپنے قلم کا مرہونِ منت ہے۔
چنانچہ گھنٹہ بھر کی ورق گردانی کے بعد میں نے وہ کاپی جوں کی توں دراز میں بند
کر دی۔ چند روز بعد اختر ملے اور کاپی کا ذکر چھڑا تو میں نے کہا "حضرت مجھے تو یوں
معلوم ہوتا ہے کہ منصور کے پردے میں خدا بول رہا ہے۔"

اختر ہنس پڑے اور معاملہ وہیں ختم ہو گیا۔ اِس کے بعد میرے اور اختر کے
درمیان سلمیٰ سے متعلق کبھی گفتگو نہیں ہوئی۔ مجھے اس بات سے انکار نہیں کہ اختر کو
عنفوانِ شباب میں ضرور کہیں عشق ہوا ہو گا۔ اور یہ غالباً اسی عشق کی چنگاری تھی
جس نے آگے چل کر اُن کی شاعری کو شعلوں میں تبدیل کر دیا تھا۔ لیکن وہ لوگ
جنھوں نے ہیر رانجھا، لیلیٰ مجنوں اور شیریں فرہاد کی طرح اختر و سلمیٰ کے عشق کی
فرضی تفصیلات مرتب کر ڈالی ہیں اور جو اختر کی شاعری کے خود ساختہ نقاد بن کر

اس بات کا دعویٰ کرتے ہیں کہ فلاں نظم اختر نے اُس وقت لکھی تھی جب سلمیٰ کا پہلا خط اُنھیں ملا تھا۔ فلاں نظم اُس وقت لکھی تھی جب سلمیٰ کے دشمنوں کا مزاج ناساز تھا۔ فلاں غزل اُس وقت لکھی تھی جب اختر کو سلمیٰ نے یہ ڈانٹ پلائی تھی کہ برملا اظہارِ عشق کیوں کرتے ہو اور فلاں نظم اُس وقت لکھی تھی جب اختر کی درِ جاناں پر طلبی ہوئی تھی۔ ایک بہت بڑے اخلاقی جرم کا ارتکاب کرتے ہیں۔

اختر نے جب "خیالستان" میں سلمیٰ کا نام لے لے کر نظمیں لکھنا شروع کیں تو خلیقی دہلوی نے کہ اختر کے دوست بھی تھے خیالستان پر تبصرہ کرتے ہوئے اُن کو ایک بڑا دلچسپ خط لکھا تھا۔ خلیقی ایک خاص اندازِ نگارش کے مالک تھے جو آج سے چالیس پچاس سال قبل اُن کی اور دل۔ احمد اکبر آبادی، نیاز فتحپوری اور دلگیر اکبر آبادی کی کوششوں سے ہمارے ہاں رائج ہوا تھا۔ طرزِ تحریر سے قطعِ نظر کر کے دیکھا جائے تو خلیقی نے اِس خط میں بعض باتیں بڑے پتے کی لکھی تھیں۔ لیکن اختر نے اُنھیں قابلِ اعتنا نہ سمجھا۔ خلیقی نے لکھا تھا:

"کچھ نوادرِ ادب ہیں جن پر جوانیاں حریص ہیں اور بڑھاپے ملول! مگر اے ابنِ عم! یہ اقتضایائے غزل خوانی ہیں یا رعایاتِ جوانی۔ سلمیٰ موضوعِ شعری ہے یا جگر کا تبخالہ؟ یہ ہجومِ ریشم و کمخواب کوئی نظم کا بند ہے یا خروشِ دل؟ کچھ بھی ہو ارتقاءِ ادبی کے لیے خوب ہے مگر میں یہ بھی دیکھ رہا ہوں کہ رابطہ پُرشور اور تعلق پُر از ہجوم بلا ہو گیا ہے۔ یہ مے اب مینا سے چھلکنے لگی ہے۔ اگر آگ نہ دبے تو کم سے کم تو دبائے چلو۔ زندگی کام کی ہو جائے گی۔ جذبات میں علو ہو گا شعر میں

ایک کیف بالیدگی اختیار کرے گا۔ اور پھر تم ایسا کہنے لگو گے جیسا کہ ایسے لوگ کہہ سکتے ہیں۔ اور اگر سبیر میں گم ہو گئے۔ ہائے ہو میں صرف کر ڈالا تو پھر یہ سب کچھ چیخ پکار میں ختم ہو جائے گا ــــ مجھے تراوشِ چشم محبوب ہے۔ اِس قدر بھی کہ پانی کے ساتھ خون شامل ہونے لگے۔ مگر اس کے ساتھ یہ طلبِ دامن و آستیں نہیں بھاتی۔ تعلق پسند ہے، مگر یہ جوابِ تعلق کی جستجو محبوب نہیں؛ طرزِ نگارش کو حسین بنائیے۔ مگر یہ سلمیٰ سے منسوب حکایات و واردات ؟"

اپریل ۱۹۳۲ء کا ذکر ہے ایک روز اختر میرے ہاں تشریف لائے اور کہنے لگے کہ "میرا بچہ بہت بیمار ہے اور بیوی کا اصرار ہے کہ حکیم نیر واسطی اُسے آکر دیکھیں۔ آپ حکیم صاحب کے بہت دوست ہیں۔ چل کر حکیم صاحب کو لائیے۔ میں نے سُنا ہے وہ کسی مریض کو دیکھنے اُس کے مکان پر نہیں جاتے۔"

میں نے پوچھا "آپ کی حکیم صاحب سے شناسائی نہیں ہے کیا ؟"

بولے "میں صرف ایک بار اُن سے ملا ہوں۔ میر نور احمد کی اہلیہ بیمار تھیں اُن کی نبض دکھاتا تھی۔"

میں اور اختر اُس شام حکیم صاحب کے دولت کدے پر چونے منڈی میں حاضر ہوئے۔ اختر اپنے ساتھ "خیالستان" کی مکمل جلد بھی حکیم صاحب کے لیے بطورِ تحفہ لے گئے۔ حکیم صاحب اختر کے مکان پر تشریف لائے۔ بچے کو دیکھا اور نسخہ لکھ دیا اِس کے بعد اختر اور حکیم صاحب کے دوستانہ تعلقات قائم ہو گئے۔ جو روز بروز استوار ہوتے گئے۔ اور انجامِ کار حکیم صاحب نے جس دردمندی و بے نفسی سے

اختر کی خدمت کی، جس خلوصِ بے پایاں سے اختر کے ناز اُٹھائے اور جس ذوق و شوق سے اختر کو اپنی آنکھوں میں جگہ دی اُس کی مثال دوستی کی دنیا میں محال ہے۔

کئی بار ایسا ہوا کہ اختر کو اُن کے والد نے گھر سے نکال دیا۔ تو وہ سیدھے حکیم صاحب کے دولت کدہ پر چلے گئے اور مہینوں وہاں رہے۔ جاڑوں کے موسم میں وہ شراب میں دُھت آدھی رات کو آکر حکیم صاحب کو جگا دیتے تھے۔ حکیم صاحب اُٹھ بیٹھتے اور اُسی وقت اختر کے لیے پلنگ اور بستر تیار کیا جاتا اور جب تک اختر آرام سے سو نہ جاتے تھے حکیم صاحب جاگتے رہتے۔ میں وعدے سے کہتا ہوں کہ اختر کے دوستوں میں سے کوئی شخص اس ایثار، حوصلے اور خندہ پیشانی سے اختر کی ناز برداری کرنے کو تیار نہ تھا۔

۱۹۳۵ء کے اوائل میں ایک روز میں نے اور اختر نے ایک ادبی رسالہ جاری کرنے کی تجویز سوچی۔ اختر گذشتہ آٹھ دس سال میں یکے بعد دیگرے تین رسالے انتخاب، بہارستان اور خیالستان نکال کر بند کر چکے تھے۔ اُن کا خیال تھا کہ لوگ اُن سے بدظن ہو چکے ہیں اور اب کسی نئے رسالہ کی خریداری قبول نہیں کریں گے اس لیے اُن کی خواہش تھی کہ اگر ہم نے نیا رسالہ جاری کیا تو سرورق پر صرف میرا یعنی راقم التحریر کا نام بطور ایڈیٹر کے درج ہونا چاہیئے مجھے اُن کی اس رائے سے اختلاف تھا۔ اس لیے کہ اختر شیرانی کے نام میں ایک ایسا جادو تھا کہ ہزار بدگمانیوں کے باوجود لوگ اس رسالہ پر ٹوٹ ٹوٹ کر گرتے تھے جس کے ایڈیٹر اختر ہوں۔ آخر فیصلہ ہوا کہ سرورق پر ہم دونوں کے نام ہوں گے۔

مارچ ۱۹۳۵ء میں رومان کا پہلا پرچہ نکلا۔ جس میں اختر کی دو مشہور نظمیں

"بہار بیتنے والی ہے آبھی جا سلمیٰ" اور "نشیدِ آغاز" شائع ہوئیں۔ میرا اندازہ بالکل صحیح ثابت ہوا۔ اختر شیرانی کے نام کی وجہ سے رسالہ بے حد مقبول ہوا۔ پہلا پرچہ دو ہفتے کے اندر ختم ہو گیا اور ایجنٹوں کے تقاضے شروع ہو گئے کہ اور پرچہ بھیجئے۔

اُس زمانے میں آغا حشر بھی لاہور میں مقیم تھے۔ اور انھوں نے ریس کورس روڈ پر ایک کرایہ کی کوٹھی لے رکھی تھی۔ میں اور اختر رومان کا پہلا پرچہ آغا حشر کی خدمت میں پیش کرنے اُن کے دولت کدے پر حاضر ہوئے، تو انھوں نے بڑی مسرت سے یہ ادبی تحفہ قبول فرمایا اور دیر تک رومان کے مضامینِ نظم و نثر پر نظر ڈالتے رہے۔ رسالہ کے سرورق پر اختر کا یہ شعر درج تھا۔

ذرّے ذرّے کا دل اک محشرِ نظارہ ہے
ساری دُنیا مرے رومان کا گہوارہ ہے

آغا یہ شعر پڑھ کر چیں بہ جبیں ہوئے اور کہنے لگے "بہت بھدا شعر درج کیا ہے تم نے۔ کس کا شعر ہے یہ؟"

اختر چھپنے والی اسامی تو نہ تھے لیکن آغا کے اس فقرے کے سامنے وہ بھی نہ ٹھہر سکے۔ میں نے عرض کیا "اختر کا شعر ہے"۔

آغا نے اپنے قلم سے وہ شعر کاٹ دیا۔ اور فرمایا "آئندہ یہ شعر درج کرو"۔

کہو زاہد سے کیوں ہے اس قدر فردوس پر نازاں
ہزاروں جنتیں آباد ہیں تخیلِ اختر میں

چنانچہ جب تک رومان جاری رہا آغا حشر کا یہ عطیہ رسالے کے سرورق کی

زینت بنا رہا۔

رومان کو جاری ہوئے بمشکل دو مہینے گذرے تھے کہ ایک روز اختر نے بونہی باتوں باتوں میں کہا کہ "ماہر نے کلکتہ سے ایک نظم بھیجی ہے جس میں انھوں نے علامہ اقبال کے خلاف بہت کچھ لکھا ہے۔"

میں نے بغیر نظم دیکھے ہوئے کہہ دیا کہ "اِس قسم کی چیزیں رومان میں ہرگز شائع نہیں ہوں گی۔"

بات آئی گئی ہو گئی۔ میر نور بخش ماہر سیالکوٹ کے رہنے والے تھے اور کلکتہ میں کاروبار کرتے تھے۔ اچھے خوش حال آدمی تھے۔ شعر بھی اچھے خاصے کہتے تھے۔ اور اختر کے بڑے عزیز دوست تھے۔ میں نے ماہر کو آج تک نہیں دیکھا۔ اُس زمانے میں وہ سخت قسم کے کانگریسی خیال کے آدمی تھے۔

جولائی کا پرچہ شائع ہو کر جب میرے ہاتھ میں پہنچا تو اُسے دیکھتے ہی میرا رنگ فق ہو گیا۔ ماہر کی وہ نظم بڑی آب و تاب سے اس میں موجود تھی جس کا عنوان تھا

"علامہ اقبال کے نام ــــ ایک وطن پرست کا پیغام"

"بالِ جبریل کو دیکھ کر"

جب میں نے پوری نظم پڑھی تو مجھے یقین ہو گیا کہ اب میری اور اختر کی خیر نہیں۔ ہم دونوں میں سے ایک ضرور قتل ہو جائے گا۔ رُبع صدی کی پُرانی بات ہے تاہم اس نظم کا ایک بند یہاں درج کرتا ہوں:

تجھے فلسطین و قرطبہ سے بڑی محبت ہے، جانتا ہوں
مگر ہے گنگا کی سرزمیں سے سلوک تیرا مخاصمانہ

اُسی نے پالا اُسی نے پوسا اُسی نے بخشی تجھے جوانی
تو دل کی آنکھوں سے دیکھ اِن کو یہ کارنامے ہیں مخلصانہ؟
اگر یہ جنّت ہے جنّتی تُو، اگر یہ دوزخ ہے دوزخی تُو
یہ قول ہے قولِ عاشقانہ، یہ راز ہے رازِ محرمانہ
وطن اسیر و غُلام تیرا، کلام ہے بے پیام تیرا
گرہ غلامی کی کون کھولے، تری خموشی ہے مجرمانہ
زبان کھولے کہ چپ رہے تُو، جو کام ہونا ہے ہو رہے گا
وطن پرستوں میں یہ خموشی بنے گی نفرت کا تازیانہ
مثالِ فکرِ فرنگ تُو نے دلوں کو درسِ ہوس دیا ہے
تجھے فقیری سے واسطہ کیا کہ رُوح تیری ہے قیصرانہ
وہ خون آشام تیرا شاہیں کبوتروں کی ہوس ہے جس کو
وہ خون رکھنے کا گرم جس کو ملا ہے کیا خوب اک بہانہ
بلائے قوت ہے تیری حکمت جسے تلاشِ شکار ہر دم
کبھی بہ ضربِ نپولین ہے کبھی بہ ظرفِ سکندرانہ

نظم چھپتے ہی لاہور کے اخباروں میں ایک طوفان اُٹھ کھڑا ہوا اور ہم پر چاروں طرف سے گالیوں کی بارش شروع ہو گئی۔ میں نے اختر سے کہا کہ اب کم از کم دو ہفتے گھر سے باہر نہ نکلنا ورنہ مارے جاؤ گے۔ وہ بدستور ہنستے تھے آخر خدا خدا کر کے یہ طوفان تھما۔ تو ہماری جان میں جان آئی۔

مجھے شرم کے مارے علامہ اقبال کی خدمت میں حاضر ہونے کی جرأت نہیں

ہوتی تھی۔ حسنِ اتفاق سے مولانا اکبر شاہ خاں نجیب آبادی لاہور تشریف لائے۔ وہ میرے شفیق و مہربان اُستاد تھے۔ اور کرم فرما دوست بھی تھے۔ مولانا کا قاعدہ تھا کہ جتنے دن لاہور میں قیام فرماتے روزانہ شام کو دو گھنٹے علامہ مرحوم کے پاس بسر کرتے تھے۔ میں نے مولانا سے اپنی پریشانی کا ذکر کیا تو اُنھیں اس واقعہ سے سخت افسوس ہُوا تاہم انھوں نے ایک شام میری موجودگی میں ڈاکٹر صاحب سے میری بے گناہی کا ذکر کیا تو ڈاکٹر صاحب ہنس پڑے اور مجھے اطمینان ہُوا۔

رومان تقریباً تین سال جاری رہا۔ دفتر اختر کے مکان میں تھا۔ رسالہ کی ترتیب و تدوین کا کام ہم دونوں کر لیتے تھے۔ صرف ایک چپراسی ملازم رکھا ہُوا تھا جو ڈاک خانے، مطبع اور دفتری کی دُکان کے چکر کاٹتا رہتا تھا۔ مجھے آہستہ آہستہ سیاسی مصروفیتوں نے اپنی طرف کھینچنا شروع کر دیا۔ اِدھر اختر کی شراب نوشی میں اضافہ ہونا شروع ہُوا۔ چنانچہ سارا انتظام بگڑ کر رہ گیا۔ پہلے تو پرچہ کی اشاعت میں بے قاعدگی پیدا ہوئی پھر خریدار ٹوٹنے شروع ہوئے اور آخر میں ایجنٹوں نے پیسے بھیجنے بند کر دیئے۔ چنانچہ تین سال کی مختصر سی زندگی کے بعد رومان نے بھی عدم کی راہ لی۔

اِس تین سال کے عرصے میں اختر کی بعض بے نظیر نظمیں رومان میں چھپیں مثلاً "بہار بیتنے والی ہے آ بھی جا سلمیٰ"۔ "اے عشق ہمیں برباد نہ کر"۔ "آج کی رات"۔ "آنسو"۔ "چلی گئیں"۔ "بعض رومانی لمحات کی یاد"۔ "چودھویں سالگرہ کا تحفہ"۔ "شاعر کی تربت"

اختر کی شاعری کا آفتاب نصف النہار پر تھا۔ اگرچہ اے عشق کہیں لے چل۔

تیتری - اودیس سے آنے والے تنا - ایک بار دیکھا ہے دوبارہ دیکھنے کی ہوس ہے۔
وکٹوریہ میموریل میں - بستی کی لڑکیوں میں - اے سرزمینِ گجرات - اِس سے قبل شائع
ہو کر ہندوستان بھر میں ایک تہلکہ مچا چکی تھیں - لیکن اب اختر کی شاعری میں
عیش و طرب کے نغمے کی بجائے آہستہ آہستہ المیہ عنصر بڑھ رہا تھا - جس نے اُن کے
کلام میں ایک میٹھا میٹھا درد پیدا کر دیا تھا -

" اے عشق ہمیں برباد نہ کر " جب رومان میں شائع ہوئی تو ایک دوست نے
کلکتہ سے خط لکھا کہ خدا کے لیے ایسی دردناک نظمیں نہ شائع کیجیے - روتے روتے
ہمارا بُرا حال ہو گیا ہے -

اِس نظم کے سولہ بند ہیں - آیئے ہم اور آپ دو دو ایک بند مل کر پڑھیں :

" آنکھوں کو یہ کیا آزار ہوا، ہر جذبِ نہاں پر رو دینا!
آہنگِ طرب پر جھک جانا آوازِ فغاں پر رو دینا
بربط کی صدا پر رو دینا، مطرب کے بیاں پر رو دینا
احساس کو غم بنیاد نہ کر
اے عشق ہمیں برباد نہ کر

وہ راز ہے یہ غم آہ جسے پا جائے کوئی تو خیر نہیں
آنکھوں سے جب آنسو بہتے ہیں اُکسائے کوئی تو خیر نہیں
ظالم ہے یہ دُنیا دل کو یہاں بہلائے کوئی تو خیر نہیں
ہے ظلم، مگر فریاد نہ کر
اے عشق ہمیں برباد نہ کر

یہ رنگ اُردو شاعری میں موجود نہیں تھا۔ اختر شیرانی نے اس کی ابتدا کی اور انھیں کے ساتھ اِس کا خاتمہ بھی ہو گیا۔ "بہار بیتنے والی ہے آ بھی جا سلمیٰ" کے دو بند ملاحظہ فرمائیے۔

کسے خبر ہے قیامت میں ہم ملیں نہ ملیں
فضائے روضۂ جنّت میں ہم ملیں نہ ملیں
کشاکشِ ابدیت میں ہم ملیں نہ ملیں
کشاکشِ ابدیت بھلا بھی جا سلمیٰ
بہار بیتنے والی ہے آ بھی جا سلمیٰ

غموں پہ کی ہیں فدا شادمانیاں ہم نے
خدا کے نام پہ تج دیں جوانیاں ہم نے
گذار دی ہیں یونہی زندگانیاں ہم نے
دمِ اخیر تو غم سے چھڑا بھی جا سلمیٰ
بہار بیتنے والی ہے آ بھی جا سلمیٰ!

یہ صحیح ہے کہ اختر کے ہاں عشق کا وہ رچا ہوا سوز و گداز نہیں، جس نے میر کے شعر کو نشتر بنا دیا تھا۔ وجہ غالباً وہی ہے جس کی طرف خلیقی دہلوی نے اپنے خط میں اشارہ کیا تھا۔ اختر نے عشق میں وہ ریاض نہیں کیا جو میر نے کیا تھا۔ زندگی کی بھٹی میں پڑ کر اختر کے حواس درد سے کراہتے ضرور رہے تھے لیکن اُن کی رُوح اُس آگ میں جل کر اور پگھل کر خاکستر نہ ہو سکی۔

رومان ہی کے زمانے میں لاہور کے گورنمنٹ کالج میں ایک مشاعرہ ہوا تھا۔

اختر اور میں بھی وہاں مدعو تھے۔ لاہور میں کشمیری پنڈتوں کے چند خاندان آباد تھے مشاعرے میں عین ہمارے سامنے انھیں پنڈتوں کے گھرانے کی ایک نوجوان خاتون بیٹھی تھیں۔ کشمیری پنڈتوں کے حسن کا جواب تو یورپ میں بھی نہیں۔ اختر بیچارے اُس خاتون کو دیکھ کر مسحور سے ہو گئے تھے اور نگاہیں اُس طرف سے ہٹاتے ہی نہ تھے۔ مجھ سے کہنے لگے "طبیعت بے قابو ہو رہی ہے"۔

میں نے عرض کیا "کچھ پروا نہیں، کان شاعر کی طرف رکھیے اور آنکھ پنڈتانی کی طرف"۔

جب مشاعرے کی نشست بہت طویل ہو گئی تو وہ خاتون اُٹھ کر چلی گئیں۔ چند روز بعد اختر ملے تو اُنھوں نے ایک نظم سُنائی۔ جو اُس محفل کی یاد میں لکھی گئی تھی۔ یہ نظم اختر کی بڑی پیاری نظموں میں شمار کئے جانے کے قابل ہے۔

سرشار آنکھ، نیند کی مستی، خمارِ حُسن
لاکھوں شراب خانے لٹا کر چلی گئیں
یوناں کے شوخ و شنگ کماں دار کی طرح
ننھا سا ایک تیر چلا کر چلی گئیں
کعبے کا راستہ مرے دل سے بھلا دیا
بیتُ الصنم کی راہ دکھا کر چلی گئیں
رنگیں لباس کی نظر آشوبیاں نہ پوچھ
محفل پہ اپنا رنگ جما کر چلی گئیں
کب آئیں کب گئیں مجھے اختر خبر نہیں
ہاں اتنا ہوش ہے کہ بس آ کر چلی گئیں

اختر نے اپنی مشہور نظم "اے عشق کہیں لے چل" ۱۹۲۹ء میں لکھی تھی۔ انہی دنوں لاہور کے ایس۔ پی۔ ایس کے ہال میں مولانا تاجور کے اہتمام سے مشاعرہ ہوا جہاں اختر کی فرمائش پر نازش رضوی نے یہ نظم ترنم سے سنائی۔ نازش کی بھی جوانی کا زمانہ تھا اور اُن کی آواز میں بلا کا جادو بھرا ہوا تھا۔ اختر کی نظم اور نازش کا ترنم ان دونوں چیزوں نے محفل کی محفل کو مدہوش کر دیا تھا۔ اس نظم نے اختر کی شہرت کو بجلی کے پر لگا کر ہندوستان بھر میں پھیلا دیا تھا۔ یہ واقعہ ہے کہ اُس زمانے میں لاہور کے تانگے والے بھی اپنے گھوڑے کو سرپٹ دوڑاتے ہوئے ایک ہاتھ کان پر رکھ کر بلند آواز میں الاپتے تھے: "اے عشق کہیں لے چل"۔

۱۹۳۳ء کے آخر میں اختر نے "او دیس سے آنے والے بتا" لکھی، جسے دیکھ کر بڑے بڑے "کافروں" کو بھی اختر کی شاعری پہ ایمان لانا پڑا۔ لاہور کے بعض نوجوانوں کو یہ نظم پوری حفظ تھی۔ میں نے ایک منتخب محفل میں گورنمنٹ کالج کے ایک طالب علم کو جو بعد میں مقابلے کا امتحان پاس کر کے آئی سی۔ ایس ہو گئے تھے یہ نظم زبانی سناتے ہوئے دیکھا تھا۔

اختر اپنے کلام پہ بڑی محنت کرتے تھے۔ صفحۂ قرطاس پر منتقل کرنے سے ہفتوں پہلے وہ اپنے خیالات کا تانا بانا دماغ میں تیار کرتے رہتے تھے۔ الفاظ کے انتخاب اور استعمال کا انھیں حیرت انگیز سلیقہ تھا۔ اُن کی نظمیں "تبتری"، "برکھا رُت" (مسوری جاتے ہوئے) "وادیٔ گنگا میں ایک رات" اور "انتظار" اُن کی قادر الکلامی کا ادنیٰ ثبوت ہیں۔

ابھی دو مہینے ہوئے اٹلی میں بائرن کے مجسّمے کی نقاب کشائی کی رسم ادا کی

گئی تھی تو انگلستان کی فضا پھر سے بائرن کے نام سے گونج اٹھی تھی۔ اور لندن کے اخباروں میں بائرن کی شاعری پر دھڑا دھڑ مقالے چھپنے لگے تھے۔ یہ ہنگامہ دیکھ کر مجھے خیال ہوا کہ اگر اس ملک کے باشندے اردو سے واقف ہوتے تو میں بائرن کے کلام کے پہلو بہ پہلو اختر کی چند نظمیں رکھ کر ان لوگوں سے پوچھتا کہ سینے پر ہاتھ رکھ کر بتاؤ کہ جذبات نگاری اور جوشِ بیان کے اعتبار سے اختر کے سامنے بائرن کا کیا مقام ہے۔

اگر کبھی کسی دیانت کیش مورخ نے ادبِ اردو کی تاریخ لکھتے وقت پنجاب کے موجبات عظمت بیان کئے۔ تو پانچ باتوں کو کبھی نظر انداز نہیں کر سکے گا۔ اول یہ کہ آزاد اور حالی نے کرنل ہالرائڈ کے زیرِ ہدایت لاہور میں جدید شاعری کی بنیاد رکھی۔ دوم یہ کہ اقبال نے قومی شاعری کا وہ صور پھونکا جس نے پورے ہندوستان کے تنِ مردہ میں ایک نئی زندگی پیدا کر دی تھی۔ سوم یہ کہ شیخ عبدالقادر نے لاہور سے "مخزن" جاری کر کے پہلی مرتبہ ہندوستان کے جدید تعلیم یافتہ طبقے میں اردو ادب کا شوق پیدا کیا تھا۔ چہارم یہ کہ مولانا ظفر علی خاں نے اردو میں ایک ایسی ہنگامی شاعری کو رواج دیا تھا جس کے وہ امام بلکہ پیغمبر تھے اور ہندوستان بھر میں کوئی شخص اس فن میں ان کا حریف نہ بن سکا۔ پنجم یہ کہ لاہور سے اختر شیرانی کی رومانی شاعری کا آفتاب طلوع ہوا۔ جس سے پورے ہندوستان کے در و دیوار جگمگا اٹھے تھے۔ اور اس صنف میں کوئی شخص اختر کا ہم پلہ ثابت نہ ہوا۔

۱۹۴۰ء میں حافظ محمود شیرانی کی ملازمت کی میعاد پوری ہو گئی تو وہ اپنے کنبے کو لے کر جس میں اختر کے بیوی بچے بھی شامل تھے ٹونک چلے گئے۔ لیکن اختر

بدستور لاہور میں پڑے رہے۔ فلیمنگ روڈ کا مکان چھوڑ دیا گیا تھا۔ اور اختر اب شاہ ابوالمعالی کے قبرستان کے قریب ایک چھوٹے سے مکان میں منتقل ہو گئے تھے۔ اُس زمانے میں اُنھوں نے شراب ترک کر رکھی تھی۔ اِس لیے ظاہری وضع قطع بہت اچھی ہو گئی تھی۔ روزانہ حجامت بنانے اور غسل کرتے تھے۔ کپڑے بھی نسبتاً صاف ستھرے پہننے لگے تھے۔ گفتگو میں متانت اور سنجیدگی آ گئی تھی۔ میں چند مرتبہ اُس مکان میں اُن سے ملنے گیا تھا۔ کھانا دونوں وقت کسی دوست کے ہاں سے آتا تھا۔

دو ایک مہینے گزرنے پائے تھے کہ اختر نے مولانا تاجور کے رسالہ "شاہکار" کی ایڈیٹری قبول کر لی۔ اس خبر سے اختر کے تمام دوستوں کو افسوس ہوا۔ بالخصوص اُن کے والد کو تو سخت رنج پہنچا۔ مولانا تاجور نے گذشتہ کئی سال سے حافظ محمود شیرانی کے خلاف جنگ و پیکار کا سلسلہ جاری کر رکھا تھا اور تعلقات کی کشیدگی کا یہ عالم تھا کہ حافظ صاحب اور مولانا تاجور کے درمیان سلام و کلام کا سلسلہ بھی بند ہو چکا تھا۔ بہرحال ملازمت کا یہ تعلق یہ مشکل سال بھر نبھ سکا۔ اور پھر اختر بھی ٹونک چلے گئے۔

۱۹۴۸ء میں وہ یکایک لاہور آ گئے اور حکیم صاحب کے ہاں مقیم ہوئے۔ میں ملاقات کو گیا تو دیکھا کہ بہت کچھ بدل چکے تھے۔ اُکھڑی اُکھڑی باتیں کرتے تھے اور گفتگو میں کوئی ربط یا سلیقہ نہیں تھا۔ کہنے لگے میں کسی روز آپ سے ملنے ماڈل ٹاؤن آؤں گا۔ میں نے عرض کیا سر آنکھوں پر آئیے اِس سے بڑی خوشی اور کیا ہو گی۔

چنانچہ وہ ایک دن ماڈل ٹاؤن میرے مکان پر تشریف لے ہی آئے۔ بوتل اُن کی جیب میں تھی۔ کچھ دیر بیٹھے پیتے رہے۔ لیکن مجھے یہ دیکھ کر بے حد تعجب ہوا کہ اب وہ شراب میں افیم بھی ملاتے تھے۔ میں نے پوچھا یہ بدعت کب سے شروع کی ہے۔ کہنے لگے فقط شراب سے نشہ نہیں ہوتا۔ اِس لیے افیم بھی ساتھ ملاتا ہوں۔ پھر کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد یکایک کہنے لگے "اب زندگی سے اُکتا گیا ہوں۔ آپ نے بھی تو زندگی کا اُتار چڑھاؤ خوب دیکھ لیا ہے، چلیے اب آگے چلیں"

میں نے ہنس کر غالب کا یہ شعر پڑھ دیا:

خوں ہو کے جگر آنکھ سے ٹپکا نہیں اے مرگ
رہنے دے مجھے یاں کہ ابھی کام بہت ہے

شعر سن کر آب دیدہ ہو گئے اور پھر زار زار رونے لگے۔

یہ ہماری آخری ملاقات تھی۔ ستمبر کے اوائل میں میں لاہور سے باہر سفر میں تھا کہ اچانک اخبار میں دیکھا کہ اختر شیرانی سخت بیمار ہیں اور اُنھیں بے ہوشی کے عالم میں میو ہسپتال پہنچا دیا گیا ہے۔ میرے دل نے بے اختیار گواہی دی کہ اب اختر زندہ نہیں رہیں گے۔ چنانچہ تیسرے ہی روز اُن کی موت کی خبر پڑھ لی۔

اختر کے مرض الموت میں حکیم صاحب نے جس محبت و شفقت اور خلوص و مودّت سے اختر کا علاج کیا اور جس دردمندی سے راتوں کو جاگ جاگ کر اختر کی تیمارداری کی اُس کی مثال اِس خود غرض و جفا پیشہ دُنیا میں ملنی محال ہے۔ راہِ وفا میں حکیم صاحب جیسا ثابت قدم دوست مشکل ہی سے ملے گا۔ اُنھوں نے

اپنا مکان، اپنا آرام، اپنا روپیہ سب کچھ اختر کی خدمت کے لیے وقف کر دیا تھا
اب بھی وہ سال بہ سال اختر کی یاد میں ایک محفلِ سوز و ساز منعقد کرتے ہیں
جہاں شعر و نغمہ کی روحانی غذا کے علاوہ حاضرین کے کام و دہان کی تواضع بھی
نہایت پُر تکلف کھانے سے کی جاتی ہے۔

دُنیا کے ہر بڑے فن کار کے آرٹ کی طرح اختر کی شاعری کو بھی شہرت و
گمنامی کے مختلف ادوار میں سے گزرنا پڑے گا۔ اِس لیے مجھے یہ سُن کر چنداں
حیرت نہیں ہوئی کہ آج ہمارے ملک کے لوگ اختر کو بھولتے جا رہے ہیں غالب
ذوق اور مومن جیسے اساتذہ بھی شہرت و گمنامی کے اِس مد و جزر سے محفوظ
نہیں رہے۔ یہ دلیل اپنی جگہ درست سہی کہ وہ سماجی پس منظر جس میں اختر کی
رومانی شاعری کو فروغ حاصل ہوا تھا باقی نہیں رہا لیکن میں اس حقیقت سے
انکار نہیں کر سکتا کہ جب تک انسان کے پہلو میں دل موجود ہے اور اس میں محبت
کی عریاں نصیبی اور عشق کی سوختہ سامانی کی ٹیسیں اٹھتی ہیں اختر کی شاعری ہمیشہ
زندہ رہے گی۔ خود اختر کی پیش گوئی موجود ہے۔

جب تک عشق کے ہونٹوں پہ فغاں باقی ہے
میرے نغموں کا زمانے میں نشاں باقی ہے

مدت ہوئی جب میں لاہور میں تھا اور کبھی کبھار فلیمنگ روڈ سے گزرنے کا
اتفاق ہوتا تھا تو آنکھیں بے اختیار اُس بالاخانہ کی طرف اُٹھ جاتی تھیں جہاں
اختر نے اپنی زندگی کے بیس سال گزارے تھے اور جہاں سے رومانی شاعری کا

وہ آفتاب طلوع ہوا تھا جس کی ضیا پاشیوں نے کشمیر سے لے کر مدراس تک پورے برِ عظیم کو منور کر دیا تھا۔ خدا جانے اب اُس مکان میں کون رہتا ہے اور وہ اختر کے نام سے بھی واقف ہے یا نہیں!

سلامٌ علیٰ نجدٍ ومن حلّ بالنّجد

لندن ۔ ۱۹۵۹ء

میر غلام بھیک نیرنگ

۱۶ر اکتوبر ۱۹۵۲ء کو، میر غلام بھیک نیرنگ کا لاہور میں انتقال ہوا۔ وفات کے وقت سنِ شریف چھہتر یا ستتر تھا۔ نیرنگ کا اصلی وطن انبالہ کے مضافات میں ایک چھوٹا سا گاؤں موضع دورانہ تھا۔ لیکن اُن کی عمر کا بیشتر حصّہ شہرِ انبالہ ہی میں بسر ہوا۔ اِس لیے نسبتِ وطن کے اعتبار سے انبالوی مشہور تھے۔

اُنھوں نے ۱۸۹۵ء میں میٹرک کا امتحان، جو اُس وقت انٹرنس کہلاتا تھا، انبالہ کے سکول سے پاس کیا تھا۔ اور پنجاب یونیورسٹی میں اوّل رہے تھے۔ اُس زمانے میں کہ مسلمانوں میں انگریزی تعلیم کا رواج نسبتاً بہت کم تھا، کسی مسلمان لڑکے کا یونیورسٹی بھر میں اوّل رہنا بہت بڑا اعزاز تھا۔ اعلےٰ تعلیم کے لیے نیرنگ نے لاہور کے گورنمنٹ کالج میں داخلہ لیا۔ حُسنِ اتفاق سے اُسی سال علامہ اقبال بھی گورنمنٹ کالج میں تھرڈ ائیر میں آکر داخل ہوئے تھے۔ ایف۔ اے

اُنھوں نے سیالکوٹ کے مرے کالج سے پاس کیا تھا۔ اِس طرح نیرنگ اور اقبال میں تعلیمی مدارج کا دو سال کا فرق تھا۔ نیرنگ کے دیگر ہم عصر طلبہ میں سے جن لوگوں نے آگے چل کر مختلف شعبوں میں نام پیدا کیا سر فضلِ حسین۔ میاں عبدالعزیز فلک پیما۔ بخشی سر ٹیک چند اور مرزا اعجاز حسین اعجاز دہلوی قابلِ ذکر ہیں۔ سر فضلِ حسین، اقبال کے ہم جماعت تھے اور بخشی سر ٹیک چند اور فلک پیما نیرنگ سے پیچھے تھے۔

میر نیرنگ اور اقبال کی دوستی ڈسکہ کے چودھری جلال الدین صاحب کے ذریعے سے ہوئی تھی۔ چودھری صاحب بھی اُسی سال سیالکوٹ سے انٹرنس پاس کر کے لاہور کے گورنمنٹ کالج میں داخل ہوئے تھے۔ اور ہوسٹل کے جس کمرے میں نیرنگ رہتے تھے وہیں اُنھیں بھی رہنے کو جگہ ملی۔ چودھری صاحب شعر و ادب کا نہایت شستہ مذاق رکھتے تھے۔ بی۔اے کرنے کے بعد وہ پوسٹ آفس کے انسپکٹر ہو گئے تھے۔ جہاں ترقی کرتے کرتے سپرنٹنڈنٹ بن گئے لیکن افسوس کہ ملازمت ہی کے دوران میں فوت ہو گئے۔

چودھری جلال الدین جب امرتسر میں پوسٹ آفس کے سپرنٹنڈنٹ تھے تو بٹالہ اُن کے حلقے میں شامل تھا۔ چنانچہ جب کبھی دَورے پر بٹالہ تشریف لاتے تو میرے والدِ مرحوم سے ملنے ہمارے ہاں ضرور آتے تھے۔ میرے بڑے بھائی صاحب سے بھی اُن کے مخلصانہ مراسم تھے۔

چودھری صاحب نے فرسٹ ایئر میں داخل ہوتے ہی نیرنگ سے اقبال کا ذکر کیا اور اُن کی شاعری کی بڑی تعریف کی۔ اقبال نے تھرڈ ایئر کا سال

بورڈنگ ہاؤس میں نہیں گذارا تھا بلکہ شیخ گلاب دین وکیل کے مکان اندرون بھاٹی دروازہ میں مقیم تھے۔ چنانچہ شروع میں چودھری جلال الدین ہی کے توسط سے اقبال اور نیرنگ کے درمیان نمونے کے اشعار کا تبادلہ ہوا۔ اقبال نے نیرنگ کو اپنی ایک غزل بھیجی تھی جس میں یہ دو شعر بھی شامل تھے۔

بہ سرِ زینت جو شمعِ محفلِ جانانہ ہے
نشانہ اُس کی زُلفِ پیچاں کا پرِ پروانہ ہے
پائے ساقی پر گرایا جب گرایا ہے مجھے
چال سے خالی کہاں یہ لغزشِ مستانہ ہے

نیرنگ نے اقبال کو اپنے اشعار کا جو نمونہ بھیجا تھا اُس میں سے صرف یہ شعر نیرنگ کو بعد میں یاد رہ گیا تھا ؎

حرم کو جانا جنابِ زاہد یہ ساری ظاہر پرستیاں ہیں
میں اُس کی رِندی کو مانتا ہوں جو کام لے دَیر سے حرم کا

بی۔ اے کے بعد نیرنگ نے وکالت کا امتحان پاس کیا اور انبالہ میں قانونی پریکٹس شروع کی اور بہت جلد چوٹی کے وکلا میں شمار ہونے لگے۔ چند سال سرکاری وکیل یعنی پبلک پراسیکیوٹر بھی رہے۔ پھر یہ منصب ترک کر کے دوبارہ پریکٹس جاری کر دی۔

شاعری میں نیرنگ کو فصیح الملک مرزا داغ دہلوی سے تلمذ تھا۔ اور اپنے قیامِ لاہور کے زمانے میں وہ بھاٹی دروازے کی اُس مختصر سی بزمِ مشاعرہ میں بھی شریک ہوتے تھے جو بازار حکیماں میں حکیم شہباز الدین کے مکان پر منعقد

ہوتی تھی۔ اور جہاں پرانے اساتذہ میں سے مرزا ارشد گورگانی اور میر ناظر حسین ناظم لکھنوی بھی تشریف لاتے تھے۔

۱۹۰۱ء میں شیخ عبدالقادر مرحوم نے جن رفیقوں اور دوستوں کے مشورے سے اپنا مشہور رسالہ مخزن جاری کیا اُن میں سرِ فہرست نیرنگ کا نام تھا۔ مخزن کے اجرا کے ساتھ ہی نیرنگ کی شاعری ملک کے عام پڑھے لکھے طبقے سے روشناس ہوئی۔ سید سجاد حیدر یلدرم نے بھی اپنی غیر فانی ادبی شہرت مخزن ہی میں مضمون نگاری کر کے حاصل کی تھی۔ ۱۹۰۹ء میں اُن کے افسانوں اور ادبی مضمونوں کا مجموعہ خیالستان کے نام سے شائع ہوا۔ کتاب کا نام خیالستان نیرنگ نے تجویز کیا تھا اور دیباچہ بھی اُنھیں نے لکھا تھا۔ یلدرم یہ مجموعہ شائع کرنے میں کچھ تامل کرتے تھے۔ لیکن نیرنگ کی ادب شناس نگاہوں نے اِن مضامین کی حقیقی قدر و قیمت کا صحیح اندازہ کر لیا تھا۔ چنانچہ اُن کا اصرار کامیاب ہوا اور خیالستان اپنی تمام جلوہ سامانیوں کے ساتھ شائع ہو گئی۔ اہلِ نظر جانتے ہیں کہ یہ کتاب ادبیاتِ اُردو میں ایک سنگِ میل کا درجہ رکھتی ہے۔

شیخ عبدالقادر جب ۱۹۰۴ء میں بیرسٹری کی تعلیم کے لیے انگلستان روانہ ہوئے تو مخزن کی ترتیب و تدوین کا کام میر نیرنگ کے سپرد کر دیا۔ شیخ محمد اکرام مخزن کے اسسٹنٹ ایڈیٹر اور مینیجر تھے۔ لیکن وہ تمام مضامینِ نظم و نثر ڈاک سے میر صاحب کے پاس انبالہ بھیج دیا کرتے تھے۔ اور میر صاحب ہی یہ فیصلہ کرتے تھے کہ کون سا مضمون اور کون سی نظم قابلِ اشاعت ہے۔

۱۹۰۵ء میں جب اقبال مزید تعلیم کے لیے انگلستان تشریف لے گئے

تو نیرنگ اُنھیں خدا حافظ کہنے کے لیے دہلی تک گئے تھے۔ اقبال نے جب وہاں سے رخصت ہوتے وقت، حصولِ برکت کے لیے، حضرت خواجہ نظام الدین اولیا رحمۃ اللہ علیہ کے مزار پر حاضری دی اور اپنی مشہور نظم التجائے مسافر پڑھی تو میر صاحب بھی اُس وقت اُن کے ہمراہ تھے۔ ۱۹۰۸ء میں اقبال انگلستان سے واپس وطن آئے تو میر صاحب کی اُن سے جو پہلی ملاقات ہوئی اُس کی پُر لطف کیفیت خود میر صاحب کی زبانی سُنیئے۔

"یورپ سے اُن کی واپسی کے بعد اُن سے میری پہلی ملاقات لاہور میں ہوئی، محرّم کی تعطیل تھی۔ میں اُنھی سے ملنے کی غرض سے لاہور گیا تھا۔ اُنھوں نے اپنے قیام کے لیے چنگڑ محلہ میں مکان لیا تھا۔ میں دن کے وقت لاہور پہنچا اور سیدھا اُن کے وہاں گیا۔ ملازموں نے میری پذیرائی کی۔ مگر معلوم ہوا کہ اقبال کہیں گھومنے گئے ہیں۔ میں نے کہا کہ خدا کا شکر ہے، اقبال نے بھی گھر سے نکلنا سیکھا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ آئے تو میں نے دیکھا کہ نہایت نستعلیق سُوٹ پہنے ہوئے ہیں۔ میں نے دوسرا شکر ادا کیا کہ اقبال نے لباس پہننا سیکھا (اس سے پیشتر وہ لباس کے بارے میں صرف سادہ ہی نہیں، بلکہ لاپروا تھے) خیر، گلے ملے مزاج پرسی ہوئی اس کے بعد وہ سُوٹ اُتر گیا۔ وہی ہمیشہ کا تہبند باندھ گیا۔ وہی بنیان بدن پر رہ گیا۔ وہی کمبل شانوں پر سوار ہو گیا۔ ہم نفس (حقہ) حاضر ہو گیا۔ میں اور اقبال پہلے کی طرح فرش پر بیٹھ گئے۔

دُنیا بھر کی باتیں چھڑ گئیں اور ہوتی رہیں۔ میرے قیام کے تین دن اِسی ہیئت کذائی سے گذر گئے۔ کہاں اقبال اور کہاں گھر سے نکلنا اور کس کا سوٹ۔ یورپ ہو آئے سو دماغ کو گوناگوں فضائلِ علمی سے آراستہ کر لائے سینے کو طرح طرح کی اُمنگوں اور عزائم سے بھر لائے۔ مگر رندی اور قلندری میں فرق نہ آیا۔ تین دن کی شبانہ روز صحبت کے بعد میں رخصت ہو کر اپنا لے چلا آیا۔"

اُس زمانے میں لاہور کی انجمنِ حمایتِ اسلام کے سالانہ جلسے ایک قومی پلیٹ فارم کی حیثیت رکھتے تھے۔ جہاں سے بڑے بڑے اکابر قوم کو عمل اور بیداری کا درس دیتے تھے۔ بزرگانِ سلف میں سے جن لوگوں نے اِن جلسوں میں شریک ہو کر قوم کی غم خواری کی اُن میں شمس العلما مولوی نذیر احمد دہلوی، شمس العلما خواجہ الطاف حسین حالی اور شمس العلما مولانا شبلی بھی تھے۔ اِن بزرگوں کے بعد نژادِ نو میں سے جن اشخاص نے انجمن کے سالانہ اجتماعوں میں شامل ہو کر اپنی شعلہ نوائیوں سے دلوں کو گرمایا، اُن میں نیرنگ بھی موجود تھے۔

مسلسل کئی سال تک وہ لاہور تشریف لا کر انجمن کے جلسوں میں اپنی نظمیں پڑھتے رہے۔ اِن نظموں میں اُن کی مقبول اور مشہور نظمیں "خوابِ یتیم"، "ایک آنسو سے دو دو باتیں"، "انصاف کی فریاد"، "سودائے خام"، "تلاشِ محبت" اور "جانِ شیریں" شامل ہیں۔ نیرنگ کی غزلوں اور نظموں کا پہلا مجموعہ ۱۹۰۷ء میں شائع ہوا تھا۔ دوسرا مجموعہ چند سال بعد زیورِ طباعت سے آراستہ ہوا۔

ادبی مذاق کے ساتھ ساتھ میر غلام بھیک نیرنگ کا سینہ مذہب و ملت

لے دروسے بھی معمور تھا۔ جب کبھی قوم پر کوئی مصیبت آئی نیرنگ ہمیشہ سینہ سپر
ہو کر آگے آجاتے تھے۔ ۱۹۲۲ء میں ترکِ موالات کی تحریک عروج پر تھی کہ
ایک آریہ سماج کے لیڈروں نے آگرہ، متھرا، بھرت پور وغیرہ اضلاع کے
کانہ راجپوتوں میں شدھی شروع کر دی۔ یہ ملکانے مذہباً مسلمان تھے لیکن
ئی معقول دینی تعلیم نہ پانے کی وجہ سے اُن میں ہندوانہ رسوم جاری تھیں۔
ندو پرچارکوں نے، جن کے سرکردہ سوامی شردھانند تھے، اِن ملکانوں کو
ندو بنانے کی مہم جاری کر دی۔ اور لاکھوں روپے اس کام پر خرچ کر ڈالے
ندوستان کے مسلمانوں میں سخت اضطراب پھیلا اور ردِ عمل کے طور پر جا بجا
بلیغ و تلقینِ اسلام کی کوششیں ہونے لگیں۔

نیرنگ نے سوچا کہ اِس قسم کی انفرادی کوششوں سے آریہ سماج کی منظم
ر مضبوط فتنہ پردازی کا استیصال ممکن نہیں۔ اِس کے لیے وسیع ذرائع اور
خدہ عمل کی ضرورت ہے۔ چنانچہ اُنھوں نے تمام ہندوستان کا دورہ کیا اور
کہ جگہ جا کر حالات اپنی آنکھوں سے دیکھے۔ اِس کے بعد اُنھوں نے چندہ جمع
کے کافی سرمایہ اکٹھا کیا اور انبالہ میں مرکزی انجمنِ دعوت و تبلیغِ اسلام قائم
، جس کے زیرِ اہتمام مبلغوں کی ایک بہت بڑی جماعت تیار کی گئی۔ یہ مبلغ
ندوستان کے اکثر حصوں میں پھیل گئے اور نہایت جاں فشانی اور کوشش
سے فتنۂ ارتداد کا مقابلہ کیا۔ یہ نیرنگ ہی کی ہمت و سعی تھی کہ چند سال میں
شدھی کا نام و نشان مٹ گیا۔

میر صاحب نے سیاسی میدان میں بھی اپنی قوم کی خدمت کرنے میں کبھی کوتاہی

نہیں کی۔ وہ ابتدا ہی سے مسلم لیگ کے ساتھ وابستہ تھے۔ انبالہ میں لیگ کی شاخ انہی کی کوشش سے قائم ہوئی تھی۔ وہ متحدہ ہندوستان کی مرکزی لیجسلیٹو اسمبلی کے ممبر بھی تھے۔ جب قائداعظم نے ۱۹۳۸ء میں مرکزی اسمبلی میں مسلم لیگ پارٹی قائم کی تو نیرنگ اس کے ڈپٹی لیڈر منتخب ہوئے۔ لیڈر خود قائداعظم تھے اس زمانے میں انھوں نے اسمبلی میں ایک مسودۂ قانون پیش کیا تھا جسے عرفِ عام میں شریعت بل کہا جاتا ہے۔ اس بل کا تقاضا تھا کہ مسلمانوں میں وراثت شرعِ اسلام کے اصولوں کے مطابق ہونی چاہیئے۔

پاکستان کی مجلسِ دستور ساز یعنی کانسٹی ٹیونٹ اسمبلی کا قیام عمل میں آیا تو نیرنگ اس کے بھی رکن منتخب ہوئے۔ ملک کی تقسیم کے بعد جب فسادات کی قیامتِ صغریٰ برپا ہوئی تو وہ اپنے متعلقین کے ساتھ ہجرت کر کے پاکستان تشریف لے آئے۔ گذشتہ پانچ سال میں انھوں نے تعمیرِ ملت کے ہر منصوبے میں عملاً حصہ لیا۔ اور ہماری نوزائیدہ مملکت کی ترقی و تنظیم کا کوئی پروگرام ایسا نہیں تھا جس میں وہ نوجوانوں کی سی ہمت و مستعدی سے شریک نہ ہوئے ہوں۔ ع

خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں

مجھے لاہور۔ دہلی اور انبالے میں چند مرتبہ میر صاحب کی خدمت میں حاضر ہونے کا شرف حاصل ہوا تھا۔ بے انتہا محبت و شفقت کا سلوک فرماتے۔ اور کبھی بزرگی کے رعب داب کا اظہار نہیں ہونے دیتے تھے۔ جس زمانے میں رسالہ رومان جاری تھا تو انھوں نے ہمیں اپنا کلام بھی بغرضِ اشاعت ارسال فرمایا۔

تھا۔ چنانچہ اُن کی چند غزلیں رومان میں طبع ہوئی تھیں۔ ایک غزل کے چند اشعار ہدیۃً پیش کئے جاتے ہیں۔

اب ہجومِ غم و کلفت ہے خدا خیر کرے
جان پر نت نئی آفت ہے خدا خیر کرے

جائے ماندن ہمیں حاصل ہے نہ پائے رفتن
کچھ مصیبت سی مصیبت ہے خدا خیر کرے

آ چلا اُس بتِ عیار کی باتوں کا یقیں
سادگی اپنی قیامت ہے خدا خیر کرے

دل گیا، جانے دو، کافر کی ہے ایماں پہ نظر
آنکھ میں اپنی مروّت ہے خدا خیر کرے

ابھی تشخیصِ مرض میں ہے طبیبوں کو کلام
جاں اِدھر در پئے رخصت ہے خدا خیر کرے

رہنماؤں کو نہیں خود بھی پتا رستے کا
راہرو پیکرِ حیرت ہے خدا خیر کرے

ڈاکٹر محمد اشرف

آج ایک دوست نے یہ خبر سنائی کہ ڈاکٹر اشرف کا برلن میں انتقال ہو گیا ہے۔ تو یوں محسوس ہوا گویا یکایک میرا دل چند لمحوں کے لیے رک گیا ہے۔

در روزگارِ عشقِ تو ما ہم فدا شویم
افسوس کز قبیلۂ مجنوں کسے نماند

گذشتہ ربع صدی کے واقعات متحرک تصویروں کی طرح، ایک ایک کر کے میرے دماغ کے پردے پر گھومنے لگے۔ اشرف کی قربانی۔ ایثار۔ جد و جہد۔ بے خوفی قومی لگن بہت بڑی متاع تھی۔ لیکن افسوس یہ جوہر کسی کام نہ آسکے۔ بات یہ ہے کہ اگر ہم دنیا کو اپنے عقائد کے سانچے میں نہ ڈھال سکیں۔ تو پھر زندہ رہنے کے لیے اپنا سانچہ بدلنا پڑتا ہے۔ اشرف یہ نہ کر سکے چنانچہ ان کی زندگی پہاڑ کی پگڈنڈی کی طرح پیچ و خم میں الجھ کر رہ گئی۔

وہ علی گڑھ میں پڑھتے تھے، کہ خلافت اور ترکِ موالات کی تحریکیں شروع ہوئیں اور اُنھوں نے بھی تعلیم ترک کر دی۔ جامعہ ملیہ کی بنیاد، جن گنتی کے چند طلبہ سے رکھی گئی تھی، اُن میں اشرف شامل تھے۔ چار سال اُنھوں نے ہنگامہ خیزیوں میں بسر کئے۔ جامعہ سے سند بھی لی، ستیہ گرہ میں کام بھی کیا اور خلافت کے لیے گھوم پھر کر تقریریں بھی کیں۔

جب سیاست کی چڑھی ہوئی ندی اُتر گئی۔ اور خلافت کے ساتھ ترکِ موالات کی تحریک بھی دم توڑنے لگی۔ تو وہ دوبارہ مسلم یونیورسٹی میں داخل ہو گئے اور ۱۹۲۷ء میں ایم اے کر کے انگلستان چلے گئے۔ پانچ سال انھوں نے لندن میں بسر کئے اور ۱۹۳۲ء میں پی۔ ایچ۔ ڈی کر کے واپس ہندوستان آ گئے۔ جہاں علی گڑھ میں تاریخ کی پروفیسری مل گئی۔

اب اُن کے سامنے علمی کاموں کا ایک وسیع میدان تھا۔ چاہتے تو پوری زندگی اسی میدان کی سیاحت میں بسر کر سکتے تھے۔ تنخواہ معقول تھی، ماحول بھی سازگار تھا، لیکن اشرف کے دل اور دماغ میں ہم آہنگی شروع سے نہ تھی ان کا دماغ علمی کاموں کے لیے وضع کیا گیا تھا۔ لیکن دل سیاست کے شور و شر کی آماجگاہ تھا۔ چار سال تو اُنھوں نے جوں توں کر کے علی گڑھ میں گزارے۔ لیکن ۱۹۳۶ء میں درس و تدریس سے کنارہ کشی کر کے یونیورسٹی سے استعفا دے دیا۔

یہ زمانہ پنڈت نہرو کی بے پناہ چمک دمک کا تھا جس سے بڑے بڑوں کی آنکھیں چُندھیانے لگی تھیں۔ وہ کانگریس کے پلیٹ فارم پر ایک سوشلسٹ

بن کر نمودار ہوئے تھے۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے ہندوستان کے نوجوانوں کی آنکھوں کا تارہ بن گئے تھے۔ اشرف ابھی کمیونزم کے حلقۂ ارادت میں تو شامل نہیں ہوئے تھے، لیکن قوم پرست اور سوشلسٹ بن چکے تھے چنانچہ پنڈت نہرو کی مقناطیسی کشش انھیں کھینچ کر الہ آباد لے گئی اور وہ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے صدر دفتر میں سیاسی اور اقتصادی شعبے کے نگران بن گئے، قوتِ لایموت کے لیے انھیں پچھتر روپے ماہوار ملتے تھے۔

آنند بھون میں وہ جواہر لال کے ساتھ رہتے تھے۔ اور ہر وقت کا قرب حاصل تھا۔ انھیں جواہر لال کے ساتھ صرف سیاسی رفیق ہی کی حیثیت سے کام کرنے کا موقع نہیں ملا بلکہ صبح و شام کی یکجائی نے انھیں جواہر لال کی شخصیت کے دیکھنے اور پرکھنے کا بڑا نادر موقع بھی عطا کیا تھا۔ اپریل ۱۹۳۷ء میں جب کانگریس نے مسلم رابطۂ عوام کی تحریک شروع کی۔ تو اشرف کو اس کا نگران مقرر کیا گیا۔ یہ زمانہ گویا اُن کی لیڈری کا تھا۔ اب اُن کا بیشتر وقت سفر میں گزرنے لگا تھا۔ پشاور سے مدراس تک پورے ملک کا انھوں نے دورہ کیا، جگہ جگہ جلوسوں میں حصہ لیا۔ اور بڑے بڑے جلسوں میں تقریریں کیں۔ وہ ایک فصیح البیان مقرر تھے اور اپنی جادو بیانی سے دس دس، بیس بیس ہزار کے مجمع کو مسحور کر سکتے تھے۔

وہ کئی بار لاہور بھی آئے۔ سر سکندر حیات خاں پنجاب کے وزیر اعظم تھے اشرف نے متعدد جلسوں میں یونینسٹ پارٹی پر تابڑ توڑ حملے کئے تو سر سکندر نے اُن کا پنجاب میں داخلہ ممنوع قرار دے دیا۔ اچاریہ کرپلانی اُن دنوں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے جنرل سیکرٹری تھے۔ وہ ولبھ بھائی پٹیل کے ہم خیال اور

انہی کی پارٹی کے آدمی تھے۔ اشرف کو صرف جواہر لال کی کشش کھینچ کر کانگرس میں لے گئی تھی اور انھیں بجا طور پر یہ توقع تھی کہ ضرورت کے وقت جواہر لال ان کے پشت پناہ بنیں گے۔ کرپلانی نے اشرف کو اپنا ماتحت سمجھ کر دبانا چاہا۔ پٹیل کا رویہ بھی کچھ اس قسم کا تھا گویا خود تو وہ افسرِ اعلیٰ ہیں۔ اور اشرف کانگرس کمیٹی کے ایک تنخواہ دار ملازم۔ اشرف اپنا گھر پھونک کر اور علی گڑھ کی نوکری چھوڑ کر آئے تھے۔ وہ یہ دھونس کیونکر برداشت کرتے نتیجہ یہ ہوا کہ بدمزگی پیدا ہونے لگی۔

اشرف کا رجحان سوشلزم سے بڑھ کر کمیونزم کی طرف جا رہا تھا۔ انھوں نے کھلے بندوں کانگرسی وزارتوں پر نکتہ چینی شروع کی اور برملا کہا کہ کانگرس انقلاب کے راستے سے ہٹ کر سرمایہ داروں کے ہاتھ بک گئی ہے۔ اور کانگرسی لیڈر برطانیہ کے ساتھ سمجھوتہ کرنے والے ہیں۔ پٹیل نے انھیں بلا کر صاف صاف کہا کہ اگر کانگرس کے دفتر میں کام کرنا چاہتے ہو تو ہماری پالیسی پر اعتراض مت کرو۔ اشرف کو اب تک یہ خوش فہمی تھی کہ جواہر لال ان کے حامی اور معاون ہیں۔ لیکن کانگرس کے پورے نظام بلکہ نظم و نسق پر بھی پٹیل کا قبضہ تھا اور جواہر لال بالکل بے بس تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اشرف کی حمایت میں ایک لفظ اپنی زبان سے نہ کہہ سکے۔ اور اشرف کو مجبوراً کانگرس کمیٹی سے مستعفی ہونا پڑا۔

۲۴ دسمبر ۱۹۳۹ء کو انھوں نے دہلی سے مجھ کو خط لکھا:۔

"ڈیر عاشق۔ عجب آدمی ہو۔ بجز میرے دنیا بھر سے ملنے کا قصد رکھتے ہو، بلکہ سفر بھی کرتے رہتے ہو۔ اور لطف یہ ہے کہ رسوائی

بڑی حد تک میری وجہ سے ہے۔ تو پھر آپ دیانت داری سے
اِس سازش کو کم از کم ذاتی ملاقاتوں کا موقع دے کر ہی پورا کیجئے۔
جی ہاں۔ آپ کا خط ملا۔ بلکہ سخت غصہ آیا۔ اِس لیے کہ خط
الہ آباد آیا اور میں تین ہفتے دہلی میں جناب کے راستے میں ڈیرہ
ڈالے پڑا تھا۔ اور خطوں سے معلوم ہُوا۔ کہ جناب دہلی سے ملیبار
جاتے ہوئے گذرے۔ خاصی شاعری ہو گئی۔
اچھا لیجئے سُنیئے، میں خود بدنامی کے موقع ختم کر رہا ہوں
میں پہلی جنوری سے باضابطہ اور سرکاری طور پر اس دفتر سے
علیحدہ ہو رہا ہوں۔ بلکہ خود الہ آباد سے کنارہ کش ہو رہا ہوں
تاکہ آپ کے دشمنوں کو آئندہ سازش کا الزام رکھنے کا موقع نہ
ملے۔ کم از کم اس حیثیت سے الزام عائد نہ ہو کہ کانگرس کا ایک
دفتر ہی اس میں شریک ہے۔"

اِس خط کا پس منظر یہ ہے کہ سر سکندر حیات خاں، جن لوگوں سے خوش نہیں
تھے۔ اُن کے خطوط سنسر کراتے تھے۔ مجھ پر بھی اُن کی نظرِ عنایت تھی، اِس لیے
میری خط و کتابت پر سنسر شپ عائد تھی۔ مجھے یہ کیفیت معلوم تھی لیکن میں نے
کبھی اس کو اہمیت نہیں دی۔ سر سکندر مرحوم یُوں تو بڑی مروّت اور خوبیوں
کے مالک انسان تھے۔ لیکن وزارت اور حکومت کی خاطر سے سب کچھ کرنا پڑتا
ہے۔ اِس سلسلے میں وہ کبھی کبھی اعتدال سے بڑھ جاتے تھے۔ جب مجھ سے بہت
ناراض ہوئے۔ تو اُنھوں نے پنجاب کے محکمۂ تعلقاتِ عامہ کے توسّط سے میرے

اور اشرف کے بعض خطوں میں قطع و برید کر کے اور کہیں کہیں اپنی طرف سے حاشیے چڑھا کر اخباروں میں شائع کرا دیئے اور مجھ پر کھلے لفظوں میں الزام لگایا کہ میں اشرف کے ذریعہ سے کانگرس کے ساتھ سازش کر کے اُن کی وزارت کا تختہ اُلٹنا چاہتا ہوں۔ اشرف نے اپنے اس خط میں۔ مزے مزے لے کر اُنہی واقعات کی طرف اشارہ کیا ہے۔

آل انڈیا کانگرس کمیٹی کے دفتر سے مستعفی ہو کر اشرف کمیونسٹ پارٹی کے باضابطہ ممبر بن گئے۔ جنگ کے زمانے میں اُنھیں دیلالی کیمپ میں نظر بند بھی رہنا پڑا۔ لیکن افسوس وہ کمیونسٹ پارٹی میں بھی زیادہ دیر نہ چل سکے۔ بات وہی دل و دماغ کی باہمی جنگ تھی۔ اشرف کا دل مسلمان تھا۔ اور دماغ کافر۔ اقبال کا یہ مصرع۔ کہ

"قلبِ اُو مومن و ماغش کافر است"

اگر کسی شخص پر صادق آسکتا ہے تو اشرف پر۔ وہ انقلاب پسند تھے اور اشتراکیت پر اُن کا پختہ عقیدہ تھا۔ لیکن ساتھ ہی اُنھیں اسلام اور مسلمانوں سے محبت بھی بہت تھی۔ اُنھوں نے اسلامی ادبیات اور مسلمانوں کے عروج و زوال کی تاریخ کا دقتِ نظر سے مطالعہ کیا تھا۔ کمیونسٹ پارٹی میں جب وہ کھلم کھلا اپنے خیالات کا اظہار کرتے، تو ان کے حریف ناک بھوں چڑھا کر کہتے کہ یہ تو کوئی پرانا "خلافتی" بول رہا ہے۔ اب نہیں کہا جا سکتا کہ اشرف خود کمیونسٹ پارٹی سے الگ ہو گئے یا، ایک روایت کے مطابق، کمیونسٹ پارٹی نے اُنھیں نکال دیا۔

اُن کا جی چاہتا تھا کہ مسلمانوں میں رہ کر کام کریں۔ لیکن مسلم لیگ کا ماحول

اُنھیں پسند نہیں تھا۔ اُس زمانے میں اُنھوں نے کئی بار اِس خواہش کا اظہار کیا کہ اگر لیگ کے اندر کوئی "ریڈیکل گروپ" قائم ہو جائے تو وہ اس میں شریک ہو جائیں گے۔

۹ر جون ۱۹۳۹ء کو ایک خط میں بڑی حسرت سے مجھ کو لکھتے ہیں:-

"جی چاہتا ہے۔ کہ آپ لوگوں کی پالیسی صاف اور مرتب ہو جائے۔ اور آپ جناح صاحب سے اجازت دِلا دیں، تو ہم اور آپ مِل کر مسلمانوں کے بہت سے کاموں میں حصّہ لیں۔ مسلمانوں سے دُور ہو جانے کا غم ہے۔ آپ کی تحریک سے مجھے بڑی ہی مسرّت ہوئی ہے۔"

برسوں کی پریشان حالی اور مشقّت نے ایک طرف اُن کی صحت کو تباہ کیا دُوسری طرف اُنھیں سخت مالی مشکلات میں مبتلا کر دیا۔ اُن کے معدے میں ورم ہو گیا تھا اور چلنے پھرنے سے بھی معذور تھے۔ پاکستان بننے کے بعد وہ کراچی آ گئے۔ نہیں کہا جا سکتا کہ مستقل قیام کے ارادے سے آئے تھے، یا یونہی چند روز کے لیے۔ اشرف نے خود اپنی زبان سے کبھی کچھ نہیں کہا۔ لیکن میرا خیال ہے۔ کہ وہ پاکستان میں رہنے کی نیّت سے آئے تھے۔ ہُوا یُوں کہ اِدھر اُنھوں نے کراچی میں قدم رکھا اُدھر حکومت نے پکڑ کر اُنھیں جیل میں ڈال دیا۔ بصد مشکل سردار عبدالرّب نشتر کے توسّل سے یہ طے ہُوا کہ اشرف اگر فوراً پاکستان سے چلے جائیں تو حکومت اُنھیں رہا کرنے کو تیار ہے۔ چنانچہ خدا جانے کس طرح گرتے پڑتے اور ٹھوکریں کھاتے وہ انگلستان آ گئے۔

میں جب مارچ ۱۹۵۳ء میں لندن پہنچا تو وہ یہیں تھے مجھ سے ملنے آئے۔ تو بغل گیر ہو کر ملے، اور زار زار روئے مدت کے بچھڑے ہوئے تھے، رات تک بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ وہ واپس ہندوستان جانا چاہتے تھے۔ لیکن ہندوستان کی حکومت انھیں اجازت نہیں دیتی تھی۔ کہنے لگے عجب قسمت ہے۔ کہ پاکستان تمھیں روٹی نہ دے سکا۔ ہندوستان مجھے قبول نہیں کرتا۔

بالآخر وہ اس ارادے سے ہندوستان چلے گئے کہ دیکھوں حکومت کیا کرتی ہے۔ حکومت نے بھی عقل مندی کی اور تعرض نہ کیا۔

اشرف یہ کہہ کر یہاں سے گئے تھے کہ اب سیاست گردی کا دفتر تہہ کر کے علی گڑھ میں نوکری کر لوں گا۔ اور باقی زندگی علمی خدمت میں بسر کروں گا۔ لیکن پنڈت نہرو کو ان سے ایک قسم کا ذاتی عناد ہو گیا تھا۔ اور انھی کے ایماء سے اشرف کو علی گڑھ میں جگہ نہ مل سکی۔ پھر مجبوراً انھوں نے پیٹ پالنے کے لیے دلی کے کمرڈی مل کالج میں ملازمت کر لی۔

ان کے پیش نظر تصنیف کا ایک خاصا وسیع پروگرام تھا۔ ہندوستان کی تاریخ کے علاوہ مسلمانوں کی سیاسی جدوجہد کی مکمل روئداد بھی مرتب کرنا چاہتے تھے۔ اپنے "میموئرز" لکھنے کا بھی ارادہ تھا۔ اس سلسلے میں انھوں نے مجھ سے بھی دو ایک بار مشورہ طلب کیا۔

اشرف کمرڈی مل کالج میں درس و تدریس کا کام کرتے تھے۔ لیکن عقیدۃً بدستور کمیونسٹ تھے۔ کچھ مدت کے بعد انھوں نے ماحول کی ناسازگاری کو شدت سے محسوس کرنا شروع کیا۔ تو ترکِ وطن کر کے برلن چلے گئے۔ وہاں سے

چھ مہینے کے لیے ماسکو بھی گئے۔ اور ہندوستان کے عہدِ اسلامی کی تاریخ پر متعدد لکچر دیئے۔

برلن یونیورسٹی میں وہ ایک جرمن پروفیسر کی معیت میں، تاریخ ہند کی ترتیب و تدوین کا کام کر رہے تھے۔ کہ یکایک پیغامِ اجل آگیا۔ اور بالفاظ مولانا صلاح الدین احمد مدیر "ادبی دنیا" "انھوں نے اپنی جانِ ناشکیبا جانِ آفریں کے سپرد کر دی۔"

اشرف کی صرف جان ہی ناشکیبا نہ تھی بلکہ حقیقت یہ ہے کہ وہ مدت سے ایک کٹا ہوا سر اپنے کندھوں پر لیے پھرتے تھے جسے بالآخر انھوں نے اُتار کر پھینک دیا۔

اشرف کے چند خطوط میرے پاس محفوظ ہیں۔ جو ہماری غم نصیب دوستی کی تنہا مادی یادگار ہے۔ یا پھر اُن کی محبت کا نقش ہے۔ جو موت کا داغ بن کر میرے سینے پر ہمیشہ تازہ رہے گا۔

اپنے عقائد کے لیے زندہ رہنا اور زندگی کی چتا میں شب و روز جلنا، اپنے عقائد کا احترام کرنا اور بڑی سے بڑی قیمت پر بھی فریقِ مخالف سے مفاہمت نہ کرنا اپنے عقائد کو متاعِ حیات اور مایۂ زیست سمجھنا اور اُن کی حرمت کے لیے گھر بار کی آسائشیں ترک کر کے پردیس کی کلفتیں اختیار کرنا اور پردیس ہی میں دم توڑ دینا کوئی ہنسی کھیل نہیں۔

عاشق نہ شدی، محنتِ اُلفت نہ کشیدی　　کس پیشِ تو غم نامۂ ہجراں چہ کشاید

کوئی مانے یا نہ مانے، اشرف نے شہادت کی موت پائی۔

لندن۔ ۱۹۶۲ء

باری

باری کی ناگہانی موت کا صدمہ اس قدر تازہ اور شدید ہے کہ ذہن کسی تسلسل کے ساتھ اس کے متعلق سوچ ہی نہیں سکتا۔ اس کی شخصیت اور زندگی کے متعدد پہلو متحرک تصویروں کی طرح ایک ایک کر کے آنکھوں کے سامنے گھوم جاتے ہیں۔ اور دماغ کسی نقطے پر جم کر نہیں ٹھہرتا۔

باری کیا تھا اور کیا نہیں تھا، اس کا جواب صرف اس کے دوست دے سکتے ہیں۔ جن میں سے اکثر کے نزدیک لاہور آج اپنی بالا از شمار آبادی کے باوجود ویران ہو گیا ہے۔ یہ کتنا عجیب اتفاق ہے کہ مرحوم کے احباب میں سے ہر شخص کو یہ احساس ہے کہ باری کو جو تعلقِ خاطر اس کے ساتھ تھا وہ کسی اور سے نہ تھا۔ یہ مرحوم کا کرشمہ تھا کہ اس نے اپنی محبوب شخصیت سے ہر شخص کے دل میں ایسا گھر کر رکھا تھا کہ آج اسے مرنے والے کا بدل ملنا محال نظر آتا ہے۔

باری سے میری پہلی ملاقات ۱۹۳۶ء کے موسم گرما میں اختر شیرانی مرحوم کے مکان پر ہوئی تھی۔ ہم غائبانہ ایک دوسرے کو پہلے سے جانتے تھے۔ تعارف کے بعد باری نے چھوٹتے ہی تعجب سے کہا "آپ ہیں عاشق صاحب؟"

میں نے عرض کیا "اس میں حیران ہونے کی کیا بات ہے"۔

کہنے لگے "میرے ذہن میں آپ کا جو نقشہ تھا اس کے مطابق آپ کو چراغ حسن حسرت کے لگ بھگ ہونا چاہیے تھا"۔

بات آئی گئی ہوئی۔ شام تک ہم اکٹھے رہے۔ پھر وہ واپس لائل پور چلے گئے اس کے بعد ہم کئی سال نہ مل سکے۔ اس دوران میں انھیں کسب معاش کے سلسلے میں رنگون جانا پڑا۔ میں ان کے حالات سے بالکل بے خبر تھا۔ ۱۹۳۸ء میں وہ یکایک لاہور آ گئے۔ اور پھر مرتے دم تک بجز چند ماہ کی غیر حاضری کے کہ جب وہ ۱۹۴۱ء میں دوبارہ رنگون گئے تھے، انھوں نے لاہور سے جدا ہونا گوارا نہ کیا۔ اس عرصے میں ہمارے تعلقات معمولی شناسائی سے شروع ہوئے اور پھر آہستہ آہستہ دوستی اور محبت کی منزلیں طے کرتے ہوئے اس حد تک پہنچ گئے تھے جہاں قلب اور ضمیر کی صفائی کے باعث اگر ایک کے پاؤں میں کانٹا چبھے تو دوسرے کو خود بخود تکلیف محسوس ہوتی ہے۔

باری نے لاہور آ کر اخبار نویسی شروع کی۔ ابتدا میں روزنامہ احسان کے ادارۂ تحریر میں شریک ہوئے۔ وہاں سے نکلے تو میکش اور حسرت کی معیت میں شہباز جاری کیا۔ شہباز میں انھوں نے باقی احباب کے ساتھ مل کر خوب کام کیا۔ نیا اخبار چلانے کے لیے بڑی ہمت درکار تھی۔ میکش، حسرت، باری اور

حاجی لق لق نے شبانہ روز محنت سے شہباز کو بڑے اونچے پیمانے پر پہنچا دیا تھا۔ ۱۹۴۱ء کے ستمبر یا اکتوبر میں ایک روز انھوں نے مجھ سے رنگون جانے کے متعلق مشورہ کیا۔ اُن کے دوست مصوّر جو رنگون میں بہت وسیع کاروبار کے مالک تھے۔ ادب اور صحافت سے بھی دلچسپی رکھتے تھے۔ اُن کی خواہش تھی کہ باری وہاں آکر اُن کے ہفت روزہ اخبار کو سنبھال لیں۔ چنانچہ باری چپکے سے رنگون چل دیئے۔ اور بہت کم لوگوں کو اُن کی روانگی کا علم ہو سکا۔

برما میں جاپانی حملے کے بعد اُنھیں سخت بے سروسامانی کے عالم میں وہاں سے بھاگنا پڑا۔ اور بہ ہزار مصیبت واپس لاہور آئے۔ یہاں اُنھیں حکومتِ پنجاب کے ہفتہ وار اخبار پنچایت کی ایڈیٹری مل گئی۔ ۱۹۴۴ء میں وہ پھر روزنامہ احسان کے مدیر مقرر ہوئے۔ ۱۹۴۶ء میں محکمۂ تعلقاتِ عامہ کے ہفت روزہ اخبار ہمارا پنجاب کے ادارۂ تحریر میں منسلک ہو گئے۔ ۱۹۴۷ء میں پاکستان بننے پر اُنھیں برطانوی محکمۂ اطلاعات میں ایک معقول اسامی مل گئی۔ بہ مشکل دو سال اس جگہ کام کیا تھا۔ کہ پیغامِ اجل آگیا اور وہ دُنیا کے تمام بندھنوں سے آزاد ہو گئے۔

باری کا اصلی وطن دھرم کوٹ تھا جو ضلع گورداسپور کا ایک دور افتادہ اور بڑا مردم خیز گاؤں ہے۔ لیکن وہ غالباً بچپن ہی میں اپنے بزرگوں کے ساتھ نقلِ مکانی کر کے لائل پور آگئے تھے۔ اور اب گویا لائل پور ہی اُن کا وطن بن کر رہ گیا تھا۔ باری کی ننھیال کلانور میں تھیں جو بٹالہ سے بارہ کوس کے فاصلے پر ایک پرانی تاریخی بستی ہے۔ اس طرح دھرم کوٹ اور کلانور کی بہت سی شخصیتیں

ہماری مشترکہ دلچسپی کا مرکز بن گئی تھیں۔ اِس تمام عرصے میں باری کے ساتھ جو دل پذیر صحبتیں میسر آئیں آج اُن کی ایک حسرت ناک یاد دلِ حزیں کا سرمایہ ہے ۱۹۳۹ء کے آخر تک عرب ہوٹل میں صبح و شام کی نشست۔ پھر اُن کے رنگون سے واپس آجانے کے بعد لوہاری دروازے کے باہر اُردو اکیڈیمی کی محفل احباب جو اپنی گوناگوں خصوصیتوں کے اعتبار سے ایک تاریخی مجمع بن کر رہ گئی تھی نگینہ بیکری اور کافی ہاؤس کے دل آویز ہنگامے۔ اِن تمام موقعوں پر باری کی شخصیت دلچسپیوں کا مرکز بن جاتی تھی۔ اور اُن کی موجودگی سے محفل کی محفل یوں شگفتہ ہو جاتی تھی۔ جس طرح پھولوں کے ڈھیر سے گرد و پیش کی فضا مہک اُٹھتی ہے۔

جو لوگ باری کو صرف اُس کی کتابوں کے ذریعہ سے جانتے ہیں۔ ہرگز اندازہ نہیں کر سکتے کہ وہ کتنا خوش گفتار اور بذلہ سنج شخص تھا۔ دوستوں کے مجمع میں جب وہ زبان کھولتا تو اُس کے مُنہ سے پھول جھڑتے تھے۔ وہ گھنٹوں باتیں کرتا اور اپنے سحرِ تکلم سے سُننے والوں کو مسحور کئے رکھتا تھا۔ سنجیدہ اور ٹھوس علمی مسائل پر باتیں کرتے وقت بھی وہ پان سات منٹ کے بعد ایک آدھ ایسی پھلجھڑی چھوڑ دیتا تھا کہ گفتگو کا بوجھ قہقہوں کی صورت میں بخار بن کر ہوا میں اُڑ جاتا تھا۔ اُس کی زبان غیبت اور اُس کا دل نفرت و عداوت کے جذبات سے کبھی آلودہ نہ ہوا۔ وہ ہر شخص کے ساتھ محبت و شفقت سے پیش آنے کا عادی تھا۔ یہی وجہ ہے کہ آج تلاش کرنے پر بھی اُس کا ایک دشمن نہیں مل سکتا۔ بعض لوگوں سے اُس کو نقصان بھی پہنچا۔ لیکن اُس نے ہمیشہ کھلے دل سے اُنھیں معاف کر دیا۔ وہ فطری اور طبعی طور پر کسی کے ساتھ دشمنی کرنے پر قادر نہ تھا

مجھے نہیں یاد کہ اس طویل عرصے میں میرے اور اُس کے درمیان علمی، ادبی، سیاسی اور تاریخی مسائل کے علاوہ کسی اور موضوع پر بھی گفتگو ہوئی ہو۔ تاریخ ہمارا محبوب مضمون تھا۔ اور ہم گھنٹوں نہیں دنوں، مختلف تاریخی مسائل پر بحث کیا کرتے تھے۔ ہمارا ارادہ تھا کہ اورنگ زیب کی موت سے لے کر سکھوں کے عروج تک پنجاب کی ایک جامع تاریخ مرتب کی جائے گی۔ اس کے لیے مواد بھی فراہم کر لیا گیا تھا۔ لیکن پھر زندگی کی مشکلات اور دُنیا کی مکروہات نے اس کام کی مہلت نہ دی۔ بہت سے علمی معاملات میں ابتدا میں ہمارا اختلاف تھا۔ لیکن تعجب ہے کہ چند ہی روز کی گفتگو میں وہ اختلاف مٹ گیا۔

صبح سے شام تک باری کو کسبِ معاش کی اُلجھنوں میں گرفتار رہنا پڑتا تھا۔ رات کے خاموش گھنٹوں میں وہ مطالعہ میں مصروف رہ کر دیدہ ریزی کرتا یا تصنیف و تالیف کے لیے اپنے جگر کا خون زبانِ قلم سے صفحۂ قرطاس پر ٹپکاتا تھا۔ اِس طرح جب ایک آدھ کتاب مرتب ہو جاتی تو اَدنے پونے کسی پبلشر کی نذر ہو جاتی تھی۔ ہمارے ملک میں مصنفوں کا یہی کچھ حال ہے۔ بسا اوقات دیکھا گیا ہے کہ وہ کتابیں جو ہزاروں تشنگانِ علم کی پیاس بجھاتی ہیں خود مصنف کو ایک سال کے لیے بھی نان و نمک سے بے نیاز نہ کر سکیں۔

باری کی اکثر باتیں آج یاد آتی ہیں تو بے اختیار دل میں ایک غم ناک مسرت کی لہر اُٹھتی ہے۔ ٹالنٹن مارکٹ سے انارکلی کے چوک تک ہم نے کئی مرتبہ بیسیوں چکر کاٹے۔ کسی موضوع پر گفتگو چھڑ گئی تو اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر ٹہلتے وقت ہم گرد و پیش سے غافل اپنی بحث میں مصروف رہتے تھے ایک روز

میں نے کہا کہ "اگر قیامت کے دن اِس سڑک کے ٹکڑے کو زبان لگ گئی تو یہ ہمارے عُسر و یُسر کی کیا کیا داستانیں بیان کرے گا۔"

کہنے لگے "عُسر کہو، یُسر کس کافر کو نصیب ہُوا ہے۔"

جنگ کے زمانے میں جب ہمارے ملنے والے بہت سے لوگ سلسلۂ ملازمت یا سلسلۂ کاروبار میں منسلک ہو کر ہند و بیرونِ ہند کے مختلف مقامات پر چلے گئے تو ایک کرم فرما کے ذریعے سے جو دہلی میں بہت بڑے سرکاری منصب پر فائز تھے۔ مجھ کو بھی ایک ملازمت کی پیش کش موصول ہوئی۔ لیکن میں نے بصد معذرت وہاں جانے سے انکار کر دیا۔ باری کو معلوم ہُوا تو سخت ناراض ہوئے۔ میں نے عرض کیا کہ میں لاہور سے جانا نہیں چاہتا۔ پوچھا کیوں؟ تو میں نے کہا کہ لاہور سے باہر جا کر ذہنی ارتقا رُک جاتا ہے۔

باری اِس پر خوب ہنسے۔ اور کئی روز محفلِ احباب میں میرا یہ فقرہ اُن کے تفنن کا ہدف بنا رہا۔ اتفاق کی بات کہ اُنھی دنوں اُنھیں کچھ عرصے کے لیے لائل پور جانا پڑا۔ واپس آئے تو مجھ سے کہنے لگے کہ "آپ کی رائے درست ہے۔ اب کی لائل پور جا کر مجھے پہلی مرتبہ محسوس ہُوا ہے کہ لاہور سے نکل کر واقعی ذہنی ارتقا رُک جاتا ہے۔"

اِس کے بعد اُنھوں نے مصمم ارادہ کر لیا کہ بقیّہ زندگی اِسی انتخابِ ہفت کشور کی نذر کر دی جائے گی۔ چنانچہ ایسا ہی ہُوا۔

باری کی صحت بالعموم اچھی رہتی تھی۔ کھانے پینے کے وہ چنداں شوقین نہیں تھے۔ خوراک صاف ستھری اور کم مقدار میں کھاتے تھے۔ البتہ سگرٹ اور چائے

سے زیادہ شغف تھا۔ میں فروری ۱۹۴۹ء میں دو اڑھائی ماہ کی غیر حاضری کے بعد واپس لاہور آیا تو معلوم ہوا کہ انھیں اس دوران میں دل کی تکلیف ہو گئی تھی یہ اُس بیماری کا پہلا حملہ تھا جو بعد میں جان لیوا ثابت ہوئی۔ اس کے بعد اُنھوں نے چلنے پھرنے، لکھنے پڑھنے اور کام کرنے میں بہت احتیاط برتنی شروع کر دی تھی۔ لیکن افسوس کہ معالج کے انتخاب میں اُنھوں نے کسی دُور اندیشی کا ثبوت نہ دیا۔ جو علاج کسی نے بتایا وہی شروع کر دیا۔ اُن کا خیال تھا کہ قلب بجائے خود ماؤف نہیں۔ صرف تبخیرِ معدہ سے اُسے ضعف پہنچتا ہے یہ خیال غلط تھا۔ اُن کے قلب میں واقعی نقص پیدا ہو چکا تھا۔

مجھے اُن سے ملے ہوئے آٹھ دس دن گذر چکے تھے۔ ۱۱ دسمبر کو اتوار کی تعطیل تھی۔ میں ماڈل ٹاؤن سے محض باری سے ملنے کے لیے شہر گیا۔ نگینہ بیکری پہنچکر معلوم ہوا کہ گزشتہ شام اُن پر دل کی بیماری کا پھر حملہ ہوا ہے۔ اور انھیں میو ہسپتال پہنچا دیا گیا ہے۔ اُس وقت دو بج چکے تھے۔ میں مزید تفصیل معلوم کرنے کے لیے اُن کے مکان پر پہنچا۔ اُن کے بچے سعیدہ اور مسعود سڑک پر کھیل رہے تھے۔ میں ابھی اُن سے باتیں کر رہا تھا کہ اُن کے شریف اور نیک طبیعت پڑوسی ڈاکٹر ریاض سائیکل پر سوار میو ہسپتال سے آئے اور میرے کان میں چپکے سے کہنے لگے کہ باری چل بسا۔

میں نہیں کہہ سکتا کہ اِن الفاظ نے میرا کیا حال کر دیا۔ ایک سنسناہٹ سارے جسم میں دوڑ گئی۔ اور میں گویا غنودگی کے عالم میں ساکت و صامت وہیں جم کر رہ گیا۔ پھر ایک اضطراری کیفیت کے ساتھ میرے قدم خود بخود ہسپتال کی جانب

اُلٹے کھڑے ہوئے۔ اُس کی لاش سُرخ کمبل میں لپٹی ہوئی وارڈ سے باہر برآمدے میں رکھی تھی۔ اور دو نرسیں پاس کھڑی تھیں۔ میں دیر تک ایک تحیّر کے عالم میں مبہوت و دم بخود وہاں کھڑا رہا۔ دماغ ہر قسم کے احساسات سے معرّا اور دل تمام جذبات سے مبرّا تھا۔ یقین نہیں آتا تھا کہ سامنے بادی بے حس و حرکت مردہ پڑا ہے۔ یہی خیال تھا کہ وہ سو رہا ہے ابھی جاگ کر اُٹھے گا اور میرے اس طرح اچانک آجانے پر حسبِ معمول مسکرا کر خیر مقدم کرے گا۔ اُسی رات اُس کی لاش لائل پور بھیجدی گئی۔ جہاں دوسرے روز اُسے پیوندِ خاک کر دیا گیا۔ چشمِ ظاہر بیں کے لیے تو اُس کی قبر لائل پور ہی میں ہے لیکن اُس کا حقیقی مزار اُن سینکڑوں مداحوں اور دوستوں کے دلوں میں ہے جو اُس کی یاد کو متاعِ عزیز سمجھ کر اپنے سینے سے لگائے بیٹھے ہیں۔

بعد از وفات تربتِ ما در زمیں مجو
در سینہ ہائے مردمِ عارف مزار ماست

ابوسعید بزمی

سید ابوسعید بزمی کے نام سے میں پہلی مرتبہ اُس وقت آشنا ہوا جب وہ بجنور میں اخبار مدینہ کے ایڈیٹر تھے۔ اُن کے اندازِ تحریر کی پختگی اور سیاسی معاملات کے متعلق اُن کی رائے کی اصابت سے اخبار پڑھنے والا شخص فوراً متاثر ہو جاتا تھا۔ ۱۹۴۵ء میں جب وہ روزنامہ شہباز کی ادارت کے سلسلے میں لاہور تشریف لائے تو مجھے براہِ راست شرفِ نیاز حاصل ہوا۔

بزمی کو دیکھ کر مجھے تعجب ہوا کہ وہ بالکل نوجوان تھے۔ حالانکہ مدینہ کا مطالعہ کرنے کے بعد میں نے اُنھیں اچھا خاصا عمر رسیدہ آدمی سمجھ رکھا تھا۔ پھر آہستہ آہستہ جب اُن سے ملاقاتوں کا سلسلہ وسیع ہوا تو اُن کے علمی و ادبی محاسن کے علاوہ اُن کے دل و دماغ کے بہت سے لطیف اور پاکیزہ پہلو منکشف ہونا شروع ہوئے۔ بزمی کی جس خوبی نے مجھے فوراً اپنا گرویدہ بنایا

وہ اُن کی زندہ دلی اور بے تکلفی تھی۔ وہ بھوپال کے رہنے والے تھے۔ لیکن ریاستی فضا کے اثراتِ بد نے اُنھیں چھو تک نہیں تھا۔ انگریزی دور میں ہندوستان کی ریاستیں تملق، خوشامد، منافقت اور سازش کا مرکز تھیں، بزمی نے اِسی ماحول میں آنکھ کھولی تھی۔ لیکن وہ اپنی فطری صلاحیت اور طبعی استقامت کے باعث نہ صرف ریاستی نظام کی بُرائیوں سے محفوظ رہے بلکہ اُنھوں نے اِس نظام کو قبول کرنے ہی سے انکار کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ مدّت تک ریاست کے جور و استبداد کا شکار رہے۔ اور اس ضمن میں اُنھیں قید و بند کے شدائد بھی برداشت کرنا پڑے۔

بزمی دوستوں کے دوست اور یاروں کے یار تھے۔ زندگی اور زندگی کے نشیب و فراز کے متعلق اُن کا نقطۂ نگاہ حد درجہ صحت مندانہ تھا۔ غم و الم اور مصیبت کے وقت بھی وہ ہنسنے ہنسانے سے نہ چوکتے تھے۔ مالی مشکلات ہوں یا جسمانی عوارض۔ دوستوں کی بے اعتنائی کا شکوہ ہو یا جورِ اعدا کا گلہ وہ ہر بات میں خوش طبعی اور زندگی کا پہلو نکال لیتے تھے۔ اِسی لیے اُن کی صحبت ہر شخص کے لیے خوشگوار اور کسی کے لیے بارِ خاطر نہ ہوتی تھی۔

روزانہ اخبار میں مسلسل کئی سال کام کرنے سے عموماً مزاج پر یبوست طاری ہو جاتی ہے۔ لیکن بزمی اِس معاملے میں مستثنیٰ تھے۔ وہ جب ملتے اُن کے چہرے پر مسکراہٹ اور پیشانی پر شگفتگی نظر آتی تھی۔ ہماری ملاقات کی ابتدا بالعموم چلتے ہوئے فقروں سے ہوتی تھی۔ بزمی کی متاعِ ادب میں استعاروں، تشبیہوں اور پھبتیوں کی کمی نہ تھی۔ بذلہ سنجی اور لطیفہ گوئی میں بھی اُنھیں مہارت

تھی۔ وہ مجھ سے اکثر کہا کرتے تھے کہ "آپ ملتے ہیں تو میں فوراً اپنے ترکش کا جائزہ لیتا ہوں کہ اس میں صیقل شدہ فقروں، تشبیہوں اور پھبتیوں کا کتنا ذخیرہ موجود ہے۔ میں فقرے بازی میں آپ سے پٹنا نہیں چاہتا۔"

پھر آہستہ آہستہ ہمارے درمیان منجھے ہوئے فقروں اور تڑپتی ہوئی پھبتیوں کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہو جاتا۔ وہ ہر نئی چیز پر جی کھول کر داد دیتے اور ساتھ ہی ساتھ قہقہے لگاتے جاتے تھے۔

ماڈل ٹاؤن سے شہر جاتے اور وہاں سے واپس آتے ہوئے کبھی کبھی ہم بس میں اکٹھے سفر کرتے تھے۔ وہ بالعموم دوپہر کو دفتر جاتے اور رات کی آخری بس سے واپس گھر آتے تھے۔ دیر میں سونے کی وجہ سے اٹھتے بھی دیر میں تھے میں گاہے گاہے صبح کی سیر کے دوران میں انھیں مکان پر جا کر جگا دیتا تھا۔ وہ آنکھیں ملتے ہوئے باہر آتے اور نکدر آمیز لہجے میں کہتے "مولانا۔ ابھی تو چائے بھی نہیں پی۔"

میں عرض کرتا "کون منع کرتا ہے آپ کو چائے سے۔ جی کھول کر پیجئے۔"

بزمی سگرٹ پیتے اور پان بھی کھاتے تھے مجھے ان دونوں کا شوق نہیں۔ البتہ چائے میں وہ میرے ہم مشرب ضرور تھے۔ اچھی چائے کی جستجو ہم دونوں کو رہتی تھی۔ روزنامہ احسان کے دفتر کے پاس چائے کی دکانیں ہیں۔ جہاں پٹھان اپنے مخصوص طریقے سے چائے دم کرتے ہیں۔ میں جب بزمی سے ملنے وہاں جاتا تو وہ پٹھان کی دکان سے دم کی ہوئی چائے منگواتے۔ مجھے اس قسم کی چائے پسند نہیں۔ اور میں ہمیشہ ان سے کہتا "چلئے کسی اچھی جگہ چل کر چائے پئیں۔"

وہ ہنس کر جواب دیتے "ارے بھائی، اچھی بُری کی تمیز چھوڑو۔ چائے تو ہے نا؟"

اور پھر مسکرا کر ریاض کا یہ شعر پڑھ دیتے۔

اچھی پی لی خراب پی لی
جیسی پائی شراب پی لی

ایک رات میں اور وہ اکٹھے ماڈل ٹاؤن آ رہے تھے۔ میں نے کہا "مولانا کوئی تازہ خبر سنائیے"

بولے "شعیب قریشی روس میں پاکستان کے سفیر مقرر ہوئے ہیں"

میں نے خوش ہو کر کہا "بہت اچھا انتخاب ہے"

کہنے لگے "شعیب کا کوئی دلچسپ لطیفہ سنائیے۔ کل اخبار میں چھاپوں گا"

میں نے عرض کیا "شعیب برسوں بھوپال میں وزیر رہے ہیں۔ اور لطیفے آپ مجھ سے پوچھتے ہیں"

فرمانے لگے "آپ سے بھی تو اُن کی ملاقات ہے۔ آخر آپ کو بھی تو کچھ نہ کچھ معلوم ہوگا"

میں نے عرض کیا "جب نہرو رپورٹ کی ترتیب و تدوین میں شعیب نے پنڈت موتی لال نہرو سے بار بار اختلاف کیا تو پنڈت جی نے ایک روز کھانے کی میز پر شعیب سے انگریزی میں کہا۔

SHUAIB, YOU ARE AS CLEVER AS MY SELF, BUT I HAVE THE ADVANTAGE AF AGE

شعیب نے بے تکان جواب دیا۔

EXCUSE ME PANDIT JI, YOU ARE OUT OF AGE

اس پہ موتی لال نہرو نے اُٹھ کر شعیب کے منہ پہ ایک ہلکی سی چپت جمائی۔ اور ہنس کر کہا "کم بخت، میں نے اپنی زندگی میں کبھی کسی کو اتنا بڑا خراجِ تحسین پیش نہیں کیا۔ اور تُو اتنا بد دماغ ہے کہ اس کو بھی خاطر میں نہیں لاتا۔"

بزمی یہ لطیفہ سُن کر بہت محظوظ ہوئے۔ اور دوسرے روز انھوں نے اُسے اخبار میں شائع کر دیا۔

سیاسیات میں ان کا اپنا اندازِ فکر تھا۔ اور اس سلسلے میں انھیں اکثر اپنے حریفوں سے چوکھی لڑائی لڑنا پڑی۔ جس زمانے میں وہ روزنامہ شہباز کے مدیر تھے۔ اور پنجاب میں مسلم لیگ کی تحریک اپنے عروج پر تھی۔ وہ تنہا سینہ سپر ہو کر لیگ کے حامی اخبارات کے خلاف جنگ لڑتے رہے۔ دشمن پر جچا تُلا وار کرنے اور اُس کا بھرپور وار سہنے میں انھیں لُطف آتا تھا۔ جب روزنامہ شہباز کی ملکیت ملک نور الٰہی کے پاس منتقل ہو گئی تو بزمی یہ کہہ کر اخبار سے الگ ہو گئے کہ وہ ملک صاحب کے سیاسی مسلک سے متفق نہیں ہیں۔

ملک تقسیم ہوا اور پاکستان وجود میں آیا تو بزمی کے سیاسی عقائد میں بھی انقلاب آ گیا۔ اُنھوں نے محسوس کر لیا تھا کہ پرانی بساط اُلٹ چکی ہے اور اب ماضی کی تلخیوں کو بھول کر اس نوزائیدہ اسلامی مملکت کے لیے تن من دھن سب کچھ نثار کر دینا چاہیئے۔ چنانچہ اُنھوں نے روزنامہ احسان کی

زمامِ ادارت سنبھال کر جس احساسِ فرض کا ثبوت دیا اور جس جوش و خروش سے پاکستان کی خدمت کی وہ کل کی بات ہے۔ اور اُس کی یاد ہنوز ہمارے دماغوں میں بالکل تازہ ہے۔ سیاسی معاملات میں بزمی کی اپنے حریفوں سے چشمک صرف اخبار کے صفحات تک محدود ہوتی تھی۔ نجی ملاقاتوں میں وہ ایک خلوصِ مجسم اور پیکرِ ایثار دوست بن جاتے تھے۔

۱۹۴۸ء میں جب پنجاب کے وزراء کی اقربا نوازی اور خویش پروری نے صوبے بھر میں کہرام مچا رکھا تھا۔ میں نے اخباروں میں دو ایک مضمون لکھ کر حکومت اور عوام کو حالات کی اصلاح کی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کی۔ اُنہی دنوں ایک روز بزمی ملے۔ اور کہنے لگے کہ "میں آپ کے مضمون غور سے پڑھ رہا ہوں۔ لیکن خلافِ معمول آپ کے یہ مضامین بہت بے کیف ہیں"

میں نے پوچھا "وجہ کیا ہے؟"

فرمایا "آپ جان بچا کر سچ بولتے ہیں۔ اور ظاہر ہے جو شخص جان بچا کر سچ بولتا ہے۔ اُس کی تحریر و تقریر پھیکی رہتی ہے"

میں بزمی کا یہ طعنہ سُن کر پھڑک گیا۔ پھر میں نے اُن سے صاف صاف کہا کہ "آپ کی رائے بالکل درست ہے لیکن مجھے کیا مصیبت پڑی ہے کہ روایتی قاضی کی طرح شہر کے اندیشے میں اپنے آپ کو ہلاک کرتا پھروں"

جواب میں مسکرا کر کہنے لگے "سچ صرف چار شخصوں نے بولا ہے۔ مسیحؑ۔ حسینؓ۔ سقراط اور منصور نے"

بزمی سے میری آخری ملاقات ضلع کچہری کے قریب ہوئی تھی۔ مہینوں کی

غیر حاضری کے بعد وہ کراچی سے لاہور آئے تھے۔ میں نے چھوٹتے ہی پوچھا۔
"کیوں حضرت! کراچی میں کوئی نیا گھر تو نہیں بسا لیا؟"
کہنے لگے "ماڈل ٹاؤن والا گھر وبالِ دوش ہو رہا ہے۔ کراچی میں کیا خاک گھر بساؤں گا۔"

اُن دنوں وہ امریکہ جانے کی تیاری کر رہے تھے۔ مجھ سے کہنے لگے کہ "پاسپورٹ حاصل کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ چھ مہینے کا دورہ ہے۔ فرمایئے امریکہ سے آپ کے لیے کیا لاؤں۔؟"
میں نے عرض کیا "گھوم پھر کر خود ہی چلے آئیے۔ کھانے پینے اور پہننے کو سب کچھ یہیں موجود ہے۔"

پھر ایک روز صبح کے وقت اخبار پڑھتے ہوئے یکایک یہ خبر آنکھوں کے سامنے آئی کہ بزمی امریکہ میں حرکتِ قلب کے بند ہو جانے سے چل بسے۔ یہ اطلاع اتنی اچانک اور خوفناک تھی کہ دل اس کو صحیح ماننے پر آمادہ نہ تھا۔ دوست احباب کے حلقے میں آناً فاناً یہ خبر آگ کی طرح پھیل گئی۔ اور شام تک ہر شخص کی زبان پر یہی چرچا تھا۔

گزشتہ تین سال میں اختر شیرانی۔ باری اور بزمی محفلِ احباب کو سوگوار بنا کر اس جہانِ ناپائدار سے کوچ کر گئے ہیں۔ اِن کی موت نے زندگی میں ایک خلا پیدا کر دیا ہے۔ جو پُر ہوتا نظر نہیں آتا۔ پرانے دوست ایک ایک کر کے اٹھتے جا رہے ہیں۔ اور نئے دوست پیدا کرنے کی صلاحیت اب رہی نہیں۔ اِس لیے زندگی کی ویرانی بڑھتی اور جمعیت گھٹتی جا رہی ہے۔ ع

کیا خاک جیئے کوئی شب ایسی سحر ایسی

لاہور ۱۹۵۲ء

چراغ حسن حسرت

عالم زماتمی و ز افغانِ ما پُر است
شد عندلیب خاک و چمن از نوا پُر است

پردیس میں جب کبھی لاہور کی یاد ستاتی، اور جن دوستوں سے ملنے اور زبانی غمِ فرقت کا ماجرا سُنانے کی آرزو بے چین کرتی، اُن میں حسرت کا نام سرِفہرست تھا۔ یا پھر لندن کے کتب خانوں میں جب قدیم علمی نوادر نظر سے گزرتے تو جن دوستوں کو اپنے اِس سفر میں شریک کرنے کی خواہش بے تاب کرتی، اُن میں بھی سب سے پہلے حسرت ہی کا نام سامنے آتا تھا۔ افسوس یہ خواہشیں اب کبھی پوری نہ ہوں گی۔

میں نے حسرت کو پہلے پہل ۱۹۳۰ء میں دیکھا تھا۔ میری طرح لاہور کے اکثر لوگ بھی اُسی زمانے میں اُن سے روشناس ہوئے تھے۔ ہندوستان کی سیاست

میں نہرو رپورٹ کا ہنگامہ بعض خصوصیات کے اعتبار سے بڑا دلچسپ تھا۔ اور حد درجہ افسوس ناک بھی۔ جب یہ طوفان اُٹھا تو حسرت کلکتہ میں تھے۔ مولانا ظفر علی خاں کا اُس طرف پھیرا ہوا تو اُنھیں اپنے ہمراہ لوا لائے۔ اور لاہور پہنچتے ہی حسرت "زمیندار" کے ادارۂ تحریر میں شریک ہو گئے۔ "زمیندار" اُس وقت بہت بڑا کانگریسی اور نہرو رپورٹ کا حامی اخبار تھا۔ حسرت کا سیاسی مسلک بھی یہی تھا۔ چنانچہ کچھ دنوں یہ رفاقت خوب نبھی۔

حسرت نے صحافت کی ابتدا کلکتہ میں کی تھی۔ ایک ادبی رسالہ آفتاب بھی وہیں جاری کیا تھا جو بہ مشکل سال بھر زندہ رہ سکا۔ نئی دنیا۔ پیام اور عصرِ جدید میں بھی کچھ مدت کام کیا۔ جن اکابر سے وہاں اُن کے مراسم ہو گئے تھے اُن میں آغا حشر۔ مولانا ابوالکلام آزاد۔ نواب نصیر حسین خیال اور سر عبداللہ المامون سہروردی قابلِ ذکر ہیں۔ ادب و انشاء میں وہ نصیر حسین خیال کے بڑے مداح تھے اور کہا کرتے تھے کہ خیال ہی کی صحبت نے اُن میں انشاء پردازی کا صحیح مذاق پیدا کیا۔ اس سے پہلے ان کی تحریر ابوالکلام آزاد۔ سجاد حیدر یلدرم اور نیاز فتح پوری کے اسالیبِ بیان کا گویا ایک مرکب تھی۔ وہی بھاری بھرکم الفاظ، عربی فارسی کی گراں بار ترکیبیں۔ عسیر الفہم استعارے اور بدیع المثال تشبیہیں اُن کے ہاں بھی طرۂ امتیاز سمجھی جاتی تھیں۔ خیال نے انھیں بتایا کہ یہ انداز تحریر قادر الکلامی کا ثبوت نہیں، بلکہ لکھنے والے کے عجزِ بیان کا اعتراف ہے اس کے بعد حسرت نے مشکل نگاری کو ترک کر کے آسان لکھنے کی طرف توجہ کی۔ اور آہستہ آہستہ اس میں ایسا کمال پیدا کیا کہ خود صاحبِ طرز انشاء پرداز بن گئے۔

لاہور آکر اُنھوں نے بہت سے اخباروں میں کام کیا۔ زمیندار سے ابتدا کی پھر انصاف۔ احرار۔ تہذیب نسواں۔ احسان۔ شہباز۔ نیشنل کانگرس پنچایت۔ امروز ان تمام اخباروں میں یکے بعد دیگرے اُنھوں نے اپنے قلم کے جوہر دکھائے۔ حسرت کا رنگِ تحریر اتنا انوکھا، پُر لطف اور منجھا ہوا تھا کہ اُن کا نام اگر درج نہ بھی کیا جاتا تو بھی عبارت پکار اُٹھتی تھی کہ لکھنے والا فلاں شخص ہے۔

اُنھوں نے زبان پر غیر معمولی محنت کی تھی۔ نثر و نظم میں اساتذہ کی ہر قابلِ ذکر کتاب اُن کے مطالعہ سے گزر چکی تھی۔ فورٹ ولیم کالج کے انشا پردازوں کا ایک ایک لفظ اُنھوں نے پڑھا تھا۔ شبلی۔ حالی۔ آزاد۔ سرشار۔ شرر سجاد حسین وغیرہ کی تحریروں کے حوالے یوں قلم برداشتہ دیتے تھے گویا یہ سارا ذخیرہ اُن کے ذہن میں محفوظ ہے۔ کلاسیکل ادب کے ساتھ ہی ساتھ عہدِ حاضر کے ادب کی ہر جدّت اور بدعت بھی اُن کی نگاہ میں تھی۔ زندگی اور معاشرت کے باقی شعبوں کی طرح ادب میں بھی وہ تسلسل اور ارتقا کے قائل تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کی تحریر میں ایک طرف قدامت کی وضعداری اور متانت جلوہ گر تھی۔ اور دوسری طرف حال کی توانائی اور قوت بھی موجود تھی۔ فارسی میں رودکی سے لے کر اقبال تک ہر اچھے شاعر کا کلام اُن کی نظر سے گزر چکا تھا۔ جدید ادب کی بعض فروگذاشتوں سے وہ سخت نالاں تھے۔ نو آموز ادیبوں اور شاعروں کو ہمیشہ یہی مشورہ دیا کرتے تھے کہ بے تحاشا قلم اُٹھا لینے سے پہلے مطالعہ و سیع کرو تاکہ ادب کے تنوع اور اُس کی بوقلمونی سے زبان و بیان کے چھپے ہوئے

گوشے بے نقاب ہوتے چلے جائیں۔

جون ۱۹۳۷ء میں ترقی پسند مصنفین کی کانفرنس امرتسر کے جلیانوالہ باغ میں منعقد ہوئی تو حسرت اور میں دونوں بڑے شوق سے وہاں گئے۔ ان دنوں ترقی پسند ادب کا بڑا غلغلہ تھا۔ یو۔پی سے ڈاکٹر اشرف اور سجاد ظہیر آئے تھے۔ کانفرنس میں ترقی پسند سیاست کے ہنگامے تو ہمیں کثرت سے نظر آئے۔ لیکن ادب کا کوئی سراغ نہ ملا۔ حسرت اور میں بیزار ہو کر اٹھ آئے۔ اس کے بعد میں نے تو ترقی پسند ادب کی طرف کبھی توجہ نہیں کی۔ حسرت نے البتہ منہ کا مزا بدلنے کے لیے دو ایک بار ادھر کا رخ کیا۔ لیکن ہر مرتبہ پریشان ہی نہیں، نادم ہو کر پلٹ آئے۔

جس زمانے میں حسرت روزنامہ احسان میں مطائبات کا کالم لکھتے تھے، اُن کا قلم سدا بہار اور اُن کی طنز بے پناہ تھی۔ جس عنوان کو چھو لیتے وہی زندۂ جاوید حقیقت بن جاتا تھا۔ ۱۹۳۵ء کے دستور کے تحت پنجاب میں پہلا انتخاب ہونے والا تھا۔ اور صوبے بھر کی فضا میں اضطراب اور کشمکش کی ایک لہر جاری تھی۔ اتحاد پارٹی کی گڈی چڑھی ہوئی تھی اور سر سکندر حیات خاں مرحوم کا طنطنہ عروج پر تھا۔ اِدھر مسلم لیگ کی حالت خستہ اور کمزور تھی۔ روزنامہ انقلاب اُن دنوں اتحاد پارٹی کا سب سے بڑا نقیب۔ اور احسان لیگ کا طرف دار تھا۔ انقلاب کے "افکار و حوادث" میں آئے دن لیگ کی بے سر و سامانی پر طعن و تشنیع کے نشتر چلائے جاتے تھے۔ ایک روز مدیر افکار نے اپنے کالم میں سوال و جواب کے طور سے ایک مختصر سا مکالمہ

لکھ کر اتحاد پارٹی کی برتری ثابت کرنے کی کوشش کی۔ وہ مکالمہ یوں تھا:۔

"پنجاب میں سب سے بڑی سیاسی جماعت کون سی ہے؟ ..... اتحاد پارٹی!

پنجاب میں سب سے زیادہ مسلمان کس پارٹی میں شامل ہیں؟ ..... اتحاد پارٹی!

پنجاب میں کس پارٹی نے عوام کی سب سے زیادہ خدمت کی ہے؟ ..... اتحاد پارٹی!

حسرت نے دوسرے ہی روز احسان میں لکھا کہ "حضرت! یوں بات نہیں بنے گی۔ چاہیئے تو یہ کہ دو آدمی ہاتھوں میں لمبے لمبے چمٹے پکڑ کر سڑک کے آر پار ایک دوسرے کے سامنے کھڑے ہو جائیں، ان میں سے ایک اپنا چمٹا بجاتا ہوا پکارے:۔

"تیرے گورے گورے گال"

دوسرا بلند آواز میں جواب دے ——— اتحاد پارٹی!"

پہلا:۔ ——— "تیرے بھورے بھورے بال"

دوسرا: ——— اتحاد پارٹی!

پہلا: ——— "تیرا یار نہ ندر نا تھ"

دوسرا: ——— اتحاد پارٹی!

پہلا:۔ ——— "سارے ٹبڑی تیرے ساتھ"

دوسرا: ——— اتحاد پارٹی!

یہ مکالمہ خاصا طویل اور بے حد پُر لطف تھا۔ اور چند ہی روز میں اتنا مقبول ہوا کہ لاہور کے گلی کوچوں میں بچے گانے لگے۔ الیکشن کے دنوں میں جب مجھے لیگ کے امیدواروں کی حمایت میں پنجاب کے اکثر شہروں کا دورہ کرنا

پڑا تو میں نے اپنی آنکھوں سے سڑکوں اور بازاروں میں لڑکوں کو ڈنڈے بجا بجا کر یہ مکالمہ گاتے ہوئے دیکھا۔

حسرت کی یہ محض سخن گسترانہ چھیڑ بازی تھیں جو صرف اخبار کے صفحات تک محدود رہتی تھیں۔ نجی ملاقاتوں میں وہ اور مدیر انقلاب ایک دوسرے پر جان چھڑکتے تھے۔ جس زمانے میں تہذیب نسواں کی ادارت ان کے سپرد تھی وہ ایک روز شفاء الملک حکیم فقیر محمد چشتی مرحوم کے ہاں تشریف لائے۔ راقم التحریر بھی وہاں موجود تھا۔ حکیم صاحب نے حسب معمول نہایت متین انداز میں پوچھا "کہیئے حسرت صاحب! سیاست کی تازہ خبر کیا ہے؟"

حسرت نے جواب دیا "حضرت! میں عورتوں کے اخبار کا ایڈیٹر۔ مجھے سیاست سے کیا واسطہ؟"

حکیم صاحب نے فرمایا "سچ ہے صاحب!

عشق کا حال بیسوا جانیں

ہم بہو بیٹیاں یہ کیا جانیں"

شعر اتنا برمحل اور حسب حال تھا کہ تیر کی طرح نشانے پر بیٹھا اور محفل قہقہوں سے گونج اٹھی۔ حسرت جھینپ سے گئے۔ لیکن لطف اندوز بھی خوب ہوئے۔

بعض اوقات حسرت ایک لفظ کو تھوڑا سا بگاڑ کر ظرافت کی ایسی لطیف افزا چاشنی پیدا کرتے تھے کہ سننے والے گھنٹوں محظوظ ہوتے۔ ہمارے ایک دوست اللہ بخش سلیم جو عرب ہوٹل کی محفل احباب کے بہت عزیز رکن تھے۔ جب

کسبِ معاش کے سلسلہ میں لاہور کو خیرباد کہہ کر دلّی چلے گئے تو حسرت اُن کا ذکر کرتے وقت ہمیشہ اللہ بخشے سلیم کہا کرتے تھے۔

دسمبر ۱۹۳۸ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس پٹنہ میں ہوا تو ملک برکت علی۔ پیر تاج الدین اور راقم السطور وہاں گئے۔ پنجاب پر اس وقت یونینسٹ پارٹی ابرِ محیط کی طرح چھائی ہوئی تھی۔ اور لیگ کو ایک زندہ اور فعال جماعت بنانے کی جتنی کوششیں ممکن ہو سکتی تھیں ہم کر چکے تھے لیکن کامیابی نہ ہوئی۔ مصیبت یہ تھی کہ سر سکندر کو لیاقت علی خاں مرحوم کی درپردہ حمایت حاصل تھی۔ اس لیے لیگ کے مرکزی دفتر کا سلوک بھی ہمارے ساتھ اچھا نہ تھا۔ ان حالات میں پٹنہ کا سفر ہمارے لیے چنداں ہمت افزا نہیں تھا لیکن فرض کی بجا آوری بہرحال ضروری تھی۔ رات کا وقت تھا اور ہم لوگ لاہور کے اسٹیشن پر کھڑے گاڑی کا انتظار کر رہے تھے کہ حسرت آ گئے۔ دراصل وہ کسی اور کام سے اسٹیشن آئے تھے۔ جونہی انھیں معلوم ہوا کہ ہم لوگ دوسرے پلیٹ فارم پر موجود ہیں تو الوداعی ملاقات کے لیے ادھر تشریف لے آئے آتے ہی پوچھنے لگے "کدھر کے دھاڑے ہیں؟"

ملک صاحب نے جواب دیا "پٹنہ جا رہے ہیں"

حسرت نے بہت معصومیت سے کہا "اچھا تو آپ پٹنے جا رہے ہیں"

حسرت کی اس نکتہ آفرینی پر سب بے اختیار ہنس پڑے۔ واقعی ہم لوگ "پٹنے" جا رہے تھے۔

عرب ہوٹل کا ذکر آیا تو اس کی بھی ایک جھلک دیکھ لیجیے۔ اُن دنوں عرب ہوٹل

آج کا سا عرب ہوٹل نہ تھا۔ حسرت۔ فضل کریم دُرّانی۔ ن۔م راشد۔ اختر شیرانی حفیظ ہوشیارپوری مظفر حسین شمیم۔ کرشن چندر۔ ہری چند چڈھا۔ بادی روزمرہ کے حاضر باشوں میں تھے۔ کبھی کبھی آنے والوں میں شفاء الملک حکیم محمد حسن قرشی۔ راجہ حسن اختر۔ مولانا صلاح احمد۔ پروفیسر علم الدین سالک۔ سید عبداللہ۔ جلال الدین اکبر وغیرہ شامل تھے۔ مولانا ظفر علی خاں بھی گاہے ملے اپنے قدوم میمنت لزوم سے اِس کلبۂ احزاں کو سرفراز فرماتے تھے۔ بقولِ محمد حسین آزاد "جب یہ لوگ ایک جگہ جمع ہوتے ہوں گے تو آسمان کو بھی زمین پہ رشک آتا ہوگا۔"

اِس تمام محفل کی روح رواں حسرت تھے، وہ گویا مرکزِ ثقل یا محور تھے اور مجلس کے جملہ ارکان اُنہی کے گرد گردش کرتے تھے۔ کبھی کبھی تو ایسا بھی ہوتا تھا کہ صبح ناشتہ عرب ہوٹل میں کیا۔ دوپہر کا کھانا وہیں کھایا۔ سہ پہر کی چائے اُسی جگہ پی۔ اور رات کا کھانا کھا کر وہاں سے اُٹھے۔ اِس دوران میں دُنیا بھر کی باتیں ہوتی رہتی تھیں۔ حسرت طبعاً خاموش اور کم آمیز آدمی تھے۔ بے تکلف دوستوں کے مجمع میں تو وہ باغ و بہار تھے۔ لیکن صحبتِ ناجنس اُن پہ سخت گراں گزرتی تھی۔ اجنبیوں سے بھی زیادہ نہیں کھلتے تھے۔ اگر کوئی نو وارد یا آدابِ محفل سے ناواقف شخص بدتمیزی کر بیٹھتا تھا تو حسرت جواب دینے کی بجائے چپ ہو جاتے تھے۔ وہ ہر لحاظ سے حریفِ بذلہ تھے۔ حریفِ دشنام نہ تھے۔

عرب ہوٹل کی ہمہ گیری کا یہ عالم تھا کہ اخباروں کے دفتروں میں خبریں

بعد میں پہنچتی تھیں۔ اور عرب ہوٹل کی چار دیواری میں پہلے آ داخل ہوتی تھیں،
مجھے دن بھر مسلم لیگ کے دفتری کاموں میں مصروف رہنا پڑتا تھا۔ اس لیے
شام کو عرب ہوٹل کی مجلس میں التزاماً شریک ہوتا تھا۔ ایک روز غلام رسول خاں
مرحوم تعجب سے کہنے لگے کہ "یہ عرب ہوٹل کیا بلا ہے؟ غضب خدا کا لیگ
کی خبریں لیگ کے دفتر میں دیر میں پہنچتی ہیں، اور تم وہاں پہلے سن لیتے ہو"۔
میں نے عرض کیا "اس میں حیران ہونے کی کیا بات ہے۔ لسان الغیب
تو مدتوں پہلے کہہ گئے ہیں۔

سرِ خدا کہ عارفِ سالک بہ کس نہ گفت
در حیرتم کہ بادہ فروش از کجا شنید"

۱۹۳۹ء کے آخر میں میں ٹمپل روڈ پر اٹھ آیا۔ حسرت گھر گرہستی ہو گئے۔
باری نے وہ محلہ چھوڑ کر پرانی انارکلی میں مکان لے لیا۔ راشد ملتان۔ اختر
ٹونک۔ حفیظ ہوشیارپوری اور کرشن چندر دلی چلے گئے۔ اس کے بعد
عرب ہوٹل کی محفلیں خواب و خیال ہو کر رہ گئیں۔ اگرچہ اس صحبتِ مستعجل
کی یاد اب تک نہاں خانۂ دماغ میں ایک متاعِ عزیز کی طرح محفوظ ہے۔
لندن کی ایک تنگ و تاریک گلی میں وہ چٹیا رخانہ ابھی تک موجود ہے
جہاں ڈاکٹر جانسن کھانا کھایا کرتے تھے۔ امریکہ تک کے کروڑپتی وہاں آتے
اور جانسن کی یاد میں ادب و احترام سے گردنیں جھکاتے ہیں۔ حسرت کی ادبی
عظمت کا تقاضا تو یہ ہے کہ عرب ہوٹل کو بھی جوں کا توں محفوظ کر لیا جائے لیکن
پھر سوچتا ہوں کہ جس ملک میں اقبال پرستی کے بلند بانگ دعووں کے باوجود وہ

مکان نہیں محفوظ کیا جا سکا، جہاں اقبالؔ نے اپنی زندگی کا بہترین حصہ بسر کیا تھا۔ وہ بالا خانہ نہیں قائم رکھا جا سکا، جہاں سے شیخ عبدالقادر نے مخزن جاری کر کے اُردو ادب کے دھارے کا رُخ موڑ دیا تھا۔ وہ دو کمروں کی کُٹیا نہیں بچائی جا سکی جہاں بیٹھ کر حالیؔ نے نئی شاعری کی داغ بیل ڈالی تھی۔ اور ستم یہ ہے کہ مسجد شاہی کے بلند میناروں کے سائے تلے منٹو پارک کا وہ قطعہ نہیں محفوظ کیا جا سکا، جہاں ہندوستان کے ایک لاکھ مسلمانوں نے جمع ہو کر قیامِ پاکستان کی معرکتہ الآرا قرارداد منظور کی تھی۔ وہاں غریب حسرتؔ کو کون پوچھے گا۔

ہر زخم کہ برداشت ز ایامِ نظیری
نے چاک گریباں شد و نے چاکِ کفن شد

جنگ چھڑی تو ایک عجیب واقعہ ہوا۔ یعنی حسرتؔ فوج میں ملازم ہو گئے۔ میں نے یہ خبر سُنی تو سکتے میں آ گیا۔ کہاں حسرتؔ اور کہاں فوج کی نوکری۔ یقین نہیں آتا تھا۔ یوں تو بڑے بڑے ادبائے سحر طراز اور شاعرانِ نغز گفتار نے "جنتا کی جنگ" کا نعرہ لگا کر اپنے خامۂ جواہر چکاں کو ہاتھ سے رکھ دیا تھا اور بڑے فخر سے فرنگی آقا کی بندوق اُٹھا لی تھی۔ حد یہ ہے کہ کالجوں کے پروفیسروں تک نے درس و تدریس کے گون اُتار کر ہوائی جہاز چلانے والوں کی وردی پہن لینے میں عار محسوس نہیں کی تھی۔ لیکن حسرتؔ کا معاملہ سب سے مختلف تھا تاہم جب وہ یونیفارم میں ملبس، پُورے فوجی بن کر، بہ نفسِ نفیس لاہور تشریف لائے تو ان کو دیکھتے ہی میری بے اختیار ہنسی چھوٹی۔

کہنے لگے "میں جانتا ہوں کیوں ہنستے ہو۔"

میں نے عرض کیا "اگر جان کی امان پاؤں تو ایک بات پوچھوں"۔

فرمایا "پوچھو"۔

میں نے کہا "وضع قطع سے تو انشاء اللہ آپ مجاہدین کے زمرے میں شمار ہوتے ہیں۔ اعمال کا کیا حال ہے؟"

کہنے لگے "سنو میاں، لاہور کی ہل من مزید زندگی نے مقروض کر دیا ہے فوج میں تنخواہ کافی ملتی ہے۔ چاہتا ہوں کچھ پس انداز کر لوں۔ اول اس لیے کہ قرض اتر جائے گا۔ دوم یہ کہ چھوٹا سا مکان بنوا لوں گا۔ باقی رہی فسطائیت یا نازیت۔ میں برطانیہ کی شہنشاہیت کو جرمنی کی نازیت سے بدتر سمجھتا ہوں۔ اور دونوں پر لعنت بھیجتا ہوں"۔

مجھے حسرت کی صاف گوئی بے حد پسند آئی۔ میں نے عرض کیا "یہ نئی کینچلی آپ کو مبارک ہو۔ دعا کیجیے کہ خدا ہمارا آپ کا انجام بخیر کرے"۔

جنگ ختم ہوئی۔ پاکستان بنا۔ تو حسرت پھر لاہور آ گئے۔ لیکن اب اُن کی صحت کچھ ایسی اچھی نہ تھی۔ فوجی ملازمت کے دوران میں اُنھوں نے مے نوشی میں غیر معمولی کثرت کی تھی۔ پینے تو وہ پہلے بھی تھے۔ لیکن اعتدال سے۔ فوج میں مُفت کی ملنے لگی تو احتیاط اور پابندی قائم نہ رہ سکی۔ تاہم صحت کی واماندگی کے باوجود اُنھوں نے روزنامہ امروز اس شان سے نکالا کہ دوست دشمن سبھی تحسین و آفرین پکار اُٹھے۔ اُنھوں نے اخبار پر بڑی محنت کی اور بڑے بڑے ٹھاٹھ کے خاص نمبر نکالے۔ دوست احباب سے تقاضا کر کر کے مضمون لکھواتے۔ ستمبر ۱۹۵۰ء میں اُنھوں نے امروز کا کالج نمبر نکالنا چاہا تو مجھ کو خاص کر سچین کالج

پر مضمون لکھنے کا حکم دیا۔ میں نے پریشانی اور کم فرصتی کا عذر پیش کیا تو کہنے لگے کہ "یہ دونوں چیزیں مقدر میں لکھی جا چکی ہیں۔ بتاؤ مضمون کب دو گے۔؟"

میں نے عرض کیا "اکتوبر سے پہلے ممکن نہیں۔"

فرمایا "بہت اچھا۔ اب یہ خاص نمبر اکتوبر ہی میں شائع ہوگا۔"

حسرت کی دوست نوازی۔ غم گساری۔ وضعداری کا جواب نہیں تھا۔ اُن کے اِس جوہر کو پرکھنے والے صرف وہی لوگ ہیں جن کو اُن سے برسوں ملنے کا اتفاق ہوا ہے۔ وہ فطری طور پر بے ضرر اور کم آزار شخص تھے۔ دوستوں کی تکلیف کو اپنی تکلیف اور دوستوں کے آرام کو اپنا آرام سمجھتے تھے۔ اُن کا قلم حاضر و غائب دوستوں کی حمایت میں ہمیشہ شمشیرِ بے نیام کا کام دیتا تھا۔ کیا مجال کہ کسی دوست کی شہرت یا عزت پر حملہ ہو اور حسرت خاموش بیٹھے رہیں۔ ایسے موقعوں پر وہ سینہ سپر ہو کر آگے بڑھتے۔ اور دوست کے لیے حصارِ عافیت بن جاتے تھے، اختر شیرانی کے متعلق جب لوگوں نے بے سر و پا قصے مشہور کرنا شروع کئے۔ اور "ہیر رانجھا" اور "لیلےٰ مجنوں" کی طرح اُس غریب کی بھی فرضی داستانِ معاشقہ کو "اختر و سلمیٰ" کا نام دیا گیا۔ تو حسرت غصہ سے بے تاب ہو گئے۔ ایک روز مجھ سے کہنے لگے "دیکھتے ہو، اختر کو کیونکر رسوا کیا جا رہا ہے۔ آخر تمہارا بھی تو وہ دوست تھا۔ کیوں نہیں اس طوفانِ بے تمیزی کو روکنے کی کوشش کرتے"؟

میں نے عرض کیا "آپ کے پاس اخبار ہے۔ آپ کچھ لکھیے۔"

اِس کے بعد اُنھوں نے "امروز" میں پے بہ پے اِن رجحانات کے خلاف لکھا تو وہ دبا رک گئی۔

میں نے اِس تمام عرصے میں اُن کو صرف ایک شخص کے ساتھ اُلجھتے دیکھا ہے جو بظاہر اُن کی دوستی کا مدعی بھی تھا۔ یہ صاحب، جو حقیقتاً اپنی ذات کے سوا کسی کے دوست نہ تھے، برسوں حسرت کی دوستی کا دم بھرتے رہے۔ لیکن جب موقع ملا تو عین عقب سے حملہ آور ہوئے۔ حسرت بار بار طرح دیتے رہے لیکن جب دوسری طرف سے متعدد اخباروں میں فرضی نام سے گالیوں کا انبار چھپنے لگا تو حسرت نے مجبوراً اپنے سینے پر پتھر رکھ کر قلم کو جنبش دی۔ پھر جو کیچڑ اُچھلی تو اُس کے چھینٹے دُور دُور تک پہنچے، اور بہت سے دامن داغدار ہو گئے۔ جب یہ ہنگامۂ کارزار ختم ہوا تو حسرت سخت دل شکستہ اور اُداس تھے۔ مجھ سے ملے تو چشم پُرآب ہو کر کہنے لگے "دیکھا تم نے؟ یہ ہیں بیسویں صدی کی شعلہ آشام دوستیاں جن کے بھروسے پر ہم زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں۔ تم ہی بتاؤ۔ اب دُنیا میں کس پر اعتبار کیا جائے۔"

حسرت سے میری آخری ملاقات اپریل ۱۹۵۲ء میں کراچی میں ہوئی تھی۔ وہ ریڈیو پاکستان میں ملازم تھے۔ دو گھنٹے اُن کے دفتر میں باتیں ہوتی رہیں۔ پھر شام کو دیر تک کافی ہاؤس کے ایک گوشے میں گپ کا دَور چلتا رہا۔ وہ ریڈیو کی ملازمت سے خوش نہیں تھے۔ اور واپس لاہور جانا چاہتے تھے۔ چند مہینے بعد میں یہاں چلا آیا پھر کبھی کبھار ان کی بیماری کی خبریں مجھ کو ملنے لگیں۔ لیکن یہ بات تو وہم و گمان میں بھی نہ تھی کہ وہ یکایک ہم سے مُنہ موڑ کر یوں رخصت ہو جائیں گے۔

اے ہم نفسانِ محفلِ ما رفتید ولے نہ از دلِ ما

لندن ۱۹۵۵ء

تبرکاتِ اکبر

وہ صورتیں نہ جانے کس دیس بستیاں ہیں
اب جن کے دیکھنے کو آنکھیں ترستیاں ہیں

مجھے اپنی زندگی میں جن چند بڑے آدمیوں سے ملنے کا شرف حاصل ہوا، اُن میں مؤرخِ اسلام مولانا اکبر شاہ خاں نجیب آبادی مرحوم و مغفور کو ایک بلند مقام حاصل ہے۔ مولانا سے میرا دیرینہ رشتہ تھا۔ وہ میرے شفیق و مہربان استاد تھے اور کرم فرما دوست بھی تھے۔ یہ تعلق اُستاد اور شاگرد کی حیثیت سے شروع ہوا تھا جس نے آہستہ آہستہ دوستی کی صورت اختیار کر لی تھی۔ خدا کے فضل سے یہ دوستی آخر وقت تک قائم رہی۔ اور مولانا نے بھی تا دمِ مرگ اپنی محبت و شفقت اور لطف و کرم میں رتی برابر کمی نہ ہونے دی۔[1]

---

[1] مولانا کا انتقال ۱۵ مئی ۱۹۳۸ء کو جوالا پور میں ہوا تھا۔ جہاں وہ بغرضِ علاج مقیم تھے۔ لیکن انھیں دفن نجیب آباد میں کیا گیا تھا۔

مجھے تھوڑی بہت حرف شناسی جو آج میسر ہے۔ اور یہ لکھنے پڑھنے کا تھوڑا سا شوق جاری ہے۔ سب مولانا کی دین ہے۔ اگر اُن کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کرنے اور اُن کی صحبت سے مستفید ہونے کی سعادت حاصل نہ ہوتی تو یہ حرف شناسی کی استعداد بھی پیدا نہ ہو سکتی تھی۔

مولانا کے مزاج کو اگر دو لفظوں میں بیان کیا جا سکتا ہے۔ تو وہ ہیں توکّل اور غیرت۔ وہ ایک درویش صفت انسان تھے۔ جن کے توکّل کی مثال میں نے کہیں اور نہیں دیکھی۔ ساتھ ہی ساتھ وہ انتہا درجے کے غیور بھی تھے۔ انھوں نے ساری عمر تنگ دستی میں بسر کی۔ لیکن کبھی آنکھ اُٹھا کر اہلِ دول کے آستانوں کی طرف دیکھنا گوارا نہ کیا۔ عام دنیاداروں کا رنگ ڈھنگ انھیں چھو بھی نہیں گیا تھا۔ وہ صحیح معنی میں فنا فی العلم تھے اور جو تصانیف اپنی یادگار چھوڑ گئے ہیں اُن کے مسودے انھوں نے روشنائی سے نہیں بلکہ اپنے خونِ جگر سے لکھے تھے۔

میں نے ۱۹۴۲ء میں مولانائے مرحوم کے مکاتیب کا ایک مجموعہ مرتب کیا تھا۔ خیال تھا اُسے چھپواؤں گا۔ اِس مجموعے میں جو خطوط شامل تھے اُن میں بیشتر میرے نام تھے۔ بعض اور احباب نے بھی مکاتیب عطا کئے تھے۔ لیکن چند در چند مجبوریوں کے باعث وہ مجموعہ شائع نہ ہو سکا۔

اُن خطوں کا ایک حصہ میرے وطن بٹالہ میں رکھا تھا۔ جو ۱۹۴۷ء کے حوادث میں ضائع ہو گیا۔ جو خطوط لاہور میں میرے پاس موجود تھے وہ بھی گردشِ تقدیر کی طرح میرے ساتھ ساتھ گھومتے رہے۔ آج کی صحبت میں مولانا کے آٹھ خطوط ہدیۂ ناظرین کر رہا ہوں جنھیں بہر صورت ایک تبرک کی حیثیت حاصل ہے۔

لندن ـــــ ۴ر اگست ۱۹۶۱ء

بنام پروفیسر سید عبدالقادر ایم۔ اے (مرحوم) سابق پرنسپل و استاذ التاریخ۔
اسلامیہ کالج۔ لاہور۔

سیدی محترمی۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

صحیفۂ گرامی نے ورود ہو کر جس قدر مسرور فرمایا۔ اُس کے اظہار کے لیے بیان کا کوئی پیرایہ ہاتھ نہیں آتا۔ میں عرصۂ دراز سے آپ کے تاریخی سفروں کا حال سُن سُن کر رشک کیا کرتا تھا۔ کہ کاش ٹیکسلا وغیرہ کے سفروں میں مَیں بھی آپ کے زمرۂ تلامذہ میں شامل ہوتا۔ سارناتھ، دہلی۔ بیانہ، سامانہ۔ کوڑہ، جہان آباد، آگرہ، سانچی، ہصدا، رہتانی پت وغیرہ کی سیاحتیں کسی ہم ذوق رفیق کے نہ ہونے کی وجہ سے میرے لیے بہت ہی بے نمک رہیں۔ میں اس حقیقت سے بخوبی آگاہ ہوں کہ آپ کے ہمرکاب رہ کر ایسے تاریخی مقامات کے سفر میں کس قدر زیادہ اپنی پیاس بجھا سکتا اور کس قدر راحتِ روحانی حاصل کر سکتا ہوں۔ آپ نے از راہِ شفقت جس نعمت کے لیے مجھے دعوت دی ہے اُس کے حصول کی خاطر تو میں بڑی سے بڑی قربانی بھی گوارا کر سکتا ہوں۔ لیکن اپنی بدقسمتی کو کیا کروں۔ ذرا میری حالت کا صحیح اندازہ فرما کر کوئی فیصلہ صادر فرمائیے۔ تین چار مہینے سے مسلسل مصروفِ مطالعہ ہوں، نمازِ فجر سے نمازِ مغرب تک ایک نشست میں بیٹھا ہوا کام کرتا ہوں۔ درمیان میں ایک مرتبہ اپنی جگہ سے اُٹھتا ہوں۔ پیشاب کیا، وضو کیا، ظہر و عصر کی نماز جمع کر کے پڑھی۔ نماز پڑھ کر پھر اپنی جگہ پر آیا تو چاء کی ایک پیالی موجود ملی جو صحیح وقت پر تیار کر دی جاتی ہے۔ چاء پی اور تازہ دم ہو گیا۔ یہی دن کا کھانا سمجھ لیجیے یا پینا۔

ان سب کاموں میں پندرہ بیس منٹ سے زیادہ ہرگز صرف نہیں ہوتے۔ پھر اسی طرح مصروف۔ کوئی شخص مجھ سے کلام نہیں کر سکتا۔ میں کسی کو جواب نہیں دیتا۔ بہت سے گہرے اور جانی دوست جو میری نگاہ میں بڑے قیمتی بھی ہیں مجھ سے سخت ناراض ہو گئے کہ وہ ملنے آئے اور میں نے ملنے سے انکار کر دیا۔ اب شہر میں یہ بات مشہور ہو گئی اور کوئی شخص میرے پاس نہیں آتا۔ آئی ہوئی ڈاک کو بمشکل پڑھ لیتا ہوں (ڈاک سے مراد دوستوں کے خطوط ہیں اخبارات نہیں) جواب کسی کو نہیں لکھتا۔ عہدِ ہنود کی تاریخ لکھنا چاہتا ہوں۔ جو تاریخِ ہند کی پہلی جلد ہو گی۔ ہندوؤں کی قدیم مذہبی یا نیم مذہبی قریباً تمام کتابیں اب تک مطالعہ کر چکا ہوں۔ انگریز مؤرخین نے عہدِ ہنود کے متعلق جو کچھ لکھا ہے، اس کا مطالعہ کر رہا ہوں۔ اس کے متعلق سامان کی فراہمی میں مجھ کو غیر معمولی دقتیں پیش آئی ہیں اور روپیہ بھی بہت زیادہ صرف کرنا پڑا ہے ابھی تک مطالعہ ہی کا سلسلہ جاری ہے اور دماغ میں کچھ کچھ صلاحیت پیدا ہو چلی ہے۔ زیادہ اہم اور زیادہ قیمتی کتابوں کو میں نے آخر میں مطالعہ کرنے کے لیے ملتوی رکھ چھوڑا ہے۔ اب اس وقت میری ایسی نازک حالت ہے کہ اگر دو دن کے لیے بھی میں نے اس مشغلے کو ترک کر دیا اور دماغ کسی دوسری دلچسپی سے متاثر ہو گیا تو میرا یہ کئی مہینے کا کیا ہوا مطالعہ سب غارت ہو جائے گا۔ میں یہاں تک احتیاط کرتا ہوں کہ ایک ایک ہفتہ گزر جاتا ہے، رات کے وقت بھی گھر سے باہر نہیں نکلتا۔ کبھی زیادہ تکان محسوس ہوتی ہے تو شام کا کھانا کھانے کے بعد ایک گھنٹہ کے لیے یعنی نمازِ عشا تک کے لیے کسی دوست کے یہاں جا کر بیٹھ جاتا ہوں۔ رات دن دماغ میں ایک خاص قسم کے

خیالات گردش کرتے رہتے ہیں۔ اور یوں سمجھیے کہ دماغ میں کتاب کی تصنیف کا کام جاری ہے اور یہ نہایت اہم کام ہے۔ جس وقت لکھنے بیٹھوں گا تو بہت ہی تھوڑے وقت میں بہت زیادہ لکھ سکوں گا۔ یہ باتیں آپ کے سوا نہ کسی دوسرے کو سنا سکتا تھا نہ کوئی دوسرا سمجھ سکتا تھا۔

میری تجویز یہ ہے کہ آپ اس برسات کے موسم میں اس سفر کو ملتوی رکھیں میں انشاء اللہ تعالےٰ دسمبر تک اپنا کام ختم کر لوں گا۔ اس وقت ہم دونوں ایک پروگرام بنائیں اور ہندوستان کے تاریخی مقامات کا ایک سفر کریں۔ میں اس سفر کے لیے صرف دو سو روپے کا بندوبست کر سکوں گا۔ وقت کم یا زیادہ جس قدر صرف ہوگا آپ کے اختیار میں ہوگا۔ میری طرف سے وقت کے معاملے میں کوئی عذر نہ ہوگا۔ یعنی میں بالکل فارغ ہوں گا۔ اگر آپ اس وقت ان مقامات کو ضرور ہی ملاحظہ فرمائیں گے تو میری استدعا یہ ہے کہ پھر دوبارہ مجھ کو ہمراہ لے کر بھی یہ سفر اختیار کریں۔

مولانا غلام رسول صاحب مہر کی خدمت میں میری طرف سے پیغام پہنچا دیں کہ میرے ہاتھ ایک انگریزی خط آگیا ہے۔ جو ایک انگریز عورت نے کسی انگریز افسر کو لکھا ہے۔ اور اس میں سلطان حیدر علی کے متعلق بعض منصوبوں کا تذکرہ ہے۔ یہ اس زمانے کا لکھا ہوا خط ہے جب کہ سلطان حیدر علی ترچناپلی کو لینے پر مصر تھے یونے دو سو سال کا لکھا ہوا اصل خط ہے۔ کئی ورق پر ہے۔ ایک فائل میں چسپاں ہے۔ پیشانی کی کئی کئی سطروں کے درمیانی حصے میں دیمک نے سوراخ کر دیا ہے۔ جس سے ان سطروں کے ایک ایک دو دو لفظ ضائع ہو گئے ہیں۔ مگر وہ سب پڑھ لئے جا سکتے ہیں۔ اس زمانے میں غالباً بہت سے الفاظ کے ہجے کچھ اور تھے اور اب کچھ

اور ہیں۔ محاورات اور طرزِ نگارش میں بھی فرق ہے۔ خط کی عبارت سے یہ بھی مترشح ہوتا ہے کہ بعض اشارات اور استعارات سے کام لیا گیا ہے جو کاتب اور مکتوب الیہ کے درمیان معہود ذہنی ہوں گے۔ زیادہ غور اور محنت کے بعد اُن استعارات میں بھی معانی پیدا کئے جا سکتے ہیں۔ بہرحال یہ خط اُس زمانے کی اُن تحریروں کا ایک نمونہ ہے جو انگریز سیاسی معاملات کے متعلق ایک دوسرے کے پاس بھیجتے تھے۔ میں خود انگریزی نہیں جانتا۔ کئی بی۔ اے پاس انگریزی خوانوں کو دکھانے کے بعد مذکورہ حالات معلوم ہوئے۔ لیکن اِس خط کا تمام و کمال ترجمہ ابھی تک نہیں ہو سکا تھا۔ میں نے دس بارہ روز ہوئے وہ فائل جس میں وہ خط بھی چسپاں ہے اپنے ایک مخلص بھائی کے پاس جو بی۔ اے علیگ ہیں بھیج دیا ہے۔ وہ اطمینان سے اس کا ترجمہ کریں گے اور میرے پاس بھیجیں گے۔ اگر نہ بھیج چکا ہوتا۔ تو اس وقت آپ کا خط آنے پر آپ کی خدمت میں بھیجتا۔ بہرحال ترجمہ ہو کر آجانے کے بعد مولانا غلام رسول صاحب مہر کی خدمت میں بھیج دوں گا۔ ممکن ہے کہ وہ اُن کے کام آسکے۔ کیونکہ ابھی تک اُن کی کتاب شائع نہیں ہوئی اور اگر شائع ہو چکی ہے تو میں بے خبر ہوں۔ وہ خط تو اُن کے لیے ایک تحفہ ہو گا۔

آپ نے جو مجھ کو یاد فرما کر مفتخر فرمایا۔ اُس کے شکریے میں آپ کے پاس ایک فوٹو بھیج رہا ہوں۔ یہ کتاب کا ایک صفحہ ہے۔ میرے پاس قاسم انوار کا ایک قلمی دیوان ہے جو بہت چھوٹی سی اور غالباً ۲۰×۲۶/۸ تقطیع کی کتاب ہے۔ چمڑے کی جلد ہے اور جلد کا چمڑا کچھ زیادہ خشک و کرخت ہو گیا ہے اس کتاب کے آخر میں ایک صفحہ خالی تھا۔ اُس کورے صفحے پر مرزا عزیز بیگ نے اپنے قلم سے ایک قطعہ لکھا ہے جس کی

نسبت میں نہیں جانتا کس کا ہے۔ لیکن مرزا عزیز کوکہ کے سوادِ تحریر کا نمونہ ہے
حاشیہ پر مرزا موصوف نے اپنے باپ شمس الدین محمد خاں اتگہ کی ایک غزل لکھی ہے
جس کا قلم باریک ہے۔ تاریخوں میں میری نظر سے گزرا ہے۔ کہ مرزا عزیز کوکہ فنِ خوشنویسی
میں ید طولیٰ رکھتا تھا۔ اور میرا خیال ہے کہ ایک تاریخ میں نہیں کئی تاریخوں میں
مرزا عزیز کی خوش نویسی کا ذکر ہے۔ آپ تاریخوں میں وہ فقرے تلاش فرما کر ایک
چھوٹا سا نوٹ یا مضمون لکھ کر کسی مصوّر رسالے میں اس فوٹو کے ساتھ بھجوا سکتے ہیں
میں نے یہ سمجھ کر کہ یہ صفحہ تاریخی حیثیت رکھتا ہے۔ یعنی اس میں مرزا عزیز کوکہ کے
خط کا نمونہ ہے اور شمس الدین محمد خاں اتگہ کی مصنفہ غزل ہے، اس کا فوٹو کھچوا لیا تھا۔
فوٹو میں وہ نشانات بھی موجود ہیں۔ جہاں کیڑے نے تصرف کیا ہے۔ مرزا عزیز نے
تاریخ، مہینہ اور سن بھی لکھ دیا ہے۔ جو آپ فوٹو میں تلاش کر لیں گے۔

آپ جس مصوّر رسالے میں اپنا مضمون اور یہ فوٹو دیں۔ اُس سے یہ شرط ضرور
کر لیں کہ وہ اس فوٹو کو ان لارج کرا کر یعنی بڑا کر کے درج کریں۔ اور ۲۰×۲۶/۸
تقطیع کے قریب قریب اگر یہ فوٹو وسیع ہو گیا تو اصل صفحہ کے حروف اپنی پوری
اور اصلی شان میں نمایاں ہو جائیں گے۔ آپ مناسب سمجھیں تو یہ بھی ظاہر کر سکتے
ہیں کہ اصل کتاب کس جگہ موجود ہے۔ ع

وگرنہ خاطرِ عاشق بہ ہیچ خرسند است

خدا کرے میری طرف سے یہ ناچیز ہدیہ آپ کو پسند آ جائے۔ اور آپ
مجھ سے خوش ہو جائیں۔ آمین۔ اس قدر طویل خط عرصۂ دراز سے کسی کو نہیں لکھا
تھا۔ لیکن آپ نے مجبور کر دیا۔ رسیدِ خط سے جی چاہے تو آگاہ فرمائیں۔ حاضرین

مجلس اور رفقائے سفر کی خدمت میں سلامِ مسنون والسلام مع الاکرام۔

نیاز مند

اکبر شاہ خاں از نجیب آباد۔ یکم اگست ۱۹۳۱ء

(۱)

بنام مولانا نصر اللہ خاں عزیز۔ سابق ایڈیٹر "مدینہ"، بجنور

اخوی، مخدومی، محترمی۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

کل شام کارڈ وردود ہوا۔ آج صبح جواب لکھ رہا ہوں۔ یہ معلوم ہو کر کہ آپ نے اچھرہ میں مکان لے لیا ہے۔ بڑی خوشی حاصل ہوئی۔ میں اب جب کبھی لاہور ایک دو روز کے لیے آؤں گا آپ ہی کے مکان پر قیام کروں گا۔ لاہور میں میرے واقف اور ملنے والے بہت ہیں۔ لیکن اب لاہور کے حالات اس قدر متغیر ہو گئے ہیں۔ کہ میں کسی کے پاس ٹھہرنا مناسب نہیں سمجھتا۔ اگر یہ تغیر حالات نہ ہوتی۔ تب بھی آپ سے زیادہ بلکہ آپ کی برابر بھی کوئی شخص لاہور میں میرا آشنا اور محب نہیں ہو سکتا تھا۔

اس خط کے لکھنے سے پہلے آج صبح کی ڈاک سے آئے ہوئے زمیندار کے شہید نمبر کو پڑھ چکا ہوں۔ شہید نمبر میں آپ نے غضب کا افتتاحیہ لکھا ہے میں اس کو پڑھتے ہوئے بے اختیار رو پڑا اور آنکھوں سے آنسو پونچھتے ہوئے بمشکل آپ کے مقالے کو ختم کر سکا۔ آپ اپنے اس مقالے کو ایک مرتبہ میرے کہنے سے خود بھی پھر پڑھیں۔

پوچھے قاتل زبانِ تیغ سے سب سرگزشت

کشتے کس منہ سے بتائیں کیا ہوا کیوں کر ہوا

زمیندار میں چھپا تھا کہ مولانا ظفر علی خاں صاحب اور ملک لال خاں صاحب

کلکتہ میل سے الہ آباد کی طرف روانہ ہوں گے۔ چنانچہ ۱۷ر جولائی ۱۹۳۶ء کی صبح کو پانچ بجے جب کہ کلکتہ میل نجیب آباد سے گزرتی ہے، نجیب آباد کے خاکساروں کی ایک جماعت جو ۴۵ خاکساروں پر مشتمل تھی، نجیب آباد کے پلیٹ فارم پر موجود تھی۔ مولانا نہیں آئے۔ اور یہ سب لوگ مایوس واپس آئے۔ اس کے بعد ۸ بجے زمیندار کا پرچہ ملا تو اس میں لکھا تھا کہ مولانا معہ رفقاء دہلی کی طرف سے گئے ہیں۔ تب حقیقت معلوم ہوئی۔

فلسطین کانفرنس کا ریزولیوشن تو بہت ہنگامہ خیز ہے۔ کاش اس پر عملدرآمد ہو۔ اور وہی ۱۹۲۱ء والا زمانہ پھر واپس آجائے اور ہندوستان کے مردوں میں جان پڑ جائے۔

آپ جب سے گئے ہیں میرے لیے بجنور ویران ہو گیا ہے۔ آپ کے بعد دو مرتبہ ایک ایک رات کے لیے بجنور جانے کا اتفاق ہوا۔ ایک مرتبہ اچھوتوں کے متعلق ایک خط چھپوانا تھا۔ دوسری مرتبہ کتاب کا ایک فرما چھپوانا تھا۔ دونوں مرتبہ یہ معلوم ہوا کہ فضا بالکل متغیر ہے۔ اور زمین و آسمان بدلے ہوئے ہیں۔ طبیعت کا انقباض اور افسردگی بدستور رہی اور اسی حالت میں واپس آگیا۔ یہ چیز لفظوں میں بیان نہیں ہو سکتی، آپ خود ہی تصور کر سکیں تو کر سکیں۔ دوسری مرتبہ جانے سے معلوم ہوا کہ مولوی محمد عثمان صاحب فارقلیط بھی دہلی تشریف لے گئے۔ اور مجھ کو انتہائی صدمہ ہوا کہ درسِ قرآن بند ہو گیا اور مسجد کے نمازی درسِ قرآن کے لیے بے تاب ہیں اور کسی کو اتنی توفیق نہیں کہ عشا کی نماز مسجد میں پڑھے اور ایک رکوع کا ترجمہ سنا دے۔

اِنا للہ وانا الیہ راجعون۔

پیشہ ور مولویوں کی اسلام دشمنی کا احساس مجھ کو کئی سال سے تھا اور ان کے پیدا کئے ہوئے فتنوں کا سدِّ باب میرے نزدیک خدمتِ اسلام کے اہم و اعظم کاموں میں سے ایک کام تھا۔ چنانچہ میں نے بہت کچھ غور و خوض اور دعاؤں کے بعد اُن کے خلاف قلم اُٹھایا اور اپنے نزدیک اِس طاعون کا بہترین علاج مہیا کر دیا۔ اب اس کے جلد از جلد چھپنے کا آرزومند ہوں۔ لیکن خدا تعالیٰ کی کوئی مصلحت ہے کہ اس میں دیر ہو رہی ہے۔ شیر کوٹ کے ایک کاتب آ گئے تھے۔ اُن کو نصف کتاب کا مسودہ دے دیا تھا انھوں نے ۸۰ صفحے تک دس کاپیاں لکھ دیں۔ اس کے بعد میں نے خود کتابت کا کام ملتوی کر دیا اور بمشکل اُن کی کتابت کا حساب بے باق کر کے کشودِ کار کا منتظر ہوا۔ اِن کاپیوں کو رکھے ہوئے کئی مہینے ہو گئے تھے۔ خیال تھا۔ کہ یہ خراب نہ ہو جائیں۔ چنانچہ پچھلے دنوں دو ابتدائی کاپیاں لے کر بجنور گیا اور صرف ایک فرمہ پر پانسو کی تعداد میں ایک فرمہ چھپوا لایا۔ اور ساڑھے آٹھ روپے کاغذ اور چھپائی کے ادا کر آیا۔ اب یہ ارادہ ہے کہ جب ساڑھے آٹھ روپے ہوئے دو کاپیاں ایوب خاں کے ہاتھ بھجوا دیں اور ایک فرمہ چھپوا لیا۔ اس طرح ان لکھی ہوئی کاپیوں کو تو چھپوانا ہی پڑے گا۔ اور جب خدا کو منظور ہو گا۔ کتاب مکمل ہو کر آپ کے پاس سب سے پہلے پہنچے گی اور آپ اس کو پڑھ کر بے حد مسرور ہوں گے۔ "نظامِ سلطنت" کی نکاسی قطعاً بند ہے اِس جولائی کے مہینے میں تو ایک بھی فرمائش نہیں آئی۔ لیکن خدا تعالیٰ پر سب کچھ روشن ہے۔ وہ سب کچھ دیکھ رہا ہے اور سب کچھ کر سکتا ہے اور ہر شخص کا دل خدا تعالیٰ کی دو انگلیوں کے درمیان ہے۔ جدھر چاہے پھیر دے۔ لہٰذا میں مطمئن اور مسرور ہوں اور گھبراہٹ اور حواس باختگی قطعاً نہیں ہے۔

پُر امید ہوں اور خدائے تعالیٰ کے رحم و کرم کا امیدوار ہوں۔

دہلی آکر اگر بجنور آنے کا قصد ہو تو اپنے بجنور پہنچنے کی تاریخ سے مجھے ضرور مطلع کریں کہ میں بھی بجنور پہنچ سکوں اور پھر آپ کو اپنے ہمراہ نجیب آباد میں لا سکوں۔

بچوں کو دعا اور پیار۔ اور بچوں کی والدہ کی خدمت میں بھی سلام مسنون کے بعد دعاؤں کی استدعا۔ مجھ کو ہمیشہ دعا گو اور دعا جو تصور فرماتے رہیں۔

مجھے توقع ہے کہ آپ لاہور کے مفصل حالات، اپنے عزائم اور تمام ضروری باتوں سے واقف و آگاہ رکھیں گے۔ ایوب خاں اور نجیب آباد کا نوجوان طبقہ آپ کو ہمیشہ محبت سے یاد کرتا ہے اور آپ کا ذکر سب کی مسرت کا موجب ہوتا ہے۔ یاران ہمدم اور دوستان قدیم کو خطوط لکھنے میں کوتاہی سے کام لینا آپ کو کیسے گوارا ہوتا ہے؟ والسلام مع الاکرام۔

اکبر شاہ خاں نجیب آباد

۲۱ جولائی ۱۹۳۶ء

(۲)

اخوی۔ محترمی معظمی۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

میں ہفتہ عشرہ سے ایک اہم تصنیفی کام میں اس طرح مصروف و منہمک ہوں کہ کسی سے بات کرنے یا کسی کی طرف متوجہ ہونے کی مہلت نہیں۔ انشاء اللہ تعالیٰ ایک دو روز میں فارغ ہو جاؤں گا۔ آپ کا حال عرصے سے معلوم نہیں ہوا۔ زمیندار چونکہ کئی مہینے سے میرے پاس نہیں آیا اس لیے آپ کے خیالات سے مستفیض ہونے

کا موقع نہیں مل سکا۔ 'مدینہ' میں مکمل خط و کتابت کا آپ کے ملاحظہ سے گزرنا ضروری تھا۔ وہ 'مدینہ' کے تین مسلسل نمبروں میں ختم ہوئی ہے۔ آپ نے قریب رہ کر جو مذہبی بے اعتنائی ملاحظہ کی ہے، وہ میرے لیے اعلیٰ درجے کی تصدیق اور میرے احساس کی زبردست تائید ہے۔ اطاعتِ امیر کے متعلق آپ کا عقیدہ انشاء اللہ تعالیٰ ضرور بالضرور تبدیل ہو جائے گا۔ مجھے اطمینان ہے کہ آپ میرے ہم خیال ہو جائیں گے۔

کل صبح کی ڈاک سے آپ کا صحیفۂ گرامی وارد ہوا اور کل شام کو بجنور والی گاڑی سے ماسٹر خواجہ مختار احمد صاحب تشریف لائے۔ بات یہ ہے کہ آج صبح ۸ بجے کی ٹرین سے بجنور گئے اور اپنے ہمراہ ایک سو ساٹھ جلدیں نظامِ سلطنت کی جن کی قیمت بحساب ۸ عہ فی جلد چار سو روپے ہوتی ہے لے گئے۔ آپ کا خط ان کو ملاحظہ کرا دیا گیا تھا۔ آپ نے ۱۰۲ جلدوں کا لکھا تھا کہ ان کو سپرد کر دی جائیں۔ انھوں نے ۱۶۰ طلب فرمائیں۔ اور بلا تامل سپرد کر دی گئیں۔ بڑی احتیاط سے ایوب نے دو پلندوں میں ان کو باندھ کر ان کے ہمراہ بار کرا دیا۔ وہ یہاں سے خوش گئے ہیں۔ اور میں نے ان کے ساتھ حتی الامکان وہی برتاؤ کیا، جو میرا فرض تھا۔

میں بجنور جانے کا عزم رکھتا تھا کہ تصنیفی کام شروع ہو گیا۔ اسی میں خبر پہنچی کہ غازی انصاری ادارت سے برطرف ہو گئے۔ اور بدر صاحب جلالی مراد آباد سے بجنور ایڈیٹری پر آ گئے۔ اسی لیے میں نے بجنور جانے میں دانستہ بھی دیر اور تعطیل کو مناسب سمجھا۔ اس لیے کہ وہاں جا کر خواہ مخواہ دونوں فریق کی باتیں سننے

میں کپڑوں کو داغ لگنے کا اندیشہ تھا اور معاملہ جو کچھ ہونا تھا ہو چکا تھا۔ غازی ابھی تک بجنور سے گئے نہیں ہیں وہیں مع عیال مقیم ہیں چند روز کے لیے کہیں سفر میں سنا ہے گئے ہیں۔ واپس آئیں گے۔ بجنور کی پبلک میں اس تغیر و تبدل پر خاص طور سے دلچسپی لی جا رہی ہے۔ مولوی طبقہ غازی کی علیحدگی سے ناخوش ہے۔ یہ سب باتیں مجھ کو رات خواجہ مختار احمد صاحب سے زبانی معلوم ہوئیں وہ یہ بھی فرماتے تھے کہ یہ کسی دیرینہ سازش کا نتیجہ ہے۔ آپ نے اپنے متعلق کوئی تسکین بخش اطلاع نہیں دی۔ میری عقیدت و خلوص کا آپ کو یقین ہے، اس لیے بالطبع آپ کے حالات سے واقف و آگاہ رہنے کی مجھے توقع ہونی چاہیئے۔ آپ نے اس توقع کو کیوں پورا نہیں کیا۔ میں نے رات پہلی مرتبہ خواجہ مختار احمد سے سنا ہے کہ آپ کی نسبت یہ خبر ہے کہ آپ "زمیندار" سے الگ ہو گئے ہیں۔ اس خبر کی تصدیق یا تردید آپ ہی کر سکتے ہیں۔

میری حالت بالکل وہی ہے جیسی آپ چھوڑ گئے تھے۔ اگر آپ وہاں اپنا اخبار نکالنے کا عزم رکھتے ہوں۔ تو پھر جتنی کتابیں چاہیں مجھ سے منگوا لیں وہ سب اخبار کے ذریعے فروخت ہو جائیں گی۔ اگر کسی کتب فروش سے معاملہ ہو سکے تو وہ خود معاملہ طے کر کے کتابیں جس قدر مطلوب ہوں بلا تامل منگوا سکتے ہیں۔ میں آپ کے کاموں کو کامیاب بنانے کے لیے جس قدر استطاعت و طاقت رکھتا ہوں پورے طور پر صرف کر سکتا ہوں۔ آپ کے ساتھ میرا تعلق رسمی و اسمی نہیں ہے بلکہ اسی قسم کا ہے جو دو شریف اور مومن دوستوں میں ہونا چاہیئے۔

آپ کو بذریعہ الفاظ اس بات کا یقین دلانے کی مطلق ضرورت نہیں کہ میں

اور میرا زیرِ اثر حلقہ ہمیشہ آپ کا ذکر محبت و عزت کے ساتھ کرتا۔ اور آپ کی شرافت و محبت کی احتیاط کے ساتھ حفاظت کر رہا ہے۔

محمد ادریس خاں، محمد ایوب خاں، میرے تمام رشتہ دار عورتیں اور بچے تک بھی آپ کو عزت و عظمت کے ساتھ یاد رکھتے ہیں اور احباب کی مجلس میں آپ کا ذکرِ خیر اکثر آجاتا ہے۔

اگر آپ اب بھی روہیلکھنڈ میں قیام فرما کر یہاں کے مسلمانوں کی صحیح رہنمائی فرمانے کی کوئی صورت پیدا کر سکیں تو میرا خیال ہے۔ یہاں آپ کو زیادہ اچھا میدان کام کرنے کے لیے مل سکتا ہے۔ تاہم اپنی تمام مصلحتوں کو آپ ہی سب سے بہتر سوچ اور سمجھ سکتے ہیں۔ اگر خط و کتابت کے ذریعے آپ چاہیں تو لطفِ ملاقات پورا نہیں تو آدھا ضرور حاصل رہ سکتا ہے۔ بچوں کو دعا و پیار۔ بچوں کی والدہ کی خدمت میں سلام مسنون۔ آپ کے تمام دوستوں کو سلام۔ سب سے دعا کی استدعا۔ والسلام مع الاکرام۔

اکبر شاہ خاں۔ نجیب آباد

(۱)

بنام عاشق حسین بٹالوی

اخوی مکرمی۔ السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہٗ

کل آپ کے محبت نامے نے ورود ہو کر میری مسرت اور راحتِ روحانی میں حیرت انگیز طور پر اضافہ کیا۔ آپ کو اگر یہ معلوم ہو جائے کہ آپ کے محبت انتما خطوط مجھ کو کس قدر تقویت پہنچا سکتے ہیں۔ تو آپ مجھ کو جلد جلد خطوط لکھنا ثوابِ عظیم سمجھ کر کبھی اس

معاملے میں کوتاہی نہ فرمائیں۔ محمد اسماعیل خاں صاحب کل مراد آباد چلے گئے تھے۔ آج واپس آجائیں گے۔ باقی احباب کو بھی اُن کے آنے پر ایک ہی مجلس میں آپ کا خط سنایا جائے گا۔ اور شاید آج ہی شام کو ایسا موقع مل جائے گا۔ رات بھی سب احباب جمع تھے۔ مگر میں نے اسماعیل خاں صاحب کے نہ ہونے کی وجہ سے آپ کا خط نہیں سنایا۔ آپ کا ذکر کئی مرتبہ مجمع احباب میں آچکا ہے۔ آپ کا یہ خط پڑھ کر یقیناً سب کے سب بہت ہی خوش ہوں گے۔ حکیم مشیر علی صاحب آج صبح بھی آپ کا ذکر محبت کے ساتھ کرتے رہے۔ اور دسمبر کے مہینے میں آپ کے بلوانے اور شکار کھلوانے کے وہ سب سے زیادہ خواہش مند پائے گئے۔ محمد ادریس خاں آج بحمد اللہ تعالیٰ اچھا ہے۔ مگر ابھی چل پھر نہیں سکتا۔ ضعف اُسی کو بہت ہو گیا ہے۔ والد صاحب بھی بحمد اللہ تعالیٰ اچھے ہیں۔ کچھ بہت ہی معمولی سی شکایت باقی ہے۔ والدہ صاحبہ کو میں پورے طور پر ابھی تک رضامند نہیں کر سکا۔ غلط فہمی کو دور کرنے کی کوشش میں انشاء اللہ کامیابی ہو گی۔ اُن کی ناراضی کے تصور نے میرے اطمینان قلبی اور سکونِ قلب کو بالکل برباد کر رکھا ہے۔ لطف یہ کہ والد صاحب مجھ کو بالکل بے گناہ اور بے خطا سمجھتے ہیں اور میری اس حالت کو قابلِ رحم جانتے ہیں۔

آپ نے اپنے متعلق مجھ سے کچھ استفسار فرمایا ہے۔ اور آئندہ اصولِ کار کے لیے استمزاج کیا ہے۔ میں بھی مسلمان ہوں اور آپ بھی مسلمان ہیں۔ بنابریں میں جو کچھ عرض کروں گا۔ حدیثِ نبوی "المستشار مؤتمن" کو ملحوظ رکھ کر عرض کروں گا۔ اور ایمان و اسلام کے موافق ہی مشورہ دینے کی کوشش کروں گا۔ یہ زمانہ جو آپ پر گزر رہا ہے سعادتِ انسانی اور مقصودِ حیاتِ انسانی کے حصول کی سعی

کا بہترین زمانہ ہے۔ اسی قلیل و عسیر مدت میں آپ کو اپنے مستقبل کی نسبت دستور العمل تیار کرنا ہے۔ اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ اس کام میں آپ کی مدد کرنا بہت بڑے ثواب کا کام ہے۔ اور اسی لیے عرض کرتا ہوں کہ آپ سب کی باتیں سنیں اور عقلمندوں سے مشورے لیں۔ پھر جو اپنی سمجھ میں آئے یعنی جس طرف آپ کی طبیعت زیادہ راغب ہو جائے، قوت اور ہمت کے ساتھ اس پر عامل ہو جائیں میرا یا کسی کا بھی یہ حق نہیں ہے کہ آپ کو مجبور کر سکے۔ ہاں یہ سب کا فرض ہے کہ آپ کے سامنے نیک مشورے اور بہترین تجاویز پیش کریں۔ چنانچہ اسی صورت سے اپنی رائے عرض کرتا ہوں۔ میرے خیالات میں کوئی ترتیب نہیں۔ آپ ان پریشان باتوں کو خود مناسب ترتیب کے ساتھ ذہن نشین کر لیں۔

(۱) جس طرح آج کے اعمال کل کی راحت کا موجب ہوتے ہیں، اسی طرح دنیوی ناپائدار زندگی حیاتِ جاوید اور اخروی دوامی زندگی کی راحت کا سامان ہو سکتی ہے۔ خدائے تعالیٰ فرماتا ہے یا ایھا الذین امنوا اتقوا اللہ ولتنظر نفس ما قدمت لغد (سورہ حشر) اسی مطلب کو کسی نے اس طرح ادا کیا ہے کہ

کیا وہ دنیا جس میں ہو کوشش نہ دیں کے واسطے
واسطے واں کے بھی کچھ یا سب یہیں کے واسطے

پس آپ اپنے لیے کوئی ایسا کام یا طرزِ عمل اختیار نہ کریں جس میں آپ کو دینی اور روحانی ترقی کا موقع نہ مل سکے۔

(۲) دنیا میں والدین آپ کے سب سے بڑے محسن ہیں۔ اُن کے احسانات کو فراموش

کر دینا یا اُن کو ناراض کرنا۔ خدا اور رسولؐ اور دنیا والوں کی نگاہ میں بھی اپنے آپ کو ملزم اور مجرم قرار دینا ہے۔ لہٰذا والدین کے منشا کو پورا کرنا بھی آپ کا اوّلین فرض ہونا چاہیئے۔ لیکن اگر خدانخواستہ والدین کی خواہش آپ کی راحتِ اُخروی اور جہاتِ جاودانی کے منافی واقع ہو تو پھر آپ کو بڑی دقت پیش آئے گی۔ اور آپ کا کام بے حد دشوار ہو جائے گا۔ اُس صورت میں آپ خود بھی والدین کو اپنے حسبِ منشا رضامند کرنے کی کوشش کریں۔ اور اُن کے احباب اور دوسرے عزیزوں سے اِمداد طلب کریں کہ وہ آپ کے والدین کو صحیح اور مفید دارین اصولِ کار پر رضامند کر سکیں۔ انکارِ محض اور خودسری کا اظہار آپ کی طرف سے ہرگز نہیں ہونا چاہیئے۔

(۳) موجودہ تعلیمی سلسلے کا جاری رکھنا اور لاہور میں رہنا آپ کی دماغی نشوونما کے لیے زیادہ موزوں ہو سکتا ہے۔ میرے نزدیک بی اے اور ایم اے تک آپ کو لاہور میں رہ کر تعلیم حاصل کرنی چاہیئے۔ کالج کی تعلیم کے علاوہ لاہور میں ہر قسم کی صحبت آپ کو میسر رہ سکتی ہے۔ اپنا ملک ہے، اپنی معاشرت ہے، اپنی قوم ہے، اپنا مذہب ہے۔ یہاں کی ترقیاں آپ کے اور آپ کے خاندان والوں کے لیے نہایت خوشگوار اور پسندیدہ، نیز توقع کے موافق رہ سکتی ہیں۔ اگر آپ یورپ کے کسی ملک میں چلے گئے تو وہاں یہ تمام چیزیں آپ کے لیے ناپید ہوں گی۔ آپ کتنے ہی بڑے پختہ خیال کے آدمی کیوں نہ ہوں، لیکن اثراتِ ماحول اور وہاں کی معاشرت و مادیت سے متاثر نہ ہونا آپ کے اختیار کی بات نہیں۔ ممکن ہے اور بہت زیادہ ممکن ہے کہ آپ کے یورپ بھیجنے سے جو اُمیدیں آپ کے والدین کی وابستہ ہوں، اُن

میں سے ایک بھی پوری نہ ہو۔ اور آپ وہاں سے کچھ اور ہی بن کر آئیں۔ یہ محض امکانات ہی نہیں ہیں بلکہ فیصدی ۹۰ سے بھی زیادہ نوجوان جو یورپ سے تعلیم پا کر آتے ہیں، اپنے عزیزوں اور ملک والوں کے لیے غیر مفید ثابت ہوتے ہیں جس کا بڑا سبب یہی ہے کہ وہاں کی معاشرت اور صحبتوں پر تنہا ایک ایشیائی طالب علم کا غالب آنا معلوم!

(۴) اگر آپ روپیہ کمانا چاہتے ہیں تو اس کے ساتھ ہی شہرت و عزت کی بھی آپ کو خواہش ہونی چاہیئے۔ کیونکہ تنہا روپے کا زیادہ ہونا ہرگز انسانی شرافت کا نشان نہیں۔ آپ خود ہی غور فرمالیں کہ آپ کے گرد و پیش کیسے کیسے مالدار لوگ موجود مل سکتے ہیں جن کو آپ ہرگز اپنے سے بہتر نہیں سمجھتے۔ حالانکہ آپ کے پاس اتنا روپیہ نہیں ہے۔ پس روپیہ اگر کمانا چاہتے ہیں تو لوہار، بڑھئی اور موچی بن کر نہ کمائیں۔ بلکہ ایک عالم، فاضل اور محبوب خلائق بن کر کمائیں محض مثال کے طور پر عرض کرتا ہوں کہ میں نے ملک کے کم سے کم بیس پچیس مشہور صاحب نظر لوگوں سے دریافت کیا ہے۔ اور سب نے اس ضرورت کو تسلیم کیا ہے کہ انگریزی زبان میں جس قدر علوم و فنون موجود ہیں۔ ان کو اردو جامہ پہنانے کی سخت ضرورت ہے اور تمام ملک میں انگریزی کتابوں کے ترجموں کی پیاس موجود ہے مگر افسوس ہے کہ آج تک کسی ایک شخص نے بھی اپنی زندگی کو اس کام کے لیے وقف نہیں کیا اور یہ کام سو حصوں میں ایک حصہ بھی نہیں ہوا۔ حالانکہ جو شخص اس طرف متوجہ ہوگا۔ وہ ایک ڈپٹی کمشنر کی تنخواہ سے زیادہ روپیہ یقیناً کما سکے گا۔ اسی طرح اور سیکڑوں باعزت اور مفید ملک و قوم نیز بلا ضرر مشاغل

ایک ذہین آدمی تلاش کر سکتا ہے۔ اندریں صورت آپ کا بی اے اور ایم اے تک مصروفِ تعلیم رہنا زیادہ مفید اور موزوں ہے۔

(۵) نوکری خواہ ڈپٹی کلکٹری ہو یا ڈپٹی کمشنری، میرے نزدیک آپ کی اُمید گاہ نہ ہونی چاہیئے۔ اس لیے نہیں کہ ملک کی موجودہ سیاسی تحریکات کا یہ منشا ہے، بلکہ اس لیے کہ نوکری اور غلامی ایک ہی چیز کا نام ہے۔ تجارت کو میں ایک شریف پیشہ سمجھتا ہوں اور وہ مسلمانوں کے لیے شریعت کا بھی مجوزہ پیشہ ہے۔ اُسی کے ذریعے آپ یورپ و امریکہ تک کا بھی سفر کریں تو مناسب اور شایاں ہے لیکن آپ کی طبیعت اس طرف راغب نہیں۔ لہٰذا آپ فی الحال ان تمام باتوں کو نظر انداز کر دیں۔ اور اُن کے متعلق کچھ بھی نہ سوچیں۔ جہاں تک اور جب تک آپ کو موقع ملے تحصیلِ علم میں کوشاں رہیں۔ اور صرف یہ ارادہ رکھیں کہ ہماری زندگی علمی و مذہبی زندگی ہونی چاہیئے۔ بس!

اگر مجھ کو یہ معلوم ہو جائے۔ کہ آپ اپنے متعلق لاہور رہ کر ایم۔ اے پاس کرنے کا فیصلہ کر چکے ہیں، تو پھر میرے لیے نجیب آباد چھوڑ کر لاہور چند سال کے لیے آجانے کا مسئلہ قابلِ غور ہو جائے گا اور بہت زیادہ ممکن ہے کہ میں مع عبرت لاہور چلا آؤں۔ میں اس بات سے واقف ہوں کہ میرے لاہور آکر قیام کرنے کی صورتیں بآسانی پیدا ہو سکتی ہیں اور میں وہاں خوش باش زندگی بسر کر سکتا ہوں۔ لیکن یہ سچ ہے کہ میں نے اب تک ایسا نہیں چاہا تھا۔ اور نہ مجھ کو نجیب آباد چھوڑنے کی ضرورت لاحق ہے۔ مگر میں یہ ثابت ضرور کرنا چاہتا ہوں کہ آپ سے جو تعلق خاطر ہے۔ وہ اس قدر زبردست ہے کہ میں اس کام پر بھی آمادہ ہو سکتا

ہوں۔ میں نے اپنے دوستوں کے لیے اِس سے پہلے بھی کئی مرتبہ اسی قسم کی اور اس سے بھی زیادہ اہم تبدیلیاں اپنی زندگی میں پیدا کر لی ہیں۔

پرسوں ایک لفافہ بھیج چکا ہوں۔ یقین ہے ملاحظے سے گزر چکا ہوگا۔ ڈاکٹر اقبال[1] صاحب سے اگر آپ ملے ہوں تو اُس ملاقات کی کیفیت اور مکمل روئداد سے مجھ کو ضرور مطلع فرمائیں۔ اُن سے اتوار کے دن یا کسی تعطیل کے دن آپ ملیں تو زیادہ اچھا ہے۔ ایک مرتبہ وہ نہ ملیں تو اُن کے آدمی سے ملاقات کا موزوں وقت معلوم کر کے دوسری مرتبہ جائیں۔ اور پھر انھیں سے صحیح اوقات ملاقات کے معلوم کر لیں اگر ضرورت ہوگی تو میں اور بھی کوئی عریضہ اُن کو لکھ دوں گا، ورنہ پھر خود لاہور پہنچوں گا۔

والد صاحب کی خدمت میں سلام و نیاز۔ بھائی ذوالقرنین صاحب کو آداب۔ مجھ کو ڈاکٹر سید محمود صاحب سابق سیکرٹری مرکزی کانگرس کمیٹی۔ حال اسیر فرنگ نے بکسر جیل سے خط لکھا ہے۔ وہ ۹ اکتوبر کو رہا ہوں گے۔ اُن کی خواہش ہے کہ میں ۸ یا ۹ اکتوبر کو پٹنہ پہنچ جاؤں اور اُن سے ملوں۔ وہ جیسا کہ آپ کو معلوم ہے، جیل میں میرے مضمون آئینۂ حقیقت نما کا ترجمہ کرتے رہے ہیں اور اس مضمون کو مجھ سے مکمل کرانا چاہتے ہیں۔ میں اگر پٹنہ گیا تو آپ کو مطلع کروں گا اور آپ کے بھائی صاحب سے بھی ملنے کی کوشش کروں گا جو دانا پور میں ہیں اُن کے پاس رسالہ بھیج دیا گیا ہے۔ میرا پٹنے جانا ابھی یقینی نہیں ہے۔ پرسانِ حال کی خدمت میں میرا سلام

اکبر شاہ خاں از نجیب آباد

---

[1] علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ

(۲)

اخوی، مکرمی معظمی - السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

گرامی نامہ وارد ہوا - بے حد مسرور فرمایا - سرکاری شفاخانے کے ڈاکٹر صاحب نے اب سے ایک گھنٹہ بعد غریب خانے پر آنے کا وعدہ فرمایا ہے - میں اُن کا انتظار کر رہا ہوں اور اس وقفے میں آپ کو یہ خط لکھنے بیٹھا ہوں - میری داستانِ غم اس طرح ہے کہ گزشتہ دو مہینے والد صاحب سخت علیل رہے اور میرے تمام مشاغل نوشت و خواند کے ترک ہو گئے - رات دن اُن کی تیمارداری میں مصروف و پریشان رہا - اُن کو دو ہفتے ہوئے افاقہ بلکہ آرام ہو گیا - اب صرف ضعف باقی ہے میری چھوٹی ہمشیر کے داہنی بغل کی جانب دو ہفتے ہوئے پستان میں سرطان نمودار ہوا - سرطان جو عموماً عورتوں کے اسی مقام میں نمودار ہوتا ہے، مہلک مرض ہے - عام طور پر یہی مشہور ہے کہ اس سے جاں بری دشوار ہے شفاخانے کے ڈاکٹر صاحب جو اپنے فن میں بہت ہوشیار اور میرے دوست ہیں مجھ سے حالات سن کر اس بات پر مصر ہوئے کہ بلا توقف چھاتی کاٹ کر پھینک دی جائے - یہ علاج بھی اصل مرض سے کچھ کم خطرناک نہیں تھا - ادھر مریضہ کو اس بات سے قطعاً انکار تھا کہ میں مقامِ ماؤف کسی غیر مرد کو دکھاؤں - میں نے اور تمام عزیزوں نے سمجھایا کہ جان کا خطرہ ہے اس حالت میں ڈاکٹر کو پوری احتیاط سے دکھانا ہر طرح جائز ہے - مگر وہ نہ مانی - آخر میں نے لکھنؤ شفاء الملک عبد الحمید صاحب کی خدمت میں تفصیلی حالات لکھ کر بھیجے - انھوں نے فوراً جواب دیا کہ بلا توقف عملِ جراحی ہونا چاہیے ورنہ جان کا بچنا دشوار ہے - اس جواب کے آنے سے ہمارے گھروں میں ایک کہرام مچ گیا - آخر سب نے مل کر مریضہ کو بمشکل رضامند کیا - ادھر ڈاکٹر صاحب سے عرض کیا گیا کہ تمام بہتر سے بہتر سامانِ جراحی

لے کر پوری احتیاط کے ساتھ غریب خانے پر آکر عمل جراحی کریں۔ اُن کو بہت بڑی
رقم اس کام کو حسن و خوبی کے ساتھ انجام دینے کی غرض سے دی گئی۔ آج کا چوتھا
روز ہے کہ انھوں نے مقامِ اوف کا معائنہ کیا اور چھاتی کاٹ کر پھینک دینے
کی بجائے شگاف دے کر کینسر کے منجمد مادے کو جو چار چھٹانک کے قریب تھا
نکال ڈالا اور اپنا یہ کام ٹیری ہی ہوشیاری اور احتیاط کے ساتھ انجام دیا۔
مریضہ پہلے ہی بہت کمزور اور ضعیف تھی۔ اس لیے اس بات کا سخت خطرہ تھا کہ
کہیں عمل جراحی کے دوران میں اُس کی رُوح قالب سے پرواز نہ کر جائے۔ خدائے
تعالےٰ کا شکر و احسان ہے کہ اب حالت اطمینان بخش ہے۔ ڈاکٹر صاحب روزانہ
آکر زخم کا معائنہ کرتے، دواؤں کے پانی سے دھوتے اور مرہم وغیرہ لگاتے ہیں۔
اُن کے بعد زخم پر پٹیاں وغیرہ میں خود اپنے ہاتھ سے اُن کے جانے کے بعد باندھتی
ہوں۔ گویا کمپونڈری کا کام مجھ کو کرنا پڑ رہا ہے۔ زخم کی حالت رُو بہ اصلاح ہے
اور کل ڈاکٹر صاحب نے خطرہ سے نکل جانے کی خوش خبری سُنا دی ہے۔ اسی سلسلے
میں اس وقت اُن کی آمد کا منتظر ہوں۔ اپنے متعلق تفصیلی حالات اس کے بعد
کسی عریضے میں لکھوں گا۔ الحمد للہ علیٰ کُلِّ حال۔

مجھ کو سب سے زیادہ خوشی اس بات سے ہوئی ہے کہ آپ نے والد صاحب کی
کتب بینی اور گگے زئی قوم کی تاریخ لکھنے کا تذکرہ کیا ہے منشی سبحان رائے بھنڈاری
بٹالوی کی کتاب موسومہ "خلاصۃ التواریخ" بڑی بے نظیر اور ہندوستان کی نہایت
قیمتی اور نایاب کتابوں میں سے ایک ہے۔ یہ کتاب اس لیے اور بھی زیادہ قیمتی ہے
کہ مسلمان مورخ ہندوستان کی اسلامی تاریخ لکھتے ہوئے بجائے اس کے کہ تاریخ فرشتہ

اکبر نامہ، تاریخِ بدایونی وغیرہ مسلمانوں کی لکھی ہوئی کتابوں سے حوالے دے اس کتاب سے جو ایک ہندو کی لکھی ہوئی ہے حوالے دے کر اپنے مضمون کو زیادہ قابلِ قبول بنا سکتا ہے۔ ایسی ہی ایک کتاب عمدۃ التواریخ مصنفہ سوہن لال ہے جو مہاراجہ رنجیت سنگھ کے مصاحب تھے۔ خلاصۃ التواریخ کا ایک نسخہ سرہند میں ہے جو وہاں کے ایک رئیس سید حسن شاہ مرحوم کے کتب خانے میں ہے ایک نسخہ خلاصۃ التواریخ کا سینٹ اسٹیفن کالج دہلی کی لائبریری میں بھی ہے۔ میرے پاس جو نسخہ خلاصۃ التواریخ کا ہے، اس کے متعلق شاید مجھ کو بعض مقامات پر تصحیح اور مقابلے کی ضرورت پیش آئے گی۔ اس لیے یہ بہت ہی اچھا ہوا۔ کہ آپ نے اس کتاب کے بٹالہ میں موجود ہونے کا مجھ کو پتہ بتا دیا۔ میں انشاءاللہ تعالےٰ کسی وقت محض اسی کام کے لیے بٹالہ حاضر ہوں گا۔

آپ براہِ خدا والد صاحب کو ککے زئی قوم کی تاریخ یا تاریخ کے کم از کم نوٹ لکھنے۔ اور اس کام کو جہاں تک ممکن ہو پورا کرنے کی ترغیب دیتے رہیں۔ اور ضرورت ہو تو میری جانب سے بھی عاجزانہ و خوردانہ التجا پیش کر دیں۔ تاریخ ہند کا کام میں پوری سرگرمی اور انہماک کے ساتھ شروع کرنے والا ہوں۔ میں نے ارادہ کیا ہے کہ ایک جلد میں محض اقوام کی تاریخ لکھوں۔ کیونکہ یہ کام ابھی تک کسی نے انجام نہیں دیا۔ اسی لیے میں نے بہت سے بزرگوں سے الگ الگ اُن کی اقوام کے تاریخی حالات جمع کرنے کی فرمائش عرصہ سے کر رکھی ہے۔ میرے لیے یہ بات موجبِ فخر ہوگی کہ ککے زئی قوم کی تاریخ آپ کے والد ماجد مدظلہ کی لکھی ہوئی ہو۔ وہ اگر پسند فرمائیں گے تو میں اُن کی تحریر بلا کم و کاست حرف بحرف انجیر کے نام سے اپنی

تاریخ کا جزو بنا دوں گا۔ اور اس میں مجھ کو بڑی آسانی ہوگی۔ اور اگر انھوں نے صرف نوٹ اور اشارات ہی لکھے۔ تو اس حالت میں میں خود اُس کو مسلسل اور مرتّب کر دوں گا اور واضح الفاظ میں اِس کا اظہار کر دوں گا کہ یہ تمام حالات کن بزرگ کی مہربانی و کرم نمائی کے طفیل مجھ کو معلوم ہو سکے۔

رسالہ کے اِجرا کی خوش خبری کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ وہ رسالہ جس کے آپ ایڈیٹر ہوں میرے لیے کیسی محبوب چیز ہوگی۔ اِس کا اندازہ آپ خود ہی فرما سکتے ہیں۔ میں اگر آپ کے یا آپ کے رسالے کے کسی کام آسکوں تو یہ میری خوش نصیبی اور دلی مسرت کا موجب ہوگا۔ مگر مجھ کو اس میں شک ہے کہ میں کوئی خدمت بجا لا سکوں گا یا نہیں۔

دریں تعلیم شد عمر و ہنوز ابجد ہمی خوانم
خدایا کے سبق آموز خواہم شد بدیوانش

اوّل اوّل جی چاہا کرتا تھا کہ رنگین و شگفتہ و پختہ اُردو لکھوں۔ لیکن جب یہ کام میرے بس کا روگ ثابت نہ ہوا۔ تو اب نہ کوشش ہے نہ خواہش۔ وہ چیز جو جوش جوانی کے ہم عناں پائی جاتی تھی۔ جوانی کے ساتھ ہی غالباً رخصت ہو چکی ہے۔ اب نہ جوش ہے نہ خروش۔ نہ آشفتہ مزاجی ہے نہ مشکل پسندی۔ عشق و دیوانگی اب محبت و مروّت سے تبدیل ہو گئی ہے۔ آہ و نالہ ہچکیوں سے تبدیل ہو کر خموشیٔ مرگ بننے پر آمادہ ہے۔ کسی زمانے میں سعدی شیرازی پر ہنسا کرتے تھے جنھوں نے لکھا تھا کہ ؎

چناں قحط سالی شد اندر دمشق
کہ یاراں فراموش کردند عشق

اب اپنے ہنسنے پر ہنستا ہوں کہ قحط سالی کے شدائد میں مبتلا ہوئے بغیر ہی نہ کسی کے تبسم سے بجلیاں گرتی ہیں، نہ کسی کی چال سے فتنے برپا ہوتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ پہلے ساری دنیا رقیبوں سے آباد و معمور نظر آتی تھی۔ اب کوئی رقیب کہیں نظر نہیں آتا۔ پہلے مشاعروں کی مجلس میں پیش پیش اور نمایاں رہنے کو جی چاہتا تھا اب یہ حالت ہے۔ کہ ایس پی ایس کے ہال سے آپ کی بھی مفارقت گوارا کر کے بھاگ آیا اور طوطیانِ خوش گفتار کے نغمے تادیر نہ سن سکا۔ آپ خود ہی غور فرمائیں کہ ایک افسردہ دل سے کسی ادبی رسالے کے لیے کیا خدمت انجام پذیر ہو سکتی ہے۔ ہاں! لفظ "رسالے" میں میرے لیے ایک کشش ضرور ہے۔ جی چاہتا ہے۔ کہ سلطان سلیمانِ اعظم عثمانی کے ترتیب دیئے ہوئے رسالے کی مانند سفید ریش لوگوں کا کوئی رسالہ ہو اور میں بھی ایک سوار کی حیثیت سے اس میں بھرتی ہو جاؤں میدانِ جنگ میں اعلاءِ کلمۃ اللہ کے لیے کفار سے لڑتا اور حملہ آور ہوتا ہوا جامِ شہادت نوش کروں۔ میرا سر خدا کی راہ میں کٹے اور گھوڑوں کی ٹاپوں میں فٹ بال کی طرح ادھر سے اُدھر لڑھکتا ہوا پھرے۔ میری لاش گھوڑوں کے سموں میں کچل کر قیمہ قیمہ ہو جائے اور چیل کوؤں کی غذا بن کر اپنے بعد کوئی قبر بھی اپنی یادگار نہ چھوڑوں۔ تاکہ گورپرستوں کو کوئی قبہ بنانے کا موقع بھی نہ مل سکے۔ اگر اس شوقِ شہادت کو پورا کرنے کی توقع آپ دلائیں تو رسالہ نہ سہی پلٹن ہی سہی۔ میں پیدل بھی خدا کی راہ میں خوب کام کر سکوں گا۔ آپ اگر مان جائیں تو میرا مشورہ یہی ہے کہ ؎

در محفلِ خود راہ مدہ ہیچو منے را
افسردہ دل افسردہ کند انجمنے را

اور اگر نہیں مانتے۔ تو ایسا نہ ہو کہ مجھ کو اپنا یہ شعر دوبارہ سنانا پڑے۔

ہم نہ کہتے تھے نہ چھیڑو دیدۂ خونبار کو

اب تو تم دیکھو گے ساری بزم بہہ جانے کو ہے

بھائی ذوالقرنین صاحب مجھ کو بہت ہی یاد آتے ہیں۔ آپ میرا سلام اس انداز اور ایسے موقع سے اُن کی خدمت میں عرض کریں کہ اُن پر میرے صحیح اور سچے جذبات منکشف ہو جائیں۔ حضرت والد صاحب قبلہ کی خدمت میں مؤدبانہ التماسِ دُعا۔ مجھ کو اس بات کا کامل یقین ہے کہ وہ مجھ سے بہت محبت کرتے ہیں۔ اور اسی لیے اگر وہ چاہیں تو اپنی دعاؤں سے مجھ کو بہت فائدہ پہنچا سکتے ہیں۔ سید تصدق حسین صاحب حیرت کے کتب خانے کی تاریخی کتابوں کی فہرست لکھ کر اگر میرے پاس بھجوا سکیں تو مجھ پر بڑا احسان ہو۔ والسلام مع الاکرام

اکبر شاہ خاں از نجیب آباد

(۳)

اخوی محترمی! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

میں قریباً ایک یا ڈیڑھ مہینے سے تاریخ ہند کی تالیف و ترتیب و تہذیب و تدوین میں ہمہ تن مصروف ہو چکا ہوں۔ اس کام کو شروع سے باترتیب انجام تک پہنچانا چاہتا ہوں۔ اس لیے فی الحال عہدِ ہنود سے متعلق پہلی جلد زیرِ تالیف ہے میں نے اس مصروفیت کے سبب دوستوں کو خطوط لکھنا ترک کر دیا ہے۔ دوستوں کے آئے ہوئے خطوط کا جواب بھی نہیں دیتا۔ آئے ہوئے خطوط کو بمشکل پڑھ لیتا ہوں۔ اور کوئی بہت ضروری خط ہو تو محمد ایوب خاں اپنے ہمشیرہ زادہ کو دے دیتا ہوں کہ

اس کا جواب لکھ دو۔ نمازِ فجر کے بعد قرآنِ مجید کا ایک پارہ ضرور اور لازماً پڑھتا ہوں اس کے بعد طلوعِ آفتاب کے قریب سے غروبِ آفتاب کے بعد تک کہ مساجد میں نمازِ مغرب کی اذانیں ہونے لگتی ہیں مسلسل لکھنے یا پڑھنے میں مصروف رہتا ہوں۔ دن کا کھانا اس لیے خود بخود قریباً ترک ہو گیا کہ نہ مجھ کو کھانے کی فرصت اور نہ ایسے شخص کے لیے جو مسلسل دماغی کام میں مصروف ہو، معدے میں کھانے کا بوجھ ہونا مناسب، میرے چاروں طرف کتابوں کے ڈھیر لگے ہوئے ہیں اور ہر روز ان ڈھیروں میں علی الصباح اور اضافہ کرنا پڑتا ہے۔ دنیا و مافیہا سے بے خبر ہوں کبھی دس کبھی پندرہ منٹ کے لیے اخباروں کی سرخیوں پر نظر ڈال لیتا ہوں جمعہ کے دن جامع مسجد کے علاوہ، کوئی شخص مجھ کو دن کے وقت مکان سے باہر نہیں دیکھ سکتا۔ اس سچی روداد کے بعد آپ کو یہ سن کر خوش ہونا چاہیئے کہ آج آپ کے خط کو میں نے بغور اور بشوق بالاستیعاب مطالعہ کیا۔ اور اپنے تمام ضروری اور محبوب مشاغل کو ترک کر کے آپ کو جواباً یہ خط لکھنا ضروری سمجھا۔ آپ نے مجھ سے میرے مشاغل کی نسبت بھی دریافت فرمایا تھا۔ اس لیے اوپر کی تمہید آپ کی ایک بات کا جواب بھی ہے۔

آپ کی تحریر ہمیشہ میری دلی مسرت اور انبساطِ روحانی کا سبب ہوتی ہے۔ میں اپنی اس کامیابی پر خوش ہوں۔ کہ میرے شکوہ آمیز فقرے جو میں نے آپ کی نسبت دوسروں کو لکھے تھے، آپ سے ایسا پیارا اور دل میں بٹھا لینے اور سینے سے لگا لینے کے قابل خط لکھا سکے۔ آپ کے ادائے بیان کی خوبی اور آپ کی رنگین نوائی کا مرتبہ اب اس قدر بلند ہو چکا ہے کہ میں بجا طور پر کہہ سکتا ہوں کہ

فغاں کہ نیست مرا طاقتِ ثنا خوانی

بجائے خویش فرو ماندہ ام ز حیرانی

شعر لکھنا اور اچھا شعر لکھنا آسان، مقفیٰ اور مسجع نثر لکھنا آسان، محاورات و کنایات و تلمیحات کو خوبی کے ساتھ استعمال کرنا آسان، لیکن ایسا خط لکھنا جو اس وقت میرے سامنے ہے۔ اور جس کو میں ابھی پڑھ چکا ہوں مشکل ہے اور نہایت مشکل۔ حالانکہ میں جانتا ہوں کہ آپ نے قلم برداشتہ لکھا ہے۔ میں لاہور کے قریباً تمام انشاء پردازوں، ادیبوں، شاعروں اور زبان دانی کے مدعیوں کو جانتا ہوں اور ہر ایک کی نسبت اندازہ ہے کہ کون کتنے پانی میں ہے اور کن کن اسباب کی بنا پر کتنی کتنی شہرت کا مالک ہے۔ میرا خیال ہے کہ آپ کے مرتبے کو کوئی نہیں پہنچ سکتا۔ اور مجھے تعجب ہے کہ آپ کو دنیائے ادب اور اقلیم زبان دانی اور انشاء پردازی کا بادشاہ اب تک کیوں نہیں مانا گیا۔ اور مانا گیا ہے تو میں اب تک کیوں مطلع نہ ہوا۔ آپ یقین رکھیئے کہ آپ کی اس ترقی و کامرانی سے خوش ہونے والا مجھ سے بڑھ کر دنیا میں کوئی دوسرا شخص نہیں ہو سکتا۔ ہرگز نہیں ہو سکتا۔ میں اس وقت کو یاد کرتا ہوں جب کہ میں نے پہلی مرتبہ آپ کو طالب علمی کی حالت میں دیکھا۔ اور آپ کے صحیح ادبی مذاق کا اندازہ کر کے یہ خیال کیا کہ یہ جوہر قابل عالی و آزاد کی یاد تازہ کر سکتا ہے۔ میری روح اس وقت آستانہ الٰہی پہ سجدات شکر بجا لا رہی ہے۔ کہ میرا خواب نہ صرف سچا ثابت ہوا بلکہ توقع سے بڑھ کر مثمر ثمرات خیر ہوا۔

آپ سے زیادہ میرے خیالات و جذبات کا واقف دوسرا نہیں ہو سکتا۔ آپ

کو معلوم ہے کہ خوشامد اور سخن سازی میری عادات میں داخل نہیں۔ آپ کے منہ پر
پر آپ کی تعریف کرنا مجھ کو بالطبع گراں گزر رہا ہے۔ لیکن آپ کو آپ کی طاقت سے
آگاہ کرنا اور میدانِ مسابقت میں سب سے آگے بڑھ سکنے کی آپ کو سچی توقع دلانا
بھی میرے نزدیک نہایت ضروری کام تھا۔ اور اسی لیے مجھ کو وہ سب کچھ آپ سے
کہنا پڑا، جو دوسروں کو بتانا میرے لیے زیادہ مناسب تھا۔

میں نے آپ کے خط کے ایک ایک فقرے پر غور کیا۔ کہ آیا اس مضمون کو جس
کا یہ فقرہ حامل ہے اس سے بہتر دوسرے فقرے میں ادا کیا جا سکتا ہے یا نہیں۔
بلا تصنع عرض کرتا ہوں کہ جس قدر زیادہ غور کیا۔ اسی قدر زیادہ آپ کی قادر الکلامی
کی عظمت میرے دل پر طاری ہوتی چلی گئی۔ میرا دل خوشی سے لبریز ہے میری
زبان پر الحمد للہ جاری ہے اور میرے بازوؤں میں ایک نئی طاقت محسوس ہو رہی
ہے جو کسی قوتِ بازو بھائی کی موجودگی میں ہو سکتی ہے۔

حضرت والد صاحب قبلہ کی خدمت میں میرا سلام و نیاز پہنچائیے۔ اور ممکن ہو
تو یہ عریضہ ہی اُن کے ملاحظہ سے گزار دیجیے۔ وہ یقیناً اس کو پڑھ کر خوش ہوں گے
کہ یہ تحسین ناشناس نہیں ہے۔

آپ کے گرامی نامہ میں غلام محمد صاحب قدرتِ ثانی کا ذکر پڑھ کر غلام محمد
صاحب کی صورت میری آنکھوں میں پھرنے لگی۔ یہ خبر تو بڑی دلچسپ اور عجیب و غریب
ہے۔ خدا جانے کتنے سال گزر گئے کہ اُن لوگوں سے نہ سلام ہے نہ پیام ہے
نہ دشنام۔ آج برسوں کے بعد آپ کے خط کی چند سطروں نے وہاں کا نقشہ
پیشِ نظر کر دیا۔ قدرتِ ثانی صاحب کے دعاوی اور اُن کے انکشافات اگر زیادہ

دلچسپ ہوں تو مجھ کو بھی آگاہی کا موقع دیں ورنہ خیر۔

آپ کا کثیر المشاغل ہونا خدائے تعالےٰ کی ایک رحمت ہے۔ اور خدا کا شکر ہے کہ آپ بھی اس کو اچھا جانتے ہیں۔ مجھ کو اپنے حالات اور خیریت سے کم از کم ماہانہ آگاہی بخشا کریں۔ میں اگر کبھی لاہور آؤں گا۔ تو صرف آپ کی وجہ سے آؤں گا۔ مجھ کو یاد کرنے والوں اور مجھ سے محبت رکھنے والوں کو میری سچی محبت کا یقین دلا دیجئے۔

آئینۂ حقیقت نما جلد اوّل کا دوسرا ایڈیشن چھپ رہا ہے۔ چند چھوٹے چھوٹے تاریخی رسالے بھی میں نے پریس میں چھپنے کے لیے بھیج دیئے ہیں۔ بعد تیاری ہر ایک چیز آپ کی خدمت میں ضرور پہنچے گی۔ دو چھوٹے چھوٹے رسالے اس خط کے ہمراہ بھجوا رہا ہوں۔ والسلام مع الاکرام۔[1]

اکبر شاہ خاں نجیب آباد

(۴)

اخویم مکرم معظم۔ السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ

آج ابھی گرامی نامہ وارد ہوا۔ اور آنکھوں کو روشنی اور دل کو ٹھنڈک

---

[1] کچھ یاد نہیں میں نے مولانا کو کیا لکھا تھا۔ جس کی اس قدر تعریف فرمائی گئی ہے۔ مولانا کا قاعدہ تھا۔ کہ اپنے نیازمندوں کی حوصلہ افزائی اور دلداری میں بڑی فراخدلی اور فیاضی سے کام لیتے تھے۔ اس گرامی نامہ میں بھی انھوں نے مجھ کج مج زبان کی تحریر کی جو تعریف کی ہے اس میں سراسر یہی فیاضی کا جذبہ کارفرما ہے۔ ورنہ میں تو اس ایک لفظ کی برابری کا دعوےٰ نہیں کر سکتا جو مولانا کے قلم سے سہواً نکل جاتا تھا۔

حاصل ہوئی - میں خود آپ سے زیادہ اس بات کو محسوس کر رہا ہوں کہ ملاقات و مکالمت کو طویل مدت گزر گئی - آپ کی صورت آنکھوں میں پھرتی اور آپ کی آواز کانوں میں گونجتی رہتی ہے - انگلستان کا احرام باندھنے سے پہلے دو ہفتے قبل مجھ کو ضرور اطلاع ملنی چاہیئے اور اگر تاریخ روانگی مقرر ہو چکی ہے - تو فوراً مطلع فرمایا جاوے -

اس عریضے کے ہمراہ کتاب نظام سلطنت کا ایک رجسٹرڈ پیکٹ خدمت مبارک میں روانہ کر رہا ہوں - پیکٹ کئی ہفتے سے بنے ہوئے رکھے ہیں - ہر روز دس پندرہ پیکٹ روانہ کر دیتا ہوں - آپ کا پتہ معلوم ہونے پر آپ کے نام بلا توقف بھیج دیا گیا اس کتاب کے ملاحظہ فرمانے کی فرصت غالباً آپ کو اپنی اہم مصروفیتوں کے سبب نہ ہوگی - لیکن میں آپ کی کم فرصتی کا اندازہ کر لینے کے بعد بھی آپ سے فرمائش کرتا ہوں - کہ آپ اس کتاب کو بالاستیعاب ملاحظہ فرما لینے کے بعد اس پر ایک ریویو لکھ کر رومان میں یا کسی اور رسالے یا اخبار میں شائع فرما دیں - یا اپنا ریویو لکھ کر میرے پاس بھجوا دیں کہ میں خود اس کو کسی اخبار میں شائع کرانے کا بندوبست کروں گا - اگر آپ کسی اخبار یا رسالے میں شائع کرا سکیں - تو اس اخبار یا رسالے کا نام و نمبر و تاریخ مجھے لکھ بھیجیں یا وہ نمبر میرے پاس بھجوا دیں - یہ ایک امداد و اعانت ہے - جو میں اپنے کام میں آپ سے حاصل کرنا چاہتا ہوں - اور اس کو اپنا ایک حق سمجھ کر آپ سے مطالبہ کیا ہے -

اس کتاب کے پڑھنے سے آپ کو میرے حالات و خیالات و جذبات کے متعلق اس قدر صحیح اور وسیع واقفیت حاصل ہو جائے گی - کہ شاید بہت سی ملاقاتوں کے بعد بھی حاصل نہ ہوتی - آپ کے مضامین جب کبھی کسی رسالے یا اخبار

ہیں اتفاقیہ طور پر میرے سامنے آجاتے ہیں، تو یہ ممکن ہی نہیں کہ میں اُن کو بغیر پڑھے چھوڑ دوں۔ حالانکہ میں نے اخباروں اور رسالوں کا پڑھنا ترک کر دیا ہے اور ترک کیا کر دیا ہے۔ پڑھنے کی مہلت و فرصت ہی نہیں ملتی۔

والدہ ماجدہ محترمہ کی علالت کا حال معلوم ہو کر مجھے بے حد صدمہ پہنچا۔ خدائے تعالےٰ اُن کو صحت و تندرستی عطا فرمائے۔ اور آپ کے لیے قبول ہونے والی دعائیں مانگنے والی یہ بے بدل ہستی تا دیر سلامت رہے۔ آمین۔ حضرت والد صاحب اور بھائیوں کو خطوط لکھیں۔ تو اِس سراپا تقصیر کا سلام ضرور بالضرور لکھیں۔

مولانا مہر نے تو انقلاب میں اِس کتاب پر کئی ہفتے ہوئے ریویو لکھ دیا لیکن مجھے حیرت ہے کہ زمیندار نے اب تک اس پر کچھ نہیں لکھا۔ حالانکہ چودھری غلام حیدر خاں صاحب جنرل مینجر اخبار زمیندار کا خط کئی ہفتے ہوئے آیا تھا کہ آپ کی کتاب پر زمیندار میں ریویو ضرور شائع ہوگا۔ لیکن اب تک شائع نہیں ہوا۔ میری یاد دہانی کا بھی جواب نہیں دیا۔

مجھے ایک معمولی اور غیر موثق ذریعے سے یہ معلوم ہوا ہے کہ نظامِ سلطنت کا ایک مضمون جس کا عنوان اسلامی فقہ ہے اور جو کتاب کے آخری حصے میں صفحہ ۲۹۷ سے شروع ہو کر صفحہ ۳۰۱ پر ختم ہوا ہے۔ بعض دقیانوسی مولویوں کو بے حد ناگوار گزرا ہے۔ بالخصوص صفحہ ۳۰۱ کا آخری حصہ۔ کس قدر حیرت اور حسرت کا مقام ہے کہ اس قابلِ شرم تقلیدِ جامد کی گرفت کا ذرا بھی ڈھیلا ہونا بڑے بڑے روشن خیال مولویوں کو گوارا نہیں۔ یو۔ پی کے کسی مشہور علمی و مذہبی ادارے سے اِس کتاب کے خلاف سُنا ہے مسلم اخبارات کے نام چٹھیاں جاری ہوئی ہیں۔ کہ اس پر ریویو نہ

کیا جائے۔ یہ سب کچھ ابھی تک محض افواہ ہے اور غیر مصدقہ بات ہے۔ میں خود ابھی درپئے تحقیق ہوں۔ آپ کے سوا میں نے ابھی تک کسی دوست سے اس کا مطلق تذکرہ نہیں کیا اور اس کا چرچا کرنا خود میرے ہی لیے مضر ہے۔ آپ بھی اس خاص بات کو اپنی ہی ذات تک محدود رکھیں اور کتاب کو شروع ہی سے پڑھتے ہوئے آخر تک پہنچیں۔

باوجود عزم اختصار خط طویل ہی ہو گیا۔ معافی کا خواستگار۔ دعا گو اور دعاؤں کا محتاج۔ اور آپ کی محبت کو محفوظ رکھنے والا ہوں۔ والسلام مع الاکرام

اکبر شاہ خاں نجیب آباد

○

بنام والد مرحوم و مغفور

(یہ خط میرے والد مرحوم کے نام لکھا گیا تھا)

مخدومی محترمی معظمی۔ السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ

صحیفۂ گرامی غالباً پرسوں یا اترسوں وارد ہوا۔ میں نے عجلت میں اس کا مطالعہ کیا اور اپنے کاغذات کی کشتی میں رکھ دیا کہ اس کا جواب ضرور لکھوں گا میری حالت یہ ہے۔ کہ دوستوں، بزرگوں اور عزیزوں کے خطوط آتے ہیں۔ اکثر ضروری ہوتے ہیں۔ میں کسی کا جواب نہیں لکھ سکتا۔ بہت ہی ضروری خط ہو تو اسی وقت برخوردار محمد ایوب خاں کو دے دیتا ہوں کہ تم اس کا جواب لکھ دو۔ بعض حضرات اتنی ہی بات پر ناراض ہو گئے کہ اپنے قلم سے جواب کیوں نہیں لکھا۔ میں ان سے معذرت بھی نہیں کر سکا۔ آپ مقدمۂ تاریخ ہند قدیم کی جلد اول ملاحظہ

فرما چکے ہوں گے۔ اُس جلد میں کسی جگہ بھی کوئی فقرہ ایسا موجود نہیں جس سے یہ ثابت ہو کہ اس کے بعد اِس مقدمے کی کوئی دوسری جلد بھی لکھی جائے گی۔ بلکہ اُس کے بعد اصل تاریخ کی پہلی جلد لکھی جانی چاہیئے تھی۔ مقدمہ بس ختم ہو چکا تھا۔ لیکن تمام کتاب کے چھپ چکنے کے بعد جب ہر ورق کی کاپی لکھی جا رہی تھی۔ تو یکایک میرے دل میں تحریک ہوئی کہ اس مقدمے کی ایک دُوسری جلد ضرور لکھنی چاہیئے لہذا میں نے ٹائیٹل پیج پر لفظ "جلد اوّل" اضافہ کرا دیا جس سے دوسری جلد کے لیے اشارہ نکلتا ہے اُس کے بعد میں نے دوسری جلد کا کام شروع کر دیا اور میری مصروفیت و انہماک کا زمانہ اب تک ختم نہیں ہوا۔

یہ دوسری جلد ہزارہا کتابوں کی ورق گردانی کے بعد الحمد للہ لکھ چکا ہوں اور اب قریباً ایک مہینے سے لکھے ہوئے مسوّدات کو صاف کر رہا ہوں۔ بہت تھوڑا حصّہ صاف ہونے سے باقی ہے۔ اب آپ کو میری مصروفیات کا حال معلوم ہو گیا ہوگا آپ کا گرامی نامہ ایسا نہ تھا کہ میں کسی دوسرے کو جواب کے لیے دے دیتا۔ آپ کے ساتھ جو محبت اور قدیمانہ تعلقات ہیں اور آپ نے جس تاکید کے ساتھ جواب مانگا ہے اُس کا لحاظ کرتے ہوئے جواب لکھنا بھی ضروری تھا۔ ہر روز صبح، شام، دوپہر خیال آتا ہے کہ جواب لکھوں، لیکن جس کام میں مصروف تھا اس کی دلچسپی نے اُس میں التواء و انقطاع پسند نہ کیا۔ بہر حال آج ایک بجے دوپہر کے بعد یہ عریضہ لکھ رہا ہوں۔ مُقدّمۂ تاریخ کی اِس دوسری جلد کی فہرست مضامین بھی صاف کرنے کے ساتھ ہی ساتھ ایک پرچہ پر لکھتا جاتا تھا۔ جس قدر مضامین صاف ہو چکے ہیں۔ اُن کے عنوانات جو ایک پرچے پر لکھے گئے ہیں، وہ پرچہ بھی بھجواتا ہوں جس

سے آپ کو اس دوسری جلد کی اہمیت کا کچھ اندازہ شاید ہو سکے گا۔ میں اب جب کہ جواب لکھنے بیٹھا تو آپ کا لفافہ نکالا۔ خط کو دوبارہ پڑھا۔ لفافے میں ایک مطبوعہ کاغذ بھی تھا۔ میں نے اس کو پہلی مرتبہ نہیں پڑھا تھا۔ اسی وقت اس مطبوعہ پرچے کو بھی پڑھا۔

(۱) میں سب سے پہلے اجرت لے کر کتاب لکھنے کے متعلق عرض کرتا ہوں۔ میں بہت ہی معمولی حیثیت کا ایک مفلس و قلاش آدمی ہوں، اور مجھ کو روپے کی ضرورت بھی رہتی ہے اور جس قدر آدمی غریب ہو، اسی قدر اس کی نگاہ میں روپے کی قیمت زیادہ ہوتی ہے ؎

گدا چوں یافت روزی خویش را داند سلیمانے

برائے مور سنگ آسیا تخت روان باشد

مجھ کو اپنی عمر میں سب سے پہلے اجرت پر کتاب لکھنے کا اتفاق اس زمانے میں ہوا، جب لاہور میں قیام پذیر تھا۔ اسلامیہ ہائی اسکول بھاٹی دروازہ کے ہیڈ ماسٹر صاحب نے جو اس زمانے میں انجمن حمایت اسلام کے صیغۂ تالیف و اشاعت کے ناظم تھے، مجھ سے کہا کہ لڑکیوں کے لیے اردو کی جو کتابیں انجمن کے یہاں ہیں، وہ قابلِ ترمیم ہیں۔ آپ لڑکیوں کے لیے اردو کی کتابوں کا ایک سلسلہ لکھ دیں۔ جس میں پہلی، دوسری، تیسری، چوتھی کتابیں ہوں۔ اس کا معاوضہ آپ کو ایک ہزار روپے دیا جائے گا۔ مگر شرط یہ ہے کہ ہر کتاب کا مسودہ لکھنے پر پچاس روپے یعنی چاروں کتابیں لکھنے پر دو سو روپیہ آپ کو مل جائے گا اور جب کتابیں چھپ کر رائج ہو جائیں گی اور فروخت سے آمدنی ہو گی۔ تو آٹھ سو روپیہ بعد میں ملے گا۔

میں نے چار دی جلدیں لکھ کر اُن کے حوالے کیں۔ دو سو روپیہ اُنھوں نے انجمن سے مجھے دلوا دیا۔ کتابیں چھپ گئیں۔ آج تک سولہ سال کے قریب عرصہ ہوا کہ برابر چھپ رہی اور فروخت ہو رہی ہیں اور ملک میں بے حد مقبول بھی ہیں۔ لیکن میرے آٹھ سو روپے کا کوئی ذکر فکر نہیں اُن کی تحریریں میرے پاس موجود ہیں جن کو معاہدے کی دستاویز کہنا چاہیئے۔ میں نے اُن کو ایک دو مرتبہ یاد دہانی کی پھر سُنا کہ وہ فوت ہو گئے۔ میں خاموش ہو گیا۔ کیونکہ وہ بھی خاموش ہو گئے۔

دوسرا تجربہ ..... ایڈیٹر ..... کا ہوا۔ اُنھوں نے باقاعدہ شرائط طے کر کے مجھ سے تاریخِ اسلام کی چار جلدیں لکھوائیں۔ ان کی طرف قریباً سترہ سو روپیہ (۱۷۰۰) حسبِ معاہدہ باقی ہے۔ ایک مرتبہ دوستوں کے سخت مجبور کرنے سے اُن کو نوٹس وکیل کے ذریعے بھیجا تو اُن کا جواب آیا۔ کہ میں نے دیوالہ نکال دیا ہے دیوالہ نکالنے کی اطلاع فلاں فلاں اخبارات میں شائع ہو چکی ہے۔ اب کیا ہوتا ہے تم میرا بال بیکا نہیں کر سکتے۔ چنانچہ خاموش ہو گیا۔

اس کے بعد میری مالی مشکلات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ایک دوست نے انتہائی شفقت و محبت کے ساتھ عثمانیہ یونیورسٹی دکن سے ایک اعلان بھجوایا۔ جس میں تاریخِ ہند کی بعض محدود زمانوں کی دو تین جلدیں، نو روپیہ فی صفحہ اُجرت کے حساب سے لکھوانی منظور کی گئی تھیں۔ اور مجھے توقع دلائی گئی تھی کہ اس کام کے لیے تجھ کو اوروں پر ترجیح دی جائے گی۔ اور یہ کام تیرے سپرد کیا جائے گا۔ میں نے اس کے جواب میں اُن محترم دوست کو ایک کارڈ پر صرف یہ جواب دیا۔ کہ ؎

"تابِ زنجیر نہ دارد دلِ دیوانۂ ما"

چنانچہ وہ بیچارے اپنا سا منہ لے کر رہ گئے۔ اور میرے پاگل پن کی دوسرے صاحبوں سے بہت شکایت کی۔

اِسی سال کے گزشتہ ماہ مارچ کا واقعہ ہے کہ اچانک اور یکایک بلا اطلاع میجر سر محمد اکبر خاں، نواب آف ہوتی، ممبر کونسل آف اسٹیٹ، جو ایک مشہور و معروف علم دوست اور امیر کبیر آدمی ہیں، دہلی سے چل کر سیدھے نجیب آباد آئے۔ ریلوے اسٹیشن نجیب آباد کے متصل ڈاک بنگلہ میں اپنے آدمیوں اور اپنے سامان کو رکھ کر، اپنے سیکرٹری کو ہمراہ لے کر شہر میں داخل ہوئے اور لوگوں سے دریافت کرتے ہوئے میرے کلبۂ احزان تک پہنچے۔ قریباً گیارہ بجے کا وقت تھا کہ وہ میرے دروازے پر پہنچے۔ میں اپنے کام میں مصروف تھا۔ ایک اجنبی اور شریف صورت انسان کی خبر سن کر کہ دروازے پر کھڑا ہے، باہر آیا۔ سلام علیک مصافحہ وغیرہ کے بعد انھوں نے اپنا نام اور پتہ بتایا اور کہا کہ میں دہلی میں کونسل آف اسٹیٹ کی شرکت کے لیے آیا تھا۔ وہاں سے تیری ملاقات کو آیا ہوں۔

میں نے اُن سے واقف ہو کر کہا کہ آپ نے ناحق اپنے آپ کو ذلیل اور مجھے شرمندہ کیا۔ میرے پاس تو آپ کو بٹھانے کے لیے بھی کوئی جگہ نہیں۔ وہ نہایت بے تکلفی کے ساتھ بیٹھ گئے اور مسلسل چار یا سوا چار گھنٹے تک باتیں کرتے رہے۔ اس سرگرم گفتگو اور مسلسل مکالمے میں اُن کی قسم قسم کوشش یہ تھی کہ مجھ کو ہوتی ضلع پشاور میں چل کر قیام کرنے اور پٹھانوں کی قوم کی تاریخ مرتب کرنے پر آمادہ کریں۔ روپیہ کا بھی بہت ہی بڑا لالچ دیا۔ اور نیز میری خاطر و مدارات اور دلچسپی کے

سامانوں کی فراہمی کا بھی یقین دلایا۔ اپنے کتب خانے کی فہرست بھی جو مجلد اور ضخیم تھی ہمراہ لائے تھے، جس کو اُن کے سیکرٹری بغل میں دبائے ہوئے تھے، مجھے دکھائی، اور کہا کہ یہ کتابیں ہمارے پاس موجود ہیں۔

میرے لیے یہ سب سے بڑا لالچ تھا۔ عام لوگوں کے نقطۂ نگاہ کے موافق میرے لیے بڑی ہی مفید اور نفع رساں صورت پیدا ہوئی تھی۔ اور کام بھی میرے ذوق کے موافق تھا مگر میں نے معذرت ہی کی۔ اور اُن کے اصرار پیہم کا کوئی اثر قبول نہیں کیا۔ انھوں نے بالآخر ہم قومی اور ہم ذوقی و ہم قبیلہ ہونے کے استحقاق بھی پیش کئے۔ لیکن پونے چار بجے وہ خدا جانے کس قسم کے خیالات لے کر مجھ سے جدا ہوئے۔ بعد میں اُن کا خط بھی آیا تھا۔ میں نے اپنے کام میں جس کو میں اپنے ذوق کے موافق کر رہا ہوں، کوئی رخنہ پیدا نہیں ہونے دیا۔ ایسے دیوانے آدمی سے اگر کوئی بات آپ خلافِ توقع ملاحظہ فرمائیں۔ تو اُس کو اندازہ ذرا رعایت کے ساتھ کریں۔

(۲) میرا خیال ہے کہ قوم کے نسلی اور ہر ایک قوم کی تاریخ کی تفتیش و تحقیق کا کام بڑا دلچسپ کام ہے۔ اور اس کام کے کرنے والے کے سامنے بہت سے عجیب و غریب راز ہائے نہفتہ منکشف ہو سکتے ہیں۔ اور بہت سی عبرتیں اور بصیرتیں حاصل ہو سکتی ہیں اور یہ کام محض علمی و تحقیقی رنگ میں ہونا چاہیئے۔ لیکن مطبوعہ چٹھی کے پڑھنے سے معلوم ہوا کہ یہ کام اس لیے کیا جا رہا ہے کہ کسی طرح کسی نسلی قوم کو زراعت پیشہ قوم بنایا جائے۔ مجھ کو یہ معلوم ہو کر کہ پٹھان یا افغان قوم زراعت پیشہ مانی گئی ہے پٹھانوں کی قوم پر سخت افسوس ہوا کہ اُن کی بدنصیبی پر اُن کی تعزیت کی جائے اور کسی نسلی بزرگوں کی یہ خواہش بے حد عجیب معلوم ہوئی کہ اپنے ایک شرف

کو کھود بنے کی خود کوشش کر رہے ہیں۔ زراعت کا پیشہ تو نہایت ذلیل اور ادنیٰ پیشہ ہے۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کی اس زراعتی خواہش و تمنا کے جواب میں فرمایا "اَتَسْتَبْدِلُوْنَ الَّذِیْ هُوَ اَدْنٰی بِالَّذِیْ هُوَ خَیْرٌ" (کیا تم اس حالت کو جو بہت اچھی حالت ہے ایک ادنیٰ حالت سے تبدیل کرنا چاہتے ہو؟)

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ایک مکان میں آلاتِ کشاورزی رکھے ہوئے دیکھ کر فرمایا کہ یہ سامانِ ذلت ہے۔

کاشتکار و زمیندار کی دماغی نشوونما رک جاتی ہے۔ کاشتکاری پیشہ قوم حالاتِ زمانہ سے بے خبر رہتی ہے۔ کاشتکاری پیشہ قوم سے اولوالعزمی جاتی رہتی ہے۔ زمین کی محبت کاشتکار کو سفر اور فتوحات اور ترقی سے روک کر زمین گیر اور پست ہمت بنا دیتی ہے۔ تمام پیشوں میں تجارت کا پیشہ معزز اور ہر طرح شریف پیشہ ہے۔ اور تاجر کو ہر قسم کے ترقی کے راستوں پر گامزن ہونے کا موقع ملتا ہے۔ اگر آپ اپنی قوم کو زندہ قوم بنانا چاہتے ہیں تو تجارت کی طرف توجہ دلائیں۔ قوم کو کاشتکار بنا کر ہلاک نہ کریں۔ میں جانتا ہوں کہ آپ نے یا آپ کی قوم نے مجھ سے کوئی مشورہ اس معاملے میں طلب نہیں فرمایا اور یہ میری بدتمیزی و نالائقی ہے کہ آپ کو آپ کی محبوب کوشش سے روکنا چاہتا ہوں۔ مگر میں نے جو کچھ عرض کیا ہے۔ شرارت سے نہیں، محبت و ہمدردی سے عرض کیا ہے۔ میں اُن لوگوں میں سے ہوں جو آپ کے اور آپ کی قوم کے پیشہ ور ہونے پر سب سے زیادہ مسرور ہے اور تحقیق و تفتیش کے بعد اس نتیجے کے برآمد ہونے پر سب سے زیادہ

خوش ہوگا۔

آپ کا قوم کی تحقیق کے درپے ہونا جس قدر قابلِ تعریف کام ہے اُسی قدر اِس تحقیق کی غرض و غایت زراعتی قوم ثابت کرنا، میرے نزدیک قابلِ مذمت نہیں تو قابلِ شکوہ ضرور ہے ؎

ہمت بلند دار کہ پیشِ خدا و خلق
باشد بقدرِ ہمتِ تو اعتبارِ تو

میں آپ کو اپنا قلب چیر کر نہیں دکھا سکتا۔ کہ مجھ کو مسلمانوں کی تمام اقوام کے ساتھ کس قدر محبت ہے اور میں کس قسم کے جذبات رکھتا ہوں۔ آپ کو اپنی قوم کے نفع و نقصان کا جس قدر خیال ہے، میرے دل میں اُس سے بڑھ کر جوش ہے۔ اور میں نے اِسی محبت اور اسی جوش کے عالم میں عرض کیا ہے جو کچھ عرض کیا ہے۔ آپ فلاحِ قوم کے اصول قرآن مجید میں تلاش کریں۔ دُنیا کے عقلمندوں اور ہوشیار لوگوں کے دماغوں سے دریوزہ گری نہ کریں۔ یہ جو کچھ سیاست دانی کے طوفان اُمڈے ہوئے ہیں، وحیٔ الٰہی یعنی کلامِ الٰہی سے بے تعلق اور بے نصیب ہونے کی وجہ سے حقیقی کامرانی تک ہرگز نہیں پہنچا سکتے۔

(۳) قوم کی تاریخ کے متعلق تحقیق و تفتیش کا کام کرنا، کسی قوم ہی کے آدمی یا جماعت کا حق ہے۔ اس کے لیے مختلف مقامات پر سفر بھی کرنا پڑے گا۔ کتب خانوں کو بھی کھنگالنا پڑے گا۔ مراسم و رواج کو بھی اوّل قیدِ تحریر میں لانا پڑے گا۔ قدیم خاندانوں کے شجرات بھی مرتب کرنے ہوں گے۔ غور و فکر اور وسعتِ نظر سے بھی کام لینا ہوگا۔ ایک من مواد فراہم کرنے کے بعد اس میں سے ایک چھٹانک یا ایک تولہ کام کی چیز ہاتھ

آئے گی، اس کام کے لیے نہ کوئی پیمانہ ہو سکتا ہے، نہ وقت و محنت کا کوئی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ اس کام کا جوش قلوب کے اندر سے پھوٹ کر نکلنا چاہیئے نہ یہ کہ باہر سے قلوب کو دبا کر نچوڑا جائے۔ کاش مجھے فرصت و مہلت میسر ہوتی، اور میں اس کام میں مصروف ہو کر اور ایک دو لگے زئی ذی علم و صاحب ذوق دوستوں کو ہمراہ لے کر آپ کو بتاتا۔ کہ اس طرح کام ہوتا ہے اور کس کس جگہ زمین کو کھودنا چاہیئے۔ کہ وہاں سے سونے کی کان برآمد ہونے کی توقع ہے۔ ع

تھوڑی سی عمر میں کوئی کیا کیا کیا کرے

فہرست مضامین والا پرچہ بعد ملاحظہ اخویم عاشق حسین خاں صاحب کو اُن کے خط کے ہمراہ دے دیجیے۔ میرے لیے دعا ضرور فرمائیے۔ کہ میری پریشانیاں جلد دور ہوں۔ مجھ کو ہمیشہ نیاز مند و با اخلاص تصور فرماتے رہیئے۔ والسلام

اکبر شاہ خاں

از نجیب آباد

قراردادِ پاکستان سنہ ۱۹۴۰ء

۲۳ مارچ سنہ ۱۹۴۰ء کو لاہور کے وسیع میدان منٹو پارک میں ایک لاکھ انسانوں کے سامنے اور قائدِ اعظم کی صدارت میں آل انڈیا مسلم لیگ نے تقسیم ہند کی وہ مشہور قرارداد منظور کی تھی۔ جس نے بعد میں قراردادِ پاکستان کا نام حاصل کیا تھا۔ اسی قرارداد کی رُو سے پاکستان کی مملکت کو وجود میں آئے تیرہ سال گزر چکے ہیں۔ آئیے، آج کہ ہم اس تقریب کی اکیسویں سالگرہ منا رہے ہیں، اُس روزِ سعید کی یاد تازہ کریں۔ جب اسلامیانِ ہند کے نمائندوں نے جمع ہو کر یہ مہتم بالشان عزم باندھا تھا۔ کہ وہ برِ عظیم میں ایک آزاد و مقتدر سلطنت قائم کر کے رہیں گے۔

خاکساروں سے پولیس کا تصادم ۱۹ مارچ سنہ ۱۹۴۰ء کو لاہور میں ایک سخت الم ناک حادثہ ہوا جس میں پولیس اور خاکساروں کا تصادم

ہو گیا۔ اور مسلمانوں کی بہت سی قیمتی جانیں ضائع ہو گئیں۔ حکومتِ پنجاب نے نیم فوجی جماعتوں کو خلافِ آئین قرار دے کر۔ اُن پر پابندی لگا رکھی تھی۔ کہ ان جماعتوں کے رضاکار اپنی مخصوص وردی پہن کر بر سرِ عام قواعد نہیں کر سکتے۔ اس پابندی کی زد خاکساروں پر بھی پڑتی تھی، علامہ مشرقی دہلی میں تھے۔ اور اُن کے اخبار "الاصلاح" میں جو لاہور سے شائع ہوتا تھا۔ کئی روز سے سخت اشتعال انگیز مضامین چھپ رہے تھے جن میں بار بار لکھا جاتا تھا۔ کہ خاکساروں کو چاہیئے کہ سر سکندر حیات خاں کے گرد لاشوں کا انبار لگا دیں۔ اسی نوع کی اور بھی غیر ذمہ دار تحریریں شائع کی جا رہی تھیں ۱۹ مارچ کی صبح کو خاکساروں کے جتھے قواعد کرتے ہوئے بھاٹی دروازہ کے اندر نمودار ہوئے۔ پولیس نے روکنا چاہا لیکن خاکساروں نے اپنے صیقل شدہ بیلچوں سے پولیس کے سپاہیوں اور افسروں پر حملہ کر دیا پولیس والوں کی تعداد تھوڑی تھی۔ اس لیے خاکسار دائیں بائیں مارتے ہوئے آگے نکل گئے۔ پولیس کے چند افسر بُری طرح زخمی ہوئے اور ایک انگریز افسر جان سے مارا گیا۔ تھوڑی دیر میں بہت سی مسلح پولیس۔ لاریوں پر سوار آ گئی۔ اور خاکساروں کا سخت بے دردی سے قتلِ عام شروع ہوا، شام تک۔ لاہور میں چاروں طرف غم و اندوہ کے بادل چھا گئے۔ ہندو اور سکھ خوش تھے۔ لیکن مسلمان گھرانوں میں اس واقعہ سے سخت حزن و ملال طاری ہو گیا تھا۔ پنجاب کی حکومت کا خاکساروں کے خون سے ہولی کھیلنا بڑا افسوسناک واقعہ تھا۔ سر سکندر حیات خاں کی، جو پہلے ہی سے لاہور کے مسلمانوں میں چنداں مقبول نہیں تھے، اس حادثۂ خونیں کے بعد تو چاروں طرف سے مذمت شروع ہو گئی تھی اور عام مسلمانوں میں غم و غصہ کی لہر پھیل گئی تھی۔

التوا اجلاس کی کوشش

۲۲ مارچ کو آل انڈیا مسلم لیگ کا اجلاس شروع ہونے والا تھا۔ اس لیے ہر شخص کی زبان پر یہ بات تھی۔ کہ ایسی رنج وہ اور اشتعال انگیز فضا میں اجلاس ہو بھی سکے گا یا نہیں، سر سکندر نے بہت کوشش کی کہ اجلاس ملتوی ہو جائے۔ انھوں نے ٹیلی فون پر قائد اعظم کو بھی یہی مشورہ دیا۔ لیکن قائد اعظم نے یہ رائے ماننے سے انکار کر دیا۔ اور فرمایا۔ کہ اجلاس ضرور ہوگا۔ اور عین مقررہ تاریخ اور مقررہ مقام پر ہوگا۔ انھیں اپنی ذات پر تو اعتماد تھا ہی۔ لیکن وہ عوام کے خلوص و صداقت پر بھی یقین رکھتے تھے۔ اور اس حقیقت سے بھی واقف تھے۔ کہ پنجاب کے وزیر اعظم کے خلاف مسلمانوں کی ناراضی۔ لیگ کی کامیابی پر اثر انداز نہیں ہو سکے گی۔

جلوس سے انکار

۲۱ مارچ کی صبح کو قائد اعظم لاہور تشریف لائے۔ ان کے اعزاز میں ایک بے مثال اور عدیم النظیر جلوس نکالنے کا تمام سامان مکمل ہو چکا تھا، لیکن خاکساروں کے حادثہ خونیں کی وجہ سے چونکہ فضا سوگوار ہو رہی تھی اس لیے انھوں نے جلوس سے انکار فرما دیا۔ سٹیشن سے باہر رضا کاروں کا مجمع تھا۔ اور بہت سے نوجوان کھڑے اصرار کر رہے تھے کہ قائد اعظم موٹر میں سوار نہ ہوں بلکہ فٹن میں بیٹھیں تاکہ وہ خود ان کی گاڑی کھینچ کر ڈیوس روڈ تک لے جائیں۔ قائد اعظم نے شکریہ کے ساتھ اس پیش کش کو بھی رد کر دیا۔

کونسل کا اجلاس

۲۱ کی شام کو غروب آفتاب کے بعد، لیگ کونسل کا اجلاس ہوا جس میں جنرل سیکرٹری کی رسمی رپورٹ کے بعد ضابطے کے مطابق مجلس انتخاب مضامین (سبجکٹس کمیٹی) کے چند مزید ارکان نامزد

گئے گئے۔ ان میں پنجاب سے ڈاکٹر محمد عالم اور میاں فیروز الدین احمد کو جگہ ملی سر سکندر مرحوم اس جلسے میں شریک تو ہوئے لیکن خلافت تحریک بہت پیچھے بیٹھے تھے اُن کی وجہ سے یونینسٹ پارٹی کے تمام ارکان بھی اُن کے ساتھ پچھلی کرسیوں پہ تشریف فرما تھے۔ قائد اعظم نے لاہور پہنچتے ہی اخباری نمائندوں کو جو بیان دیا تھا اُس میں فرمایا تھا کہ لیگ اس اجلاس میں ایک انقلاب آفریں اقدام کرے گی، اُن کے اس ارشاد پر طرح طرح کی چہ میگوئیاں اور قیاس آرائیاں ہونے لگیں، ہندو اخباروں نے بھی بڑے بڑے حاشیے چڑھائے لیکن بات کی تہہ تک کوئی نہ پہنچ سکا۔

لیگ کا کھلا اجلاس

۲۲ مارچ کی سہ پہر کو لیگ کا کھلا اجلاس ہوا۔ نواب شاہ نواز خاں والئی ممدوٹ نے خطبہ استقبالیہ پڑھا۔ لوگ بڑے اطمینان اور سکون سے سنتے رہے آخر میں انھوں نے لاہور کی بادشاہی مسجد کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ اس مسجد کی حالت بہت سقیم ہو گئی ہے اندیشہ ہے کہ ہماری غفلت کی وجہ سے عالمگیر اعظم کی اس تاریخی یادگار کو کہیں زیادہ نقصان نہ پہنچے پھر انھوں نے سر سکندر کی اُن کوششوں کا ذکر کیا جو وہ مسجد کی مرمت کے سلسلہ میں کر رہے تھے، جونہی سر سکندر کا نام آیا۔ پنڈال میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک کہرام مچ گیا، چاروں طرف سے آوازیں آنے لگیں۔ ہم نہیں سنتے "سر سکندر کا نام مت لو" "بیٹھ جاؤ" "ہم یہ نام سننا گوارا نہیں کرتے"۔ پھر شرم شرم کے نعرے بلند ہونے لگے، نواب صاحب بیچارے متحیر و پریشان کھڑے سب کچھ دیکھ رہے تھے۔ جب شور ہر لمحہ بڑھنے لگا، تو وہ چپکے سے اپنی جگہ پر بیٹھ گئے۔

سر سکندر خود بھی نواب صاحب کے پیچھے صوفے پر بیٹھے ہوئے تھے۔ انھوں نے اپنی آنکھوں سے عوام کے غم و غصہ کا یہ مظاہرہ دیکھا، تو اٹھ کر پنڈال کے عقبی دروازے سے باہر چلے گئے اور پھر دوبارہ لیگ کے کھلے اجلاس میں تشریف نہیں لائے۔

قائد اعظم صدارتی تقریر کے لیے کھڑے ہوئے تو ہر طرف سناٹا چھا گیا، انھوں نے کچھ دیر اردو میں خیالات کا اظہار فرمایا پھر انگریزی میں بولنے لگے۔ گذشتہ دو سال کے واقعات کا خلاصہ بیان کیا، برطانوی حکومت، کانگریس اور دیگر مختلف عناصر میں سے ایک ایک کا تجزیہ کیا۔ پھر جنگِ یورپ کے متعلق لیگ کی پالیسی کی وضاحت کی، اور آخر میں دو قوموں کا نظریہ پیش کرتے ہوئے انھوں نے لالہ لاجپت رائے کا ایک خط پڑھ کر سنایا جو موصوف نے ۱۹۲۴ء میں بنگال کے مشہور لیڈر سی۔ آر۔ داس کو لکھا تھا کہ مسلمان اور ہندو دو الگ الگ قومیں ہیں، ان دونوں کو ایک دوسرے میں مدغم کر کے ایک قوم بنانا قطعاً ناممکن ہے۔ لالہ لاجپت رائے چونکہ ہندو قوم کی ذہنیت کے صحیح علمبردار سمجھے جاتے تھے اس لیے اُن کے اس خط نے لوگوں کو ششدر کر دیا۔ ملک برکت علی مرحوم سٹیج پر بیٹھے تھے۔ اُن کے منہ سے نکل گیا کہ لاجپت رائے نیشنلسٹ ہندو تھے۔ قائد اعظم نے زور سے کہا کہ کوئی ہندو نیشنلسٹ نہیں ہو سکتا۔ ہر ہندو اوّل و آخر ہندو ہے۔ اس پر پنڈال میں خوب تالیاں بجیں۔

قراردادِ پاکستان

اسی شام، آٹھ بجے کے قریب، مجلس انتخاب مضامین (سبجکٹس کمیٹی) کا جلسہ ہوا۔ خاکساروں کے حادثے کے متعلق غم و غصہ کا اظہار کرنے کے لیے، اکثر ارکان نے مختلف قراردادیں پیش کرتے

کا نوٹس دے رکھا تھا۔ خیال تھا کہ اس نشست میں ان قراردادوں پر بحث ہوگی لیکن قائداعظم نے شروع ہی میں کہہ دیا کہ خاکساروں کے مسئلہ کو سردست ملتوی کیا جاتا ہے پھر نواب زادہ لیاقت علی خاں نے قرارداد پاکستان پیش کی جس کا اہم جزو یہ تھا۔ کہ ہندوستان کے شمال مغربی اور شمال مشرقی حصے میں ان خطوں کو جو جغرافیائی طور پر ایک دوسرے سے متصل و ملحق ہیں اور جن میں مسلمانوں کی اکثریت ہے۔ علاقائی ردّ و بدل کے ساتھ باقی ہندوستان سے الگ کر کے مقتدر و خود مختار مملکت میں تبدیل کر دیا جائے۔ قائداعظم چاہتے تھے۔ کہ اسی وقت مناسب بحث کے بعد یہ قرارداد منظور کر لی جائے۔ لیکن حاضرین کی رائے تھی کہ قرارداد چونکہ بے حد اہم ہے۔ اس لیے انھیں اس کے مختلف پہلوؤں پر سوچنے کا مزید موقع دیا جائے۔ اس کے علاوہ قرارداد کا متن انگریزی میں تھا۔ اور بعض لوگ انگریزی نہیں جانتے تھے۔ چنانچہ مولانا ظفر علی خاں نے وہیں قرارداد کا اردو میں ترجمہ کیا اور مفصل بحث دوسرے دن پر ملتوی کر دی گئی۔

اس واقعہ کا ایک دلچسپ پہلو یہ ہے کہ جب مولانا ظفر علی خاں قرارداد کا ترجمہ کرنے لگے تو سر سکندر حیات خاں جو بہت پیچھے بیٹھے ہوئے تھے۔ اپنی جگہ سے اٹھ کر مولانا کے پاس آکر بیٹھ گئے۔ اور جب تک مولانا ترجمے میں مصروف رہے۔ سر سکندر برابر قرارداد کے انگریزی متن اور اردو ترجمہ کے ایک ایک لفظ پر غور فرماتے رہے۔ مجھے ندامت سے اس بات کا اعتراف ہے کہ سر سکندر حیات خاں کی زندگی میں ان کے ساتھ میرے تعلقات کچھ ایسے اچھے نہیں تھے، ورنہ میں ضرور ان سے پوچھتا کہ قرارداد کی ترتیب و تدوین میں ان کا کتنا حصہ تھا۔ اور عبارت کا کون کون سا جملہ اور

لفظ اُن کا تجویز کردہ تھا۔ یہ صحیح ہے کہ سر سکندر مرحوم لفظ پاکستان سے ہمیشہ گھبراتے رہے۔ اور اُس کی بجائے قرارداد لاہور کا لفظ استعمال کرتے تھے لیکن اُس رات اُن کا یکایک پچھلی صفوں سے اُٹھ کر مولانا ظفر علی خاں کے پاس آکر بیٹھ جانا اور ترجمہ کے ایک ایک لفظ پر کڑی نگاہ رکھنا کہ آیا اردو الفاظ انگریزی متن کا صحیح مفہوم ادا کرتے ہیں یا نہیں۔ اس بات کا بیّن ثبوت تھا کہ انھیں قرارداد کی ترتیب و تدوین میں یقیناً بڑا دخل تھا۔

ترمیم کی ضرورت

رات کے گیارہ بجے مجلس انتخاب مضامین کا اجلاس ختم ہوا، تو میں اور ملک برکت علی مرحوم ایک ہی موٹر میں واپس آئے۔ میں اُس زمانے میں ٹمپل روڈ پر ملک صاحب کے پڑوس میں رہتا تھا۔ راستے میں میں نے اُن سے کہا کہ قرارداد کے الفاظ میں کچھ نقص ہے۔ آپ اس کو رفع کرا دیجئے۔

اُنھوں نے پوچھا "کیا نقص ہے؟"

میں نے عرض کیا کہ "پہلے یہ بتائیے کہ ہندوستان کے شمال مغربی علاقے سے جس کو آپ اپنی مملکت میں شامل کرنا چاہتے ہیں، آپ کی مراد کیا ہے؟"

کہنے لگے "یہی، پنجاب، سرحد، بلوچستان اور سندھ۔"

میں نے کہا "تو پھر آپ قرارداد میں واضح طور پر اِن صوبوں کے نام کیوں نہیں لیتے؟"

ملک صاحب نے کہا "اس سے کیا فائدہ ہوگا؟"

میں نے عرض کیا کہ "آپ کو معلوم ہے کہ پورے پنجاب میں ہماری اکثریت نہیں،

گیارہ یا بارہ ضلعے ایسے ہیں جہاں ہم اقلیت میں ہیں۔ اگر آپ نے علاقائی ردّ و بدل کے ساتھ مسلمانوں کی اکثریت کے حصّے کو باقی ملک سے علیحدہ کیا تو نصف پنجاب کٹ جائے گا، حالانکہ قرارداد مرتب کرتے وقت پورا پنجاب آپ کے ذہن میں تھا اوّل تو جہاں آپ نے شمال مغربی ہند کا ذکر کیا ہے وہاں پنجاب، سندھ، بلوچستان اور سرحد کا نام صراحت سے لینا چاہیے اور دوسرا علاقائی ردّ و بدل کے الفاظ حذف کر دیجیے۔"

ملک صاحب آل انڈیا مسلم لیگ کی مجلسِ عاملہ کے رکن تھے اور قرارداد کی ترتیب و تدوین میں ان کا بھی ہاتھ تھا۔ اس لیے ضابطے کے مطابق وہ قرارداد پر اعتراض نہیں کر سکتے تھے، تاہم انھوں نے مجھے مشورہ دیا۔ کہ میں دوسرے روز اسی مضمون کی ترمیم پیش کر دوں۔

ترمیم کا جواب

دوسرے روز بحث شروع ہوئی تو میں نے قرارداد میں ترمیم پیش کی۔ اور تفصیل سے اپنا نقطۂ نگاہ بیان کرتے ہوئے عرض کیا کہ اگر آپ لوگ پنجاب اور بنگال کے صوبوں کو مجوزہ مملکت میں شامل کرنا چاہتے ہیں تو جہاں آپ نے ہندوستان کے شمال مغربی اور مشرقی علاقوں کا ذکر کیا ہے۔ وہاں صاف لفظوں میں ان صوبوں کے نام لیجیے، تاکہ ہمارے مخاطب اور مخالف، دونوں ہمارے مطالبے کی حقیقت کو بھی سمجھ جائیں۔ ورنہ علاقائی ردّ و بدل کے تحت پنجاب اور بنگال کا تقریباً نصف حصّہ کٹ جائے گا۔

میری ترمیم کا جواب نواب زادہ لیاقت علی خاں نے دیا اور فرمایا کہ "ہم نے ایک مصلحت کی وجہ سے صوبوں کے نام نہیں لیے، اگر ہم پنجاب کا نام لے دیں، تو

اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ہماری مملکت کی سرحد گوڑگانوہ تک ہوگی۔ حالانکہ ہم علاقائی ردّ و بدل کے تحت، دہلی اور علی گڑھ کو جو ہماری تہذیب اور تعلیم کے مراکز ہیں، مجوزہ مملکت میں شامل کرنا چاہتے ہیں۔ آپ مطمئن رہیے، علاقائی ردّ و بدل کا یہ مطلب نہیں کہ پنجاب کا کوئی حصّہ ہاتھ سے دینا پڑے گا۔"

نواب زادہ صاحب کے اِس جواب پر ایوان میں خوب تالیاں بجیں۔

شیرِ بنگال کا لطیفہ

مجلسِ انتخابِ مضامین کے اِس اجلاس میں دو ایک لطیفے بھی ہوئے، قائدِ اعظم تقریر کر رہے تھے۔ کہ باہر بہت شور اٹھا، قائدِ اعظم نے پوچھا کہ یہ شور کیسا ہے؟ ایک شخص اٹھ کر باہر گیا۔ اور واپس آکر انگریزی میں کہنے لگا۔ کہ شیرِ بنگال آئے ہیں، اس کے اصل الفاظ تھے، THE TIGER OF BENGAL HAS COME، اتنے میں مولوی فضل الحق جھومتے ہوئے، پنڈال میں داخل ہوئے، کلکتہ سے لاہور تک کے سفر کی کوفت چہرے سے عیاں تھی، اسٹیشن سے سیدھے یہاں چلے آرہے تھے، شیو نہ بنانے کی وجہ سے داڑھی بڑھی ہوئی تھی، اور بغیر پھندنے کی ترکی ٹوپی پر حسبِ معمول ایک ایک انچ میل چڑھا ہوا تھا۔ چہرے کی سیاہ رنگت کے ساتھ سپید انگرکھا عجیب بہار دکھا رہا تھا۔ قائدِ اعظم نے اُن کو اِس شان سے آتے دیکھا۔ تو کہنے لگے۔ کہ "جب شیر آجائے تو میمنے کو چھپ جانا چاہیے۔"

یہ کہہ کر کرسی پر بیٹھ گئے۔ جب مولوی صاحب کو جگہ مل گئی۔ اور وہ اطمینان سے بیٹھ گئے۔ تو قائدِ اعظم یہ کہہ کر پھر کھڑے ہو گئے کہ "اب شیر کو زنجیروں میں جکڑ دیا گیا ہے۔ اس لیے میمنا پھر باہر نکل آیا ہے۔" حاضرین ہنس ہنس کر بے حال ہو گئے۔

میرٹھ کے سر یامین خاں اور مدراس کے عبدالحمید خاں نے قرارداد کی مخالفت کی۔ پنجاب کی یونینسٹ پارٹی کے ارکان میں سے میر مقبول محمود نے قرارداد کی حمایت میں بہت اچھی تقریر کی تھی، بریلی کے مولوی عزیز احمد خاں نے بھی حمایت کی تھی۔ لیکن اُن کا نقطۂ نگاہ بالکل مختلف تھا۔

خاکساروں کے مسئلہ پر بحث

اُس رات پھر مجلسِ انتخابِ مضامین کا اجلاس ہوا۔ اب خاکساروں کے حادثے پر قراردادیں پیش ہونے لگیں، قائداعظم نے فرمایا۔ کہ سب سے پہلے سر سکندر کا بیان سُن لینا چاہیئے۔ سر سکندر مرحوم طبعاً شریف اور بامروّت آدمی تھے، لیکن اُس رات انھوں نے اپنی صفائی میں ایک عجیب و غریب کہانی وضع کی۔ کہنے لگے کہ "لاہور کے خاکساروں کی جماعت کا ارادہ نہیں تھا، کہ خلافِ قانون مظاہرہ کیا جائے اور نہ وہ پولیس ہی سے لڑنا چاہتے تھے اُن کو اس ہنگامے پر آمادہ کرنے اور تشدد کی تلقین کرنے والے میرے بعض سیاسی مخالفین ہیں۔ جن میں سے چند آدمی اس وقت یہاں بھی موجود ہیں۔"

اِن الفاظ نے مجمع میں آگ لگا دی اور چاروں طرف سے آوازیں آنے لگیں کہ اُن کے نام بتلایئے۔ سر سکندر نے نام تو کسی کا نہ لیا، صرف اتنا کہا کہ "ان لوگوں میں دو تو پنجاب اسمبلی کے رُکن ہیں اور دو اور ہیں جو اسمبلی کے ممبر نہیں۔ البتہ اس ایوان میں موجود ہیں۔ پورے نام میں پھر بتاؤں گا۔ اِن میں سے ایک صاحب علامہ مشرقی سے ملنے دہلی گئے اور واپس آکر جھوٹ موٹ خاکساروں سے کہہ دیا کہ علامہ کا حکم ہے کہ قانون شکنی کی جائے۔"

یہ سُن کر ملک برکت علی فوراً اُٹھے۔ اور انھوں نے انگریزی میں ایک مسحور دھار

تقریر کی۔ ملک صاحب کی انگریزی میں فصیح البیانی سننے اور دیکھنے کی چیز ہوتی تھی انھوں نے سر سکندر کے دائیں بائیں اور آگے پیچھے وہ بھرپور وار کئے۔ کہ انھیں دوبارہ لب کشائی کی ہمت نہ ہوئی۔ آخر قائداعظم نے انھیں بمشکل ٹھنڈا کیا۔ پھر دو کد کے بعد یہ تجویز منظور ہوئی کہ اس حادثے کی تحقیقات کے لیے ایک کمیٹی بنائی جائے جس میں دو ہائی کورٹ کے ریٹائرڈ جج ہوں، ایک تو لکھنؤ کے جسٹس نعمت اللہ کا نام منظور ہوا۔ دوسرا نام مجھے اس وقت یاد نہیں

کھلے اجلاس میں قرارداد

جب یہ ہنگامہ ختم ہو گیا۔ تو قائداعظم نے پوچھا کہ کل کھلے اجلاس میں قرارداد پاکستان کون پیش کرے گا۔ متعدد نام سامنے آتے رہے۔ آخر قائداعظم نے چودھری خلیق الزمان سے فرمایا کہ یہ فرض ادا کریں۔ لیکن دوسرے روز جب اجلاس عام میں قرارداد پیش کرنے کا وقت آیا تو چودھری صاحب کی بجائے مولوی فضل الحق تشریف لائے معلوم ہوا۔ کہ صبح فیصلے میں یہ تبدیلی کی گئی ہے کہ قرارداد مولوی فضل الحق پیش کریں گے۔ مولوی صاحب نے قرارداد پر اردو میں تقریر کرتے ہوئے جب مسلمانوں کی تکلیفوں کا ذکر کیا تو انوری کے یہ دو شعر بھی پڑھے ؎

ہر بلائے کہ ز آسماں راند — گرچہ بر دیگرے قضا باشد

بر زمیں نارسیدہ می گوید — خانۂ انوری کجا باشد

مولوی فضل الحق کی تائید میں، چودھری خلیق الزمان نے خلافِ معمول بہت پرجوش اور جذبات سے مرصع تقریر کی۔ قائداعظم کا قاعدہ تھا۔ کہ لیگ کے سالانہ اجلاس پر اہم ترین تجویز کی حمایت میں ہندوستان کے ہر صوبے سے ایک ایک نمائندے کی تقریر

کرایا کرتے تھے۔ اس قرارداد کی حمایت کرنے والوں میں بمبئی سے ابراہیم اسمٰعیل چندریگر، سی پی سے عبدالرؤف شاہ، مدراس سے عبدالحمید خاں، سرحد سے اورنگ زیب خاں، آسام سے عبدالمتین چودھری، بہار سے محمد عاشق دارثی اور پنجاب سے مولانا ظفر علی خاں شامل تھے۔

قرارداد کے بعد

جب اجلاس ختم ہوا تو اکثر لوگوں کی زبان پر یہ فقرہ تھا کہ "تجویز تو منظور ہو گئی ہے۔ اب دیکھیں پاکستان کب بنتا ہے"۔

چنانچہ چند روز کے قیام کے بعد جب قائداعظم دہلی روانہ ہونے لگے تو سٹیشن پر انھیں الوداع کہنے کے لیے ایک بہت بڑا مجمع تھا، وہاں بھی ایک شخص نے پوچھ ہی لیا "کیوں حضور، اب ہماری آزاد مملکت کب بنے گی؟"

قائداعظم نے مسکرا کر جواب دیا "سب کچھ آپ لوگوں کی کوشش پر منحصر ہے"۔

قلعۂ لاہور نے بڑے بڑے تاریخی انقلاب دیکھے ہیں۔ بادشاہوں کا عروج و زوال، شہزادوں کی بغاوتیں، سلطنتوں کی تباہیاں اور حملہ آوروں کی خون ریزیاں، سبھی کچھ قلعہ کی دیواروں کے نیچے ہوتا رہا ہے لیکن ایسا انقلاب اس نے آج تک نہ دیکھا تھا کہ برعظیم ہند کے دس کروڑ مسلمانوں کے غیر مسلح، امن پسند اور عاقبت کیش نمائندے، اس کی دیواروں کے سامنے جمع ہو کر یہ عہد باندھتے ہیں کہ اس سرزمین پر اپنے لیے ایک آزاد و خود مختار مملکت بنا کر دم لیں گے۔

کیا اچھا ہو کہ حکومت اس جگہ، جہاں آج سے اکیس سال پہلے یہ عہد استوار کیا گیا تھا کوئی یادگار قائم کر دے۔ ؎

اے خاکِ درت صندل سرگشتہ سراں را
بادا مژہ، جاروبِ رہت، تاجوراں را

۱۹۶۱ء

چند تاثرات

انڈیا آفس لائبریری — لندن

گذشتہ چند سال سے، لندن کی انڈیا آفس لائبریری کی ملکیت کے بارے میں جھگڑا چلا آرہا ہے۔ پاکستان، ہندوستان اور برطانیہ تینوں اس پر اپنا اپنا حق جتاتے ہیں۔ بہت کم لوگوں کو معلوم ہے۔ کہ یہ لائبریری کب اور کیوں کر وجود میں آئی تھی اور اسے موجودہ حالت تک پہنچنے میں کن کن مرحلوں سے گذرنا پڑا۔ پاکستان اور ہندوستان سے جو طلبہ یا اہلِ علم لندن آتے ہیں، اُن میں سے بعض نے اس کتب خانے سے استفادہ تو کیا ہوگا۔ لیکن شاید کسی نے اُس کے ماضی پر ایک نظر ڈال کر اُس کی مختصر سی تاریخ قلم بند کرنے کی کوشش نہیں کی۔

اِس لائبریری کا تخیل پہلے پہل ایسٹ انڈیا کمپنی کے ایک ملازم رابرٹ آوم کے ذہن میں پیدا ہوا تھا۔ آوم عرصۂ دراز تک ہندوستان میں رہ چکا تھا اور اس نے دیکھا تھا کہ مغلیہ حکومت کے زوال کی وجہ سے ہندوستان میں جو طوائف الملوکی

برپا تھی، اُس نے سب سے زیادہ علم و ادب کو نقصان پہنچایا تھا۔ شاہانِ وقت کی سرپرستی اُٹھ جانے سے فارسی اور عربی کی نئی کتابوں کی اشاعت بے حد محدود ہو گئی تھی۔ اُدھر آئے دن کی خانہ جنگی سے اُمرا و اکابر کے کتب خانے بھی لُٹتے جا رہے تھے۔ ان حالات سے فائدہ اُٹھا کر کمپنی کے اکثر ملازم، بڑی نایاب کتابیں کوڑیوں کے مول خرید کر انگلستان لے آتے تھے۔ لیکن یہاں بھی چونکہ اُن کا کوئی قدردان نہیں تھا، اس لیے آہستہ آہستہ یہ ادبی نوادر ہندوستان اور انگلستان دونوں جگہ ختم ہوتے جا رہے تھے۔

آدم نے، ایسٹ انڈیا کمپنی کے ڈائرکٹروں کے سامنے یہ تجویز پیش کی کہ کمپنی کے مرکزی دفتر واقع لیڈن ہال سٹریٹ میں دو کمرے اِس قسم کی کتابوں کے لیے مخصوص کر دیئے جائیں۔ تاکہ عربی۔ فارسی اور سنسکرت کی وہ کتابیں جو کمپنی کے ملازم یہاں لاکر۔ بے احتیاطی سے ضائع کر دیتے ہیں، ایک جگہ محفوظ ہو سکیں۔ یہ تجویز مئی ۱۷۹۸ء میں پیش ہوئی۔ اس لیے بعض مبصروں کا خیال ہے کہ اس لائبریری کی بنیاد کی بھی گویا یہی تاریخ سمجھنی چاہیئے۔

ابھی یہ مسئلہ ڈائرکٹروں کے زیرِ غور تھا کہ ایک اور شخص چارلس ولکنز نے جس کے کان میں یہ بھنک پڑ گئی تھی کہ اس قسم کی لائبریری قائم ہونے والی ہے اپنی خدمات ڈائرکٹروں کے سامنے پیش کر دیں۔ ولکنز کمپنی کے ملازم کی حیثیت سے، مدت تک بنگال میں رہ چکا تھا اور بنگلہ فارسی اور سنسکرت تینوں زبانوں میں اچھی خاصی مہارت رکھتا تھا۔ ۱۷۸۵ء میں، اُس نے گورنر جنرل وارن ہیسٹنگز کے ایما پر بھگوت گیتا کا انگریزی میں ترجمہ بھی کیا تھا۔ چارلس ولکنز کی ذہانت اور

کوشش سے بنگلہ، ناگری اور فارسی حروف کے ٹائپ بھی تیار ہو گئے تھے۔ چنانچہ اٹھارھویں صدی کے ربع آخر میں، بنگال میں ان تینوں زبانوں کی کتابیں ٹائپ میں چھپنا شروع ہو گئی تھیں۔

ولکنز نے اوم کی ابتدائی تجویز پر بہت کچھ اضافہ کر کے لائبریری کا گویا بالکل نیا خاکہ ڈائرکٹروں کے پاس بھیجا تھا۔ اس خاکے میں، مجوزہ کتب خانے کے علاوہ ایک میوزیم کا نقشہ بھی درج تھا، جس کے تین حصے تجویز کئے گئے تھے پہلے حصے میں ہندوستان کے تمام حیوانات، نباتات اور معدنیات کے نمونے رکھے جائیں گے۔ دوسرے حصے میں ہر قسم کی مصنوعات ہوں گی۔ اور تیسرے حصے میں عہد عتیق کے تاریخی نوادر جمع کئے جائیں گے۔

آخر کار ۱۷۸۱ء میں وارن ہیسٹنگز کی سفارش پر کمپنی کے ڈائرکٹروں نے چارلس ولکنز کو دو سو پونڈ سالانہ تنخواہ دے کر لائبریرین مقرر کر دیا۔ لائبریری کا نام اورینٹل ریپازیٹری تجویز کیا گیا۔ اور اس کی روزبروز کارروائی کی مکمل روئداد، ڈے بک کے نام سے، اس وقت بھی محفوظ ہے۔ جس کے مطالعہ سے اس لائبریری کے تدریجی ارتقاء کی پوری تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے۔

کتابوں میں آہستہ آہستہ اضافہ ہونے لگا لیکن سب سے بڑی دقت یہ تھی کہ خود ہندوستان میں کمپنی کے حکام نے اسی قسم کے دو ادارے قائم کر رکھے تھے۔ جو اورینٹل ریپازیٹری کے سب سے بڑے حریف تھے۔ ایک ایشیاٹک سوسائٹی بنگال اور دوسرا فورٹ ولیم کالج کلکتہ۔ ہندوستان کے مختلف حصوں سے جتنی اچھی کتابیں ہاتھ لگتی تھیں وہ لندن پہنچنے کی بجائے ان دونوں اداروں کے قبضے میں چلی جاتی

تھیں۔ کمپنی کے ڈائرکٹروں نے اِس نقصان کو محسوس کر کے ۵ رجون ۱۸۰۵ء کو گورنر جنرل کے نام ایک سخت ڈانٹ سے بھرا ہوا خط لکھا کہ آئندہ تمام اچھی کتابیں، مسوّدے، پرانے سکّے اور فنونِ لطیفہ کے نمونے، کلکتہ میں رکھ لیے جانے کی بجائے لندن بھیجے جائیں۔ اِسی خط میں گورنر جنرل سے باز پرس کی گئی تھی کہ سرنگاپٹم کی فتح کے بعد ٹیپو سلطان کا جو کتب خانہ ہاتھ آیا تھا، وہ اب تک لندن کیوں نہیں بھیجا گیا۔

لائبریری کی ایک بک کا مطالعہ کیا جائے۔ تو اس قسم کے اکثر اندراجات نظر آتے ہیں کہ آج فلاں شخص نے ہاتھی کا ایک سر پیش کیا۔ آج فلاں شخص نے ہندوستان کے چند قدیم سکّے پیش کئے۔ آج فلاں شخص نے کسی ہندو دیوتا کا ایک سنگین مجسّمہ پیش کیا چونکہ کتب خانے اور میوزیم کی عمارت ایک تھی، اس لیے جو کچھ دستیاب ہوتا، اِسی عمارت میں محفوظ کر لیا جاتا تھا۔ تاہم لائبریری کے قیام کے بعد، پہلے ہی سال میں، جو قابلِ ذکر ذخیرۂ کتب ہاتھ آیا، وہ رابرٹ آدم کا ترکہ تھا، جو مرتے وقت اُس نے اِس لائبریری کو وصیّت کیا تھا۔

۱۸۰۴ء میں، نوو مب ڈل اور جان نیلر نے فارسی مخطوطات کا ایک ذخیرہ پیش کیا۔ اِسی سال کے آخر میں ڈیوڈ لانس نے چینی زبان کی بہت سی کتابیں پیش کیں آہستہ آہستہ ہندوستان کے علاوہ بغداد، استنبول اور بخارا تک سے عربی اور فارسی کے قلمی مسوّدے آنا شروع ہو گئے۔

۱۸۰۵ء میں چارلس ولکنز کو اُس سکول کا ڈریکٹر اور ممتحن بھی مقرر کر دیا گیا، جو ایسٹ انڈیا کمپنی نے لندن سے پچاس سا لھ میل کے فاصلے پر ہرٹ فورڈ میں قائم

کر رکھا تھا۔ اِس سکول میں کمپنی کے اُن آدمیوں کو، جو ہندوستان میں ملازمت کرنے کے خواہاں تھے، اُردو اور فارسی کی درسی تعلیم دی جاتی تھی۔ یہ سکول، جس نے انگلستان میں اُردو کی اچھی خاصی خدمت کی تھی، ۱۸۵۷ء تک قائم رہا۔ اس کی داستان بھی بڑی دلچسپ ہے۔

لائبریری کے بارے میں کمپنی کا رویہ کچھ اس قسم کا تھا کہ جہاں تک ممکن ہو کتابیں مفت مہیا کی جائیں۔ قیمت ادا نہ کرنی پڑے۔ چنانچہ لوگ جو کچھ عطا کرتے تھے محض اپنی خوشی سے دیتے تھے۔ ۱۸۰۷ء میں اس قاعدے میں تبدیلی کی گئی۔ اور فیصلہ ہوا کہ اگر اچھی کتابوں کی قیمت بھی ادا کرنی پڑے۔ تو بخل نہیں کرنا چاہیئے۔ چنانچہ اس نئے قاعدے کے تحت جو قابلِ ذکر ذخائر حاصل کئے گئے، اُن میں رچرڈ جانسن کا کتب خانہ تھا، جس کا معاوضہ تین ہزار گنی دیا گیا۔ ۱۸۰۹ء میں آٹھ سو پونڈ میں وارن ہیسٹنگز سے اور ۱۸۲۴ء میں پان سو پونڈ کے بدلے میں لیڈن کی کتابیں خریدی گئیں۔

رچرڈ جانسن تقریباً تیس سال کمپنی کی ملازمت میں کام کر چکا تھا۔ ۱۷۷۰ء میں وہ کلرک بھرتی ہو کر کلکتہ گیا تھا۔ پھر ترقی کرتے کرتے نظام حیدر آباد کے دربار میں ریزیڈنٹ کے عہدے تک پہنچ گیا تھا۔ جب واپس انگلستان آیا تو اُس کے پاس فارسی اور عربی کی گیارہ سو کے قریب نہایت بیش قیمت کتابیں تھیں۔ اور تیرہ سو کے لگ بھگ مصوری و نقاشی کے گراں قدر نمونے بھی تھے۔ وطن پہنچکر جانسن کی صحت یکایک خراب ہو گئی۔ اور بعض خانگی مصائب نے اُس کی مالی حالت کو بھی سخت مخدوش کر دیا۔ مجبوری کے عالم میں اُس نے کتابوں اور تصویروں کا یہ سارا ذخیرہ

لائبریری کے پاس فروخت کر دیا۔ نقادوں کی رائے ہے کہ یہ ذخیرہ تین ہزار گنی سے زیادہ مالیت کا تھا۔ وارن ہیسٹنگز نے جو کتابیں فروخت کیں، اُن کا بیشتر حصہ فارسی شعرا کے دواوین پر مشتمل تھا۔ جن کی جلدیں بڑی مطلا و مذہب تھیں۔ جان لیڈن پیشہ کے لحاظ سے ڈاکٹر تھا۔ لیکن زبان دانی کے اعتبار سے ایک حیرت انگیز شخص تھا۔ ۱۸۰۳ء میں، جب اُس کی عمر اٹھائیس سال تھی، اُس کا تقرر مدراس میں ہوا۔ ہندوستان جانے سے پہلے اُس نے یورپ کی تمام زبانوں میں مہارت پیدا کرنے کے علاوہ عربی اور فارسی بھی سیکھ لی تھیں۔ جنوبی ہند کے قیام نے اس کو تلگو اور ملیالم سے بھی آشنا کر دیا تھا۔ ۱۸۰۶ء میں اُسے فورٹ ولیم کالج میں ہندوستانی یعنی اُردو پڑھانے پر مامور کیا گیا۔ وہیں اُس نے سنسکرت اور فارسی کے بہت سے انگریزی تراجم کئے۔ کلکتہ سے وہ جاوا اور سماٹرا کے دورے پر چلا گیا، جہاں اُس نے جاوی زبان بھی سیکھ لی جسے وہ بڑی روانی سے بولنے اور لکھنے لگا تھا۔ جان لیڈن کی زندگی اگر وفا کرتی تو کمالاتِ زباندانی کی بنا پر وہ اُس دور کے مستشرقین میں غالباً سب سے نمایاں مقام حاصل کر لیتا۔ لیکن افسوس کہ عین عالمِ شباب میں جب کہ اُس کی عمر صرف چھتیس سال تھی، یکایک اُس کا انتقال ہو گیا۔ انڈیا آفس لائبریری نے پانسو پونڈ ادا کر کے اُس کی کتابیں خرید لیں۔

۱۸۷۶ء میں لائبریری نے سر ولیم جونز کی عربی، فارسی اور سنسکرت کی کتابوں کا ذخیرہ رائل سوسائٹی سے حاصل کیا۔ ولیم جونز کے متعلق کہا جاتا ہے کہ چالیس مختلف زبانیں جانتا تھا، جن میں تیرہ زبانوں پر تو اسے استادانہ عبور تھا۔ اور ستائیس زبانوں میں وہ نوشت و خواند کا کام کر سکتا تھا۔ پینتیس سال کی عمر میں اُس نے سبعہ معلقہ کا

انگریزی میں ترجمہ کیا تھا۔

جونز، ۱۷۸۳ء سے ۱۷۹۴ء تک کلکتہ ہائی کورٹ کا جج رہا۔ یہیں اُس نے بنگال ایشیاٹک سوسائٹی قائم کی۔ سنسکرت میں جونز کو ایسا کمال حاصل تھا کہ اُس دور کے بڑے بڑے پنڈت اُس سے استفادہ کرنا اپنے لیے باعثِ فخر سمجھتے تھے۔ کالیداس کے بیشتر ڈراموں اور وید مقدس کے بعض حصوں کو جونز نے انگریزی میں منتقل کیا تھا۔ مسلمانوں کے قانونِ وراثت اور ہندوؤں کے دھرم شاستر پر سب سے پہلے ولیم جونز نے دو بڑی بیش قیمت کتابیں تصنیف کی تھیں۔ ۱۷۹۴ء میں اس کا سینتالیس سال کی عمر میں، کلکتہ ہی میں انتقال ہوا۔

لائبریرین چارلس ولکنز کے اختیارات کا حلقہ اب خاصا وسیع ہو گیا تھا ہرٹ فورڈ کالج کا وزیٹر اور ممتحن ہونے کے علاوہ کمپنی کے ہندوستانی رجسٹرار کا دفتر بھی اُس کے تحت کر دیا گیا تھا۔ اِس کے علاوہ کمپنی کے وقائع نگار کا عہدہ بھی اُس کے سپرد ہو گیا تھا۔ لائبریری کے سٹاف میں بھی تین نئی اسامیاں پیدا کی گئی تھیں۔ اور پورے سٹاف کا نگراں ولکنز ہی تھا۔ چنانچہ اُس کی سالانہ تنخواہ بڑھتے بڑھتے اب سات سو پونڈ تک پہنچ گئی تھی۔

۱۸۰۹ء میں مہاراجہ بڑودہ نے فارسی اور سنسکرت کی کتابوں کی خاصی تعداد لائبریری کو نذر کی۔ ۱۸۱۹ء میں ہنری کولبروک نے سنسکرت کی دو ہزار کتابوں کا گراں بہا ہدیہ لائبریری کو پیش کیا۔ جہاں تک لائبریری کے حصہ سنسکرت کا تعلق ہے کولبروک کے اس عطیہ کو گویا لائبریری کا پشتیبان تصور کرنا چاہیے۔

ہنری کول بروک کا باپ سر جارج کول بروک، ایسٹ انڈیا کمپنی کے ڈائرکٹروں کے بورڈ کا صدر تھا۔ ہنری ۱۷۸۲ء میں کمپنی کی ملازمت اختیار کر کے ہندوستان چلا گیا۔ اکاؤنٹنٹ اور اسسٹنٹ کلکٹر کے ابتدائی عہدوں سے ترقی کرتے کرتے، وہ جج اور سفیر کے منصب پر پہنچ گیا اور آخر کار ۱۸۰۰ء میں اسے گورنر جنرل کی ایگزیکٹو کونسل کا رکن مقرر کیا گیا، جس سے بڑا سرکاری اعزاز اس زمانے میں کوئی نہیں تھا۔ اسی دوران میں لارڈ ویلزلی کی درخواست پر ہنری کول بروک نے کچھ مدت فورٹ ولیم کالج میں درس و تدریس کا کام بھی کیا۔

ہندوستان پہنچکر کول بروک نے سنسکرت کی تحصیل میں بڑی محنت کی تھی۔ چنانچہ ۱۷۹۴ء تک اسے سنسکرت میں فضیلت کا مرتبہ حاصل ہو گیا تھا۔ گورنر جنرل کے حکم سے، ایک برہمن، پنڈت جگن ناتھ نے مسلسل پندرہ سال کی محنت سے ہندو دھرم شاستر کو جدید طرز پر مرتب کیا تھا، اب اس عظیم الشان کتاب کا انگریزی میں ترجمہ کرنے کا کام کول بروک کے سپرد ہوا، جسے اس نے بڑی خوش اسلوبی اور محنتِ شاقہ سے انجام دیا۔

کول بروک کو ویدوں پر فاضلانہ عبور تھا اور ان صحائف کے ایک ایک لفظ کا اس نے بغور مطالعہ کیا تھا۔ چنانچہ سنسکرت کے نقادوں اور ہندو دھرم کے عالموں کی رائے ہے۔ کہ کول بروک نے ویدوں پر جو تنقید لکھی تھی وہ اپنے موضوع کے اعتبار سے ایک شاہکار کی حیثیت رکھتی ہے۔

سنسکرت کے علاوہ کول بروک کو ریاضی، علم ہیئت، علم النباتات، علم الحیوانات اور معدنیات میں بھی فضیلت کا مرتبہ حاصل تھا۔ ہندوستان

میں بتیس سال ملازمت کرنے کے بعد وہ ۱۸۱۵ء میں واپس انگلستان آگیا اور یہاں پہنچ کر اُس نے سنسکرت کی تمام کتابیں جن کی تعداد دو ہزار کے قریب تھی، انڈیا آفس لائبریری کو مفت نذر کر دیں۔ لائبریری کے کارپردازوں نے اظہارِ تشکر کے طور پر کولی بروک کا ایک مرمریں مجسمہ لائبریری کے برآمدے میں رکھ دیا جو آج تک وہاں موجود ہے۔

۱۸۷۰ء میں آرتھر برنل نے سنسکرت کی ساڑھے تین سو کتابیں لائبریری کو مفت نذر کیں اور برنل کے انتقال پر اُس کی بقیہ ساڑھے تین سو کتابیں لائبریری نے قیمت ادا کر کے خرید لیں۔ آرتھر برنل ۱۸۶۰ء میں جب کہ اُس کی عمر بمشکل بیس سال تھی، انڈین سول سروس میں بھرتی ہو کر ہندوستان چلا گیا تھا۔ اُس کی ملازمت کالپور اور جنوبی ہند میں بسر ہوئی۔ جہاں اُس نے محنتِ شاقہ اور زرِ کثیر خرچ کر کے سنسکرت کے بڑے نایاب نسخے حاصل کئے۔ سنسکرت کے علاوہ برنل کو عربی، فارسی، تامل، اُردو اور جاوی پر بھی پورا عبور حاصل تھا۔ لیکن اُس کی علمی کاوشوں کا بیشتر حصہ سنسکرت پر صرف ہوا۔ ۱۸۷۸ء میں، اُس نے حکومتِ مدراس کی درخواست پر مہاراجہ تنجور کے کتب خانے کے تمام مخطوطات کو ترتیب وار مرتب کر کے اُن کی ایک نہایت جامع فہرست تیار کی تھی۔ تنہا یہی کارنامہ برنل کے نام کو حیاتِ جاوداں بخشنے کے لیے کافی ہے۔ اس کے علاوہ اُس نے منو کے دھرم شاستر اور ہندوؤں کے قانونِ وراثت پر بھی کتابیں لکھیں۔ ۱۸۸۲ء میں بیالیس سال کی عمر میں اُس کا انتقال ہو گیا۔

۱۸۹۶ء میں ایک جرمن فاضل بوہلر نے سنسکرت کی ۳۲۱ کتابیں لائبریری

کی نذر کیں۔ بوہلر سنسکرت کا بہت بڑا عالم تھا، جسے اُس نے پیرس، لندن اور آکسفورڈ میں مسلسل کئی سال مقیم رہ کر، طالب علمانہ حیثیت سے سیکھا تھا۔ ابتدا میں اُس کا تقرر بمبئی کے الفنسٹن کالج میں سنسکرت پڑھانے پر ہوا تھا۔ لیکن بعد کو اُس کی خدمات حکومتِ ہند نے حاصل کر لی تھیں۔ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ بوہلر کی کوشش سے سنسکرت کے پانچ ہزار مسودے حکومتِ ہند کو میسّر آئے۔ ہندوستان میں اپنی ملازمت کی معیّنہ میعاد ختم کر کے بوہلر کو ویانا یونیورسٹی میں ہندوستانی زبانیں پڑھانے کا کام مل گیا تھا۔ وہیں ۱۸۹۹ء میں اُس کا انتقال ہوا۔

مخطوطات و مسودات کا ایک اور نادر مجموعہ سر آرل سٹائین کے توسّل سے لائبریری کو حاصل ہوا تھا۔ سر آرل سٹائین، وطنیت کے اعتبار سے، ہنگری کے باشندے تھے۔ لیکن بعد کو انھوں نے برطانوی قومیت اختیار کر لی تھی۔ اُن کا تقرر پہلے پہل لاہور میں اورینٹل کالج کے پرنسپل کے عہدے پر ہوا تھا، جہاں وہ ۱۸۸۸ء سے ۱۸۹۹ء تک پرنسپلی کے علاوہ پنجاب یونیورسٹی کے رجسٹرار کے فرائض بھی انجام دیتے رہے۔ لاہور ہی میں ان کے تعلقات سر ٹامس آرنلڈ، پروفیسر پی۔ ایس۔ ایلن، سر ایڈورڈ ڈگلس مکلیگن اور ہنری اینڈریوز سے استوار ہوئے جنھوں نے آگے چل کر مدت العمر کی دوستی کی صورت اختیار کر لی تھی۔ پی۔ ایس۔ ایلن گورنمنٹ کالج میں پڑھاتے تھے۔ ہنری اینڈریوز آرٹ سکول کے پرنسپل تھے اور ڈگلس مکلیگن سول سروس کے اہلکار تھے۔

آرل سٹائین طبعاً ایک صحرا نورد اور جہاں گرد قسم کے انسان تھے چنانچہ

اُنھوں نے اپنی صحرا نوردی کے لیے وسط ایشیا کو منتخب کیا۔ جہاں اُنھوں نے ایک بار نہیں بلکہ تین بار ہزاروں میل کا سفر پیدل کیا تھا۔ انہی صحرا نوردیوں کے دوران میں اُنھوں نے قدیم تبتی اور چینی زبانوں کے بے شمار مسودے حاصل کیے جو لکڑی کے تختوں اور پتھر کی سلوں کے علاوہ درختوں کی چھال اور پتوں پر مرقوم تھے سر آرل سٹائین نے یہ تمام مسودے انڈیا آفس لائبریری کو مفت پیش کر دیئے تھے۔

برائن ہاجسن نے دو ہزار کے لگ بھگ قلمی مسودے انڈیا آفس لائبریری کو نذر کیے۔ اِن میں چار سو کے قریب مسودے سنسکرت کے تھے اور باقی نیپالی زبان کے ہاجسن اٹھارہ سال کی عمر میں بھرتی ہو کر کلکتہ چلا گیا تھا۔ جہاں اُس نے فورٹ ولیم کالج میں داخل ہو کر فارسی کی تحصیل کی۔ پھر اُس کا تقرر اسسٹنٹ کمشنر کی حیثیت سے کمایوں کے علاقے میں ہوا۔ وہیں سے اُس کا تبادلہ نیپال ہو گیا۔ نیپال پر انگریزوں کا قبضہ بالکل تازہ تھا۔ اور ہنوز اُن کے پاؤں اچھی طرح جمے نہیں تھے۔ ہاجسن نے بہت جلد گورکھوں کی عسکری صلاحیت کو محسوس کر لیا تھا۔ چنانچہ اُسی کی سفارش پر ہندوستانی فوج میں گورکھوں کی بھرتی شروع کی گئی تھی۔ ہاجسن، لارڈ مکالے کی اِس تجویز کا سخت مخالف تھا کہ ہندوستان میں انگریزی کو ذریعۂ تعلیم قرار دیا جائے اُس نے ہندوستان کی مقامی زبانوں کی حمایت میں بار بار آواز بلند کی لیکن لارڈ مکالے کی زبردست شخصیت کے سامنے اُس کی پیش نہ جا سکی۔

۱۸۲۰ء سے ۱۸۴۳ء تک مسلسل تیئیس سال ہاجسن نیپال میں رہا۔ اور آخر مستعفی ہو کر واپس انگلستان آ گیا۔ لیکن سال بھر بعد، وہ پھر ہندوستان چلا گیا اور اب اُس نے نجی طور پر، ایک عام باشندے کی حیثیت سے دارجیلنگ میں قیام کیا

جہاں آئندہ تیرہ سال تک وہ تحقیق و تفتیش کے کام میں مصروف رہا۔

نیپال کی سیاسی، ادبی، معاشرتی اور زرعی و اقتصادی زندگی کے جملہ پہلوؤں پر جتنی کتابیں ہاجسن نے جمع کیں اور کوئی شخص نہیں کر سکا۔ یہ سارا ذخیرہ اُس نے انڈیا آفس لائبریری کو مفت پیش کر دیا۔ مئی ۱۸۹۴ء میں، ہاجسن کا لندن ہی میں انتقال ہوا۔ سر ڈینی سن راس نے بھی تبت پر بہت سی قلمی کتابیں جمع کی تھیں۔ جو ۱۹۰۷ء میں لائبریری نے حاصل کر لی تھیں۔

کالن میکنزی کا ذخیرۂ کتب بھی انڈیا آفس لائبریری نے خرید لیا تھا۔ میکنزی کا انتقال ۱۸۲۱ء میں کلکتہ میں ہوا تھا۔ تیس سال کے قریب اُس نے ہندوستان میں بسر کئے تھے۔ پانڈی چری کے محاصرے اور سرنگا پٹم کی فتح کے وقت وہ برطانوی فوج میں شامل تھا۔ جاوا اور لنکا کو جو برطانوی مہمیں بھیجی گئی تھیں۔ اُن میں بھی میکنزی کی موجودگی ثابت ہوتی ہے۔ اُس نے سرکاری طور پر جنوبی ہندوستان کے تمام علاقوں کا سروے کیا تھا۔ اور اسی سلسلہ میں اُسے جنوبی ہند کے ایک ایک گوشے سے واقفیت ہو گئی تھی۔ موت سے پہلے میکنزی کو پورے ہندوستان کا سروئیر جنرل بنا دیا گیا تھا۔ عربی۔ فارسی اور سنسکرت کی تمام کتابیں، جن کی تعداد دو ہزار سے کم نہ تھی۔ میکنزی کی وفات کے بعد، اُس کی بیوہ نے لارڈ ہیسٹنگز کے پاس فروخت کر دی تھیں۔ اور وہاں سے یہ ذخیرہ انڈیا آفس لائبریری میں پہنچا۔ کتابوں کے علاوہ پرانے سکے، سنگ تراشی کے مجسمے اور نقاشی کے نمونے بھی میکنزی کے پاس جمع تھے وہ بھی لندن آ گئے۔

سر فلپ فرانسس کا ذخیرۂ کتب بھی لائبریری نے خریدا۔ اس ذخیرے میں سب

سے بیش قیمت چیز سر فلپ کی دستاویزیں، رپورٹیں، شہادتیں، بیانات اور مطبوعہ وغیر مطبوعہ مضامین ہیں، جو پچاس جلدوں میں بند ہیں۔ سر فلپ فرانسس اور ہندوستان کے گورنر جنرل وارن ہیسٹنگز کی باہمی نزاع پر، ان جلدوں کے مطالعہ سے نئی روشنی پڑتی ہے۔

۱۸۲۵ء میں انڈیا آفس لائبریری نے فرانسس بکانن کی کتابوں کا مجموعہ بھی خرید لیا۔ بکانن ۱۷۸۳ء سے ۱۸۱۵ء تک ہندوستان میں مقیم رہا تھا۔ ابتداً میں وہ ایک ڈاکٹر کی حیثیت سے ایسٹ انڈیا کمپنی کی ملازمت میں شامل ہوا تھا۔ بعد کو اُسے میسور اور مالابار کی تاریخی، تمدنی اور زرعی تحقیقات کرنے پر مامور کیا گیا تھا۔ کچھ عرصہ اُس نے نیپال میں بھی بسر کیا تھا۔ پھر اُسے حلقۂ بنگال کی نباتات پر تحقیق کرنے کا کام دے دیا گیا تھا۔ اور ملازمت کے آخری دو برسوں میں وہ کلکتہ کے بوٹانیکل گارڈن کا مہتمم مقرر ہو گیا تھا۔

۱۷۹۹ء میں جب سرنگاپٹم پر انگریزوں کا قبضہ ہوا، تو ٹیپو سلطان کا کتب خانہ بھی انگریزی فوج کے ہاتھ آیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اس کتب خانے میں عربی، فارسی ترکی، دکنی وغیرہ مختلف زبانوں کے دو ہزار نسخے تھے۔ یہ کتب خانہ مسلسل کئی سال تک فورٹ ولیم کالج کلکتہ میں پڑا رہا۔ جب کمپنی کے ڈائرکٹروں نے بار بار طلبی کے خطوط لکھے تو ۱۸۳۸ء میں یہ کتب خانہ انڈیا آفس لائبریری میں منتقل کر دیا گیا تھا۔

۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے بعد جب دہلی کے لال قلعہ پر انگریزوں نے قبضہ کیا تو شاہانِ مغلیہ کی عظمتِ رفتہ کے ساتھ اُن کا لٹا پٹا کتب خانہ بھی انگریزوں کے ہاتھ

آیا۔ شاہجہاں کے وقت میں اِس کتب خانے میں چوبیس ہزار نسخے تھے۔ اٹلی کے مشہور سیاح سیبسٹین منریکے نے شاہجہاں کے عہد میں ہندوستان کا سفر کیا تھا۔ اُس کے سفرنامے کا انگریزی میں بھی ترجمہ ہو چکا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ ان چوبیس ہزار کتابوں کی جلدوں پر اس کثرت سے سونا چاندی منڈھا ہوا ہے کہ محض جلدوں کی مجموعی قیمت کا اندازہ کیا جائے تو یہ رقم چونسٹھ لاکھ، تریسٹھ ہزار، سات سو اکتیس روپے تک پہنچ جاتی ہے۔

بہادر شاہ ظفر کے وقت اِس حیرت انگیز کتب خانے کا بمشکل ایک چوتھائی حصّہ باقی رہ گیا تھا۔ اور اِس چوتھائی حصّے میں بھی شاہجہاں کے عہد کی کتابوں کا عنصر ۱/۵ سے زیادہ نہ تھا۔ سونے چاندی کی جلدیں، تختِ طاؤس اور خزانۂ شاہی کی طرح، ایرانیوں ابدالیوں، روہیلوں اور مرہٹوں کی ترکتازیوں کا شکار ہو چکی تھیں۔ تاہم ۱۸۵۷ء میں لال قلعہ کا جو بچا کھچا کتب خانہ انگریزوں کے ہاتھ آیا، اُس میں صرف تین ہزار چھ سو نسخے موجود تھے۔ جن میں عربی کی ۱۹۵۰۔ فارسی کی ۱۵۵۰ اور اُردو کی صرف ایک سو کتابیں تھیں۔ یہ مجموعہ ۱۸۶۵ء میں انڈیا آفس لائبریری میں شامل کیا گیا۔ اسی طرح جب برما پر انگریزوں کا قبضہ ہوا۔ تو برمی بادشاہ کا کتب خانہ بھی پہلے کلکتہ منتقل کیا گیا۔ دو سال وہاں پڑا رہا۔ پھر اُسے انڈیا آفس لائبریری میں شامل کر دیا گیا تھا۔

میں نے اُوپر صرف چند ذخائر کا ذکر کیا ہے۔ جو وقتاً فوقتاً انڈیا آفس لائبریری کی نذر ہوتے رہے۔ بعض مفت حاصل ہوئے۔ اور بعض کی قیمت ادا کی گئی۔ اگر اسی طرح تمام ذخیروں کی تفصیل بیان کی جائے تو یہ داستان بہت طویل ہو جائے گی۔ انفرادی طور پر، انگریز حکام نے لائبریری کو جو کچھ عطا کیا۔ اُس کی تفصیل کے لیے بھی ایک دفتر

درکار ہے۔ انڈین سول سروس اور فوج کے انگریز افسر پنشن لینے کے بعد، جب واپس انگلستان آتے تو اپنے مسودے، یادداشتیں، خطوط اور قلم بند کئے ہوئے سیاسی وغیر سیاسی تاثرات بھی لائبریری کو نذر کر دیتے تھے۔ ان چیزوں کے مطالعہ سے ہماری معلومات میں اُتنا ہی اضافہ ہوتا ہے جتنا مطبوعہ تصانیف دیکھنے سے۔

اِسی سلسلہ میں گذشتہ چند مہینوں میں لائبریری کو جو کچھ ملا ہے، اُس میں اٹھارھویں صدی کے مسودات کا ایک مجموعہ ہے، جسے لارڈ اومنتھ ویٹ نے لائبریری کے حوالے کیا ہے۔ اِس مجموعہ میں کلائیو کے بہت سے خطوط بھی موجود ہیں۔ لارڈ نارتھ بروک نے اپنے جدِ اعلیٰ کے تمام کاغذات لائبریری میں جمع کر دیئے ہیں۔ لارڈ نارتھ بروک اوّل ۱۸۷۲ء سے ۱۸۷۶ء تک ہندوستان کے وائسرائے تھے۔ لارڈ ہیلی ۱۸۹۸ء سے ۱۹۳۳ء تک انڈین سول سروس میں منسلک رہے اور اس اثنا میں وہ چار سال تک پنجاب کے گورنر بھی تھے۔ انھوں نے بھی اپنے تمام کاغذات لائبریری کے حوالے کر دیئے ہیں۔

مئی ۱۸۳۶ء میں چارلس ولکنز کا انتقال ہو گیا۔ اور لائبریرین کا عہدہ خالی ہوا چارلس ولکنز نے نہایت جاں فشانی سے پینتیس سال تک لائبریری کی خدمت کی تھی۔ وہ خود بھی عربی، فارسی اور سنسکرت کا ایک منجھا ہوا عالم تھا۔ مرنے سے تین سال پہلے اُسے نائٹ ہڈ کا اعزاز عطا ہوا تھا۔ آکسفورڈ یونیورسٹی نے اُسے اعزازی ڈاکٹریٹ بھی عطا کی تھی۔ ۱۸۷۸ء میں اُسے رائل سوسائٹی کا فیلو منتخب کیا گیا تھا۔ فرانس نے بھی اُسے اپنی انسٹی ٹیوٹ کا ممبر مقرر کیا تھا۔ ولکنز کی بیوہ نے اپنے شوہر کی وفات کے بعد عربی۔ فارسی اور سنسکرت کی تمام کتابیں انڈیا آفس

لائبریری کو نذر کر دیں۔

سر چارلس ولکنز کے بعد پروفیسر ہارلیس ولسن کو لائبریرین مقرر کیا گیا۔ ولسن پیشے کے اعتبار سے ڈاکٹر تھا۔ اور ایک ڈاکٹر ہی کی حیثیت سے ایسٹ انڈیا کمپنی میں ملازم ہو کر ہندوستان گیا تھا۔ وہیں اس نے اردو۔ فارسی اور سنسکرت میں مہارت پیدا کی تھی۔ کالیداس کے دو ڈراموں کو از سرِ نو ایڈٹ کر کے اُس نے شائع کیا۔ اور ۱۸۱۹ء میں اُس نے انگریزی اور سنسکرت کی لُغت مرتّب کی، جسے اس کی زندگی کا ایک عظیم الشّان کارنامہ سمجھنا چاہیئے۔ اور جب تک کہ ۱۸۷۵ء میں جرمنی سے لغت شائع نہیں ہوئی تھی۔ پروفیسر ولسن کی یہ لغت اپنی نوعیت کی بہترین تالیف تسلیم کی جاتی تھی۔ اِنڈیا آفس لائبریری کے تقرر سے پہلے۔ ہارلیس ولسن آکسفرڈ میں سنسکرت کا پروفیسر تھا۔

ولسن کے زمانے میں لائبریری کی کتابوں میں قابلِ قدر اضافہ ہوا۔ اس کے علاوہ ایک ضروری تبدیلی یہ بھی ہوئی کہ میوزیم، جو ابتدائے کار میں لائبریری کا ایک حصّہ تھا اب پھیلتے پھیلتے اور بڑھتے بڑھتے اتنا وسیع ہو گیا تھا کہ اُس کی نگرانی اور دیکھ بھال کے لیے ایک الگ آدمی رکھنا پڑا۔

۱۸۵۷ء میں جب ہندوستان میں غدر برپا ہوا تو لائبریری کا انچارج ہارلیس ولسن ہی تھا۔ غدر کے بعد ایسٹ انڈیا کمپنی کا دَور دَورہ ختم ہوا۔ تو ہندوستان کی حکومت بھی براہِ راست پارلیمنٹ کے قبضے میں چلی گئی۔ اب لائبریری کو لیڈن ہال سٹریٹ کی عمارت سے ہٹا کر کینن رو کے ایک مکان میں منتقل کر دیا گیا۔ اور میوزیم کو لائبریری سے ہمیشہ کے لیے علیحدہ کر دیا گیا۔

یہ لائبریری، جیسا کہ ابتدا میں عرض کیا جا چکا ہے۔ اورنٹل ریپازیٹری کہلاتی تھی۔ لیکن جب غدر کے بعد ہندوستان کے نظم و نسق کی نگرانی کے لیے لندن میں ایک الگ سرکاری دفتر انڈیا آفس کے نام سے کھولا گیا، تو لائبریری بھی اس دفتر کا ایک جزو قرار پائی۔ اور آئندہ اس کا نام انڈیا آفس لائبریری تجویز کیا گیا۔ انڈیا آفس کے دیگر شعبوں کی طرح یہ لائبریری بھی وزیر ہند کے تحت تھی۔

۱۸۶۰ء میں پروفیسر ہارس ولسن کا انتقال ہوا تو ڈاکٹر جیمز بیلنٹائن کو لائبریرین مقرر کیا گیا، جو اس سے قبل پندرہ سال تک گورنمنٹ سنسکرت کالج بنارس کے پرنسپل رہ چکے تھے۔ اور اُن کا نام ہندوستان کے گوشے گوشے میں پہنچ گیا تھا۔ موصوف نے بنارس کالج کی ترقی و تنظیم کے لیے جتنی کوششیں کیں، اُن کے نتائج آج ہندو یونیورسٹی کی صورت میں نظر آ رہے ہیں۔

ڈاکٹر بیلنٹائن، سنسکرت، فارسی اور اُردو کے عالم تھے۔ بالخصوص سنسکرت سے اُنھیں بے حد شغف تھا۔ اُنھوں نے ایک طرف سنسکرت کی کتابوں کے انگریزی تراجم کر کے اہلِ انگلستان کو ہندو تہذیب اور ہندو دھرم سے آشنا کیا۔ اور دوسری طرف مغربی سائنس اور فلسفہ کو سنسکرت میں منتقل کر کے ہندوؤں کو یورپ کی موجودہ علمی ترقیوں سے بھی روشناس ہونے کا موقع دیا۔ موصوف اُردو، فارسی اور سنسکرت کی کم سے کم سولہ کتابوں کے مصنف ہیں۔

ڈاکٹر بیلنٹائن کی صحت خراب تھی۔ اس لیے صرف چار سال انڈیا آفس لائبریری میں کام کر سکے۔ فروری ۱۸۶۴ء میں اُن کا انتقال ہو گیا تو نئے آدمی کی تلاش شروع ہوئی۔ بالآخر پروفیسر فٹز ڈورڈ ہال کا انتخاب عمل میں آیا۔ جو

ہارورڈ یونیورسٹی (امریکہ) کے تعلیم یافتہ اور اُردو فارسی اور سنسکرت سے بخوبی آشنا تھے ۱۸۶۹ء تک اُنھوں نے لائبریرین کے عہدے پر کام کیا۔ اور پھر بعض ذاتی مجبوریوں کی وجہ سے استعفا دے دیا۔

ڈاکٹر ہال بنارس کالج میں سنسکرت کے پروفیسر بھی رہ چکے تھے اس کے علاوہ لندن کے کنگز کالج میں بھی اُردو اور سنسکرت پڑھاتے رہے تھے۔ سول سروس کے امتحان میں وہ ہندی، اُردو اور سنسکرت کے ممتحن بھی تھے۔ ڈاکٹر ہال کے بعد ڈاکٹر رائن ہولڈ روسٹ لائبریرین مقرر ہوئے۔ قومیت کے اعتبار سے ڈاکٹر روسٹ جرمن تھے۔ اور اُن کی تعلیم و تربیت بھی تمام تر جرمنی میں ہوئی تھی شروع میں وہ جرمن زبان کے معلم کی حیثیت سے انگلستان آئے تھے اور کنٹربری میں اُن کا تقرر ہوا تھا۔ ڈاکٹر روسٹ کے متعلق مشہور ہے کہ کم و بیش تیس زبانوں سے واقف تھے۔ جن میں عربی، فارسی، سنسکرت، اُردو، ہندی، تامل۔ تلگو، کے علاوہ افریقی، جاوی، قبتی اور چینی زبانیں بھی شامل تھیں۔ کہا جاتا ہے کہ ایک ہمہ گیر زبان دان کی حیثیت سے صرف سر ولیم جونز کو اُن پر فوقیت دی جا سکتی ہے۔

ڈاکٹر روسٹ بہت سی کتابوں کے مصنف، مؤلف اور مترجم ہیں۔ لیکن اُن کی زندگی کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اُنھوں نے مسلسل چونتیس سال انڈیا آفس لائبریری میں محنت سے کام کیا۔ جس کے گہرے نقوش آج بھی لائبریری کے در و دیوار پر نظر آتے ہیں۔ ڈاکٹر روسٹ کے عہد میں دو بڑی تبدیلیاں وقوع میں آئیں۔ ایک یہ کہ لائبریری کو کینن رو سے اُٹھا کر، وائٹ ہال کی موجودہ عمارت

میں منتقل کیا گیا۔ اور دوسری یہ کہ ۱۸۷۶ء میں ایک قانون وضع کیا گیا۔ کہ آئندہ ہندوستان میں جو کتاب چھپے گی، اُس کا ایک نسخہ انڈیا آفس لائبریری کو لازماً بھیجا جائے گا۔

اِس قانون کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہندوستان میں بیسیوں زبانوں کی چھوٹی بڑی اچھی بری اور معمولی و غیر معمولی کتابیں چھپتی تھیں، اُن کی ایک ایک جلد باقاعدہ یہاں پہنچنے لگی۔ چنانچہ دیکھتے ہی دیکھتے انڈیا آفس لائبریری میں کتابوں کا ایک ایسا بوقلموں، رنگا رنگ، اور نادر ذخیرہ جمع ہو گیا، جس کی مثال شاید دُنیا کا اور کوئی کتب خانہ پیش نہیں کر سکتا۔ یہ قانون ۱۹۴۷ء تک نافذ رہا۔

ابتدا میں انڈیا آفس لائبریری کے ساتھ جو میوزیم قائم کیا گیا تھا، اُس کے لیے بدقسمتی سے کوئی مستقل عمارت مہیا نہ ہو سکی۔ وزیرِ ہند کی خواہش تھی کہ برطانوی حکومت اپنے خرچ سے ایسی عمارت بنوا دے، لیکن برطانوی حکومت نے انکار کر دیا۔ چنانچہ میوزیم کی تمام چیزیں لندن کے متعدد عجائب گھروں میں تقسیم کر دی گئیں۔ آج وہی نوادر ہمیں جیالوجیکل میوزیم۔ سائنس میوزیم۔ نیچرل ہسٹری میوزیم، وکٹوریا البرٹ میوزیم، کیو گارڈن میوزیم وغیرہ میں بکھرے ہوئے نظر آتے ہیں۔

ڈاکٹر روسٹ کے بعد پروفیسر چارلس ٹانے کا تقرر بطور لائبریرین کے ہوا۔ پروفیسر ٹانے، کیمبرج کے تعلیم یافتہ اور سنسکرت کے عالم تھے، اس سے قبل پریذیڈنسی کالج کلکتہ کے پرنسپل اور احاطۂ بنگال کے سررشتۂ تعلیمات کے ڈائرکٹر بھی رہ چکے تھے۔ ۱۹۰۳ء میں پروفیسر ٹانے لائبریری سے سبکدوش ہو گئے، تو اُن کی جگہ ڈاکٹر ایف۔ ڈبلیو۔ ٹامس کا تقرر ہوا۔ اور اُن کے ساتھ سر ٹامس آرنلڈ

اسسٹنٹ لائبریرین مقرر ہوئے۔ سر ٹامس آرنلڈ وہی بزرگ ہیں۔ جو لاہور کے گورنمنٹ کالج میں اقبال کے اُستاد تھے۔ اور جن کی یاد میں اقبال نے اپنی مشہور نظم نالۂ فراق لکھی تھی۔ آرنلڈ صرف چھ سال اسسٹنٹ لائبریرین رہے تھے لیکن اس مدت میں اُنھوں نے لائبریری میں عربی اور فارسی کی جتنی کتابوں کا اضافہ کیا پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔

موجودہ لائبریرین کا نام ایس۔ سی۔ سٹن ہے۔ جو بہت ذی علم اور وسیع المعلومات شخص ہیں۔ لائبریری میں کتابوں کی تعداد تین لاکھ کے لگ بھگ ہے۔ لیکن نئی کتابوں کا اضافہ برابر جاری ہے۔ یورپین زبانوں کے تحت ستر ہزار کے قریب کتابیں موجود ہیں۔ جن میں انگریزی، فرنچ، جرمن وغیرہ زبانوں کی مطبوعات شامل ہیں قلمی مسودے علیحدہ ہیں۔ جن کی صحیح تعداد کا تعین کرنا مشکل ہے۔ میرے اندازے کے مطابق ایک ہزار کے قریب بڑی بڑی جلدوں میں یہ مسودے بند ہیں۔ ان کے علاوہ کئی ہزار مسودے غیر مجلد بھی ہیں۔

ایشیائی زبانوں کے تحت عربی۔ فارسی، سنسکرت، پالی، تبتی، گجراتی، بنگلہ، ہندی، کشمیری، بلوچی، آسامی، مراٹھی، ملتانی، نیپالی، اوریائی، پنجابی، سندھی، اُردو، پشتو، کناڑی، تامل، تلگو، ملیالم، برمی، جاوی، ملائی، سیامی، ترکی، سنہلی وغیرہ کی کتابیں اور غیر مطبوعہ مسودے موجود ہیں۔

ان مسودوں میں بعض سونے چاندی کے پتروں پر مرقوم ہیں۔ بعض درختوں کی چھال اور پتوں پر۔ بعض ہاتھی دانت اور لکڑی کے ٹکڑوں پر۔ اور بعض جانوروں کی کھال پر لکھے ہوئے ہیں۔ مثلاً ۱۶۹۱ء میں کالی کٹ کے راجہ زموران اور ڈچ ایسٹ

انڈیا کمپنی کے درمیان جو معاہدہ ہوا تھا وہ ملیالم زبان میں سونے کے ایک پترے پر درج ہے۔ جس کا وزن تقریباً چودہ اونس ہے۔

اردو کی مطبوعہ کتابوں کی تعداد بیس ہزار کے قریب ہے۔ اور قلمی مسودے ۲۷۰ ہیں۔ جو دینیات، تاریخ، سوانح، تذکرے، قصص و حکایات، شعر و سخن، اخلاقیات، لغت، علم الادویہ، موسیقی وغیرہ متعدد موضوعوں پر مشتمل ہیں۔ تذکروں میں قائم چاند پوری کا مخزنِ نکات، میر قدرت اللہ خاں قاسم کا مجموعۂ نغز، مرزا لطف علی کا گلشنِ ہند، غلام قطب الدین باطن کا گلشنِ بے خزاں، خوب چند ذکا کا عیار الشعرا موجود ہیں۔

دواوین میں بعض نادر چیزیں بھی ملتی ہیں۔ مثلاً سید عبد الولی عزلت سورتی کا دیوان جو ۱۷۵۹ء کے لگ بھگ لکھا گیا تھا، نواب آصف الدولہ والیٔ اودھ کا دیوان۔ کلیاتِ زٹلی کے چار نسخے، حافظ الملک نواب حافظ رحمت خاں حاکم بریلی کے فرزندِ اکبر نواب محبت خاں کا دیوان۔ میر قدرت اللہ خاں قاسم دہلوی کے صاحب زادے میر عزت اللہ خاں عشق کا دیوان۔ حیدر آباد کی مشہور مغنیہ ماہ لقا بیگم چندا کا دیوان۔ علاء الدولہ، یمین الملک، سید محی الدین فقیر دہلوی، خلف نواب اعظم الدولہ کا دیوان، مرزا محمود بیگ شور، شاگردِ انشاء کا دیوان۔

کتابوں کے علاوہ انڈیا آفس لائبریری میں تصویروں کا بھی ایک لاجواب ذخیرہ موجود ہے جس میں فوٹوگرافی اور مصوری کے نمونے شامل ہیں۔ بیشتر تصویریں دورِ مغلیہ سے تعلق رکھتی ہیں۔ جن کی مجموعی تعداد ساڑھے تین ہزار کے قریب ہے۔ ان میں داراشکوہ کا مشہور البم بھی ہے جو اس نے اپنی محبوب بیوہ نادرہ بیگم کے لیے تیار

کرایا تھا۔ اور جس میں ایک سو چالیس تصویریں ہیں۔

فوٹوگرافی کے ذخیرے میں کم و بیش پچیس ہزار کے قریب تصویریں ہیں جن میں ہندوستان کے باشندوں سے لے کر معدنیات و نباتات تک ہر چیز کی عکاسی کی گئی ہے خطاطی و خوش نویسی کے بھی بعض بے مثال قطعے موجود ہیں۔ اس کے علاوہ ہندوستان کی قدیم پارچہ بافی کے نمونے بھی ہیں۔ مثلاً ڈھاکے کی ململ، بنارس کی زری، کشمیر کا شال۔ دلی کا گوٹا۔ لاہور کی سوسی، مرزاپور کے قالین، امرتسر کے دھسے،

اگست ۱۹۴۷ء میں چونکہ برعظیم ہند سے برطانوی قبضہ اٹھ گیا تھا۔ اور بھارت اور پاکستان، دو ملک معرضِ وجود میں آئے تھے، اس لیے وزیرِ ہند کا پرانا دفتر یعنی انڈیا آفس بھی ٹوٹ گیا۔ لیکن لائبریری کا نام بدستور انڈیا آفس لائبریری رہا۔ اس کا موجودہ انتظام دفتر کامن ویلتھ کے سپرد ہے۔

لائبریری کی عمارت کامن ویلتھ آفس کی تیسری منزل پر ہے جس کے عین وسط میں ریڈنگ روم ہے۔ جہاں روزانہ صبح ۹½ سے شام ۵½ بجے تک علم و ادب کے شائقین لکھنے پڑھنے میں مصروف رہتے ہیں، میں نے ۱۹۵۳ء سے گاہے ماہے یہاں آنا شروع کیا تھا۔ اس وقت سے اب تک ان لوگوں میں برابر اضافہ ہو رہا ہے۔ چنانچہ ۱۹۵۳ء میں یہ تعداد ۵۹۰۵ تھی۔ ۱۹۵۴ء میں ۶۸۲۸ ہوئی اور ۱۹۶۰ء میں آٹھ ہزار کے لگ بھگ ہو گئی ہے۔

اب میں خاتمۂ کلام پر یہ عرض کرنا اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ اس لائبریری کا یہیں لندن میں رہنا ہر اعتبار سے مستحسن اور ضروری ہے اسے کسی قیمت، کسی شرط اور کسی

معاہدے پر یہاں سے ہٹانا نہیں چاہیئے۔ اگر علم و ادب کا یہ گراں بہا خزانہ یہاں سے اُٹھا، تو یقین کیجئے کہ سو میں سے نوّے کتابیں ہندوستان چلی جائیں گی۔ اور مشکل سے دس کتابیں پاکستان کے حصّے میں آئیں گی۔ پھر اس قسم کی نقلِ مکانی سے فائدہ۔

میں ذاتی طور پر جانتا ہوں کہ پاکستان کے بعض لوگ آٹھ آٹھ، دس دس سال سے لندن میں مقیم ہیں اور بحدِ استعداد اس لائبریری سے استفادہ کر رہے ہیں۔ کوئی شخص ان سے تعرض نہیں کر سکتا۔ سال بہ سال بیسیوں طلبہ پاکستان سے یہاں آتے ہیں۔ اور اس لائبریری کے دروازے ہر وقت اُن کے لیے کھلے رہتے ہیں۔ لیکن دہلی کون جا سکے گا، اور جائے گا بھی تو کتنے دن ٹھہر سکے گا؟ بلاشبہ آج لاہور سے لندن آجانا آسان ہے۔ لیکن لاہور سے دہلی جانا مشکل ہے۔ تعجب ہے، کہ پاکستان کے بہت سے اخبار اور سیاست دان حالات کا جائزہ لیے بغیر یہ تقاضا کر رہے ہیں کہ انڈیا آفس لائبریری کو فوراً لندن سے منتقل کیا جائے۔ یہ شور و غوغا جس قدر جلد بند ہو جائے اچھا ہے۔

لندن کے ہندوستانی ہائی کمشن میں اس وقت ایک نہایت مفید اور بیش قیمت لائبریری موجود ہے۔ جس کی تعمیر و ترقی میں ہمارے گذشتہ پچاس سال صرف ہوئے تھے۔ اُس لائبریری کی ایک کتاب بھی پاکستان کو نہیں مل سکی۔ حیدر آباد اور بمبئی سے لے کر کلکتہ و دلّی تک بیسیوں کتب خانے موجود ہیں۔ جن کا بٹوارہ نہیں ہو سکا۔ تو پھر انڈیا آفس لائبریری کو ہندوستان منتقل کرنے پر پاکستان کو کیا کچھ مل جائے گا؟

لندن ۱۹۶۰ء

دیوانِ حافظ کا انگریزی مترجم

جان پین

قبولِ عام اور لطفِ سخن کو خداداد عطیہ کہا گیا ہے۔ کسی اور کے بارے میں یہ مقولہ سچ ہو یا غلط۔ لیکن جان پین کے بارے میں تو بلا خوفِ تردید کہا جا سکتا ہے کہ یہ شخص اپنی تمام صلاحیتوں اور کاوشوں کے باوجود قبولِ عام سے محروم رہا اور لطفِ سخن کی نعمت بھی اُسے میسر نہ آسکی۔

اُس نے سب سے پہلے دیوانِ حافظ کا انگریزی میں منظوم ترجمہ کیا۔ لیکن آج حافظ کے مترجمین کا ذکر کیا جاتا ہے تو کسی کی زبان پر جان پین کا نام نہیں آتا۔ اُس نے سب سے پہلے الف لیلہ کا انگریزی میں ترجمہ کیا۔ لیکن سر رچرڈ برٹن کا نام تو سب کو یاد ہے، جان پین کسی کو یاد نہیں۔ اُس نے رباعیاتِ عمر خیام کا منظوم ترجمہ انگریزی میں کیا لیکن قدرت نے فٹز جیرلڈ کو قبولِ عام کی لازوال دولت بخشی اور

جان پین کو اُس دولت کا ذرا سا حصّہ بھی نہ مل سکا۔

جان پین ۲۳ اگست ۱۸۴۲ء کو لندن میں پیدا ہوا تھا۔ اُس کا خاندانی نام ہاکنز پین تھا لیکن اُس نے ہاکنز کا لفظ محذوف کر کے صرف پین رہنے دیا۔ اُس کی تین بہنیں تھیں اور دو بھائی تھے۔ باپ کو کاروبار میں سخت خسارہ ہوا تو سارا کنبہ تنگ دستی میں مبتلا ہو گیا۔ اس لیے جان پین کو مجبوراً تیرہ ہی سال کی عمر میں سکول چھوڑ کر روٹی کمانے کا دھندا اختیار کرنا پڑا۔

پانچ سال میں اُس نے مختلف کام کئے، پہلے ایک نیلام گھر میں نوکری کی، وہ چھوڑی تو ایک لکڑی کے کارخانے میں مُنشی گری کا کام کیا۔ وہاں سے نکلا تو عمارتوں کی نقشہ نویسی کے دفتر میں کلرکی مل گئی۔ اُس سے علیحدہ ہو کر ایک اخبار میں کام شروع کیا اور وہاں سے خلاصی پائی تو ایک اسکول میں چپراسی ہو گیا۔ لیکن ان پانچ برسوں میں کیفیت یہ رہی، کہ جان پین کو دن کے وقت تو پیٹ پالنے کے لیے نوکری کرنی پڑتی تھی اور رات بھر وہ کتابوں کے مطالعے میں مصروف رہتا تھا۔ ملازمت سے جو تھوڑی بہت تنخواہ ملتی تھی، اُس سے کتابیں خرید لیتا تھا۔ حیرت انگیز امر یہ ہے کہ اِس دوران میں اُس نے محض اپنی ذاتی کوشش سے ترکی، عربی، فارسی، اطالوی، جرمن، ہسپانوی اور پرتگالی زبانیں سیکھ لیں۔ فرانسیسی، یونانی اور لاطینی تو اُس نے سکول ہی میں سیکھ لی تھیں۔ اب گویا وہ اپنی مادری زبان انگریزی کے علاوہ دس اور زبانوں میں نوشت و خواند کا کام کر سکتا تھا۔

چودہ سال کی عمر میں اُس نے شعر بھی کہنا شروع کر دیئے تھے۔ ڈانٹے کا پورا کلام اُس نے انگریزی میں منتقل کیا۔ گوئٹے اور بعض دیگر جرمن شعرا کی کتابوں کا بھی اپنی

زبان میں ترجمہ کیا۔ ۱۸۶۱ء میں جب کہ اُس کی عمر اُنیس سال تھی وہ مستقل طور پر لندن کے ایک سالسٹر کے دفتر میں ملازم ہو گیا۔ اس دفتر کی فضا اگرچہ ادبی تو نہ تھی، لیکن پچھلے تمام کاموں سے نسبتہً بہتر تھی۔

آہستہ آہستہ پین کا حلقۂ احباب وسیع ہونے لگا۔ ولیم موریس، ڈانٹے روسیٹی، میتھیو آرنلڈ، برن جونز، براؤننگ، گیب، سون برن، میڈکس براؤن، وغیرہ سے اُس کے مراسم قائم ہو گئے تھے۔ ۱۸۶۷ء سے اُس کی نظمیں لندن کے بعض مشہور رسالوں میں چھپنے لگیں۔ جن میں سینٹ جیمز میگزین، ٹمپل بار اور سینٹ پال میگزین زیادہ ممتاز تھے۔ ۱۸۷۰ء میں اُس کی نظموں کا پہلا مجموعہ "فانوسِ خیال" کے نام سے شائع ہوا۔ اگلے سال یعنی ۱۸۷۱ء میں، دوسرا مجموعہ "نقش و نگار" کے نام سے چھپ کر بازار میں آیا جس میں صرف سانیٹ جمع کئے گئے تھے۔ میتھیو آرنلڈ نے دل کھول کر تعریف کی، لیکن ساتھ ہی پین کو مشورہ دیا کہ سانیٹ کی بجائے طویل نظموں کو اظہارِ خیال کا ذریعہ بنانا زیادہ اچھا ہو گا۔

۱۸۷۲ء میں پین نے فرانس کا سفر کیا اور پیرس میں جن نامور ادیبوں سے اُس کی ملاقات ہوئی، اُن میں وکٹر ہیوگو بھی شامل تھا۔ وکٹر ہیوگو نے بعد میں ایک مرتبہ کہا تھا کہ "جان پین کو فرانسیسی ادب پر اتنا عبور ہے کہ خود فرانس کے بہت کم لوگ اُس کی برابری کر سکتے ہیں۔"

۱۸۷۳ء میں پین نے مشہور فرانسیسی شاعر ڈی لوں کے کلام کو انگریزی میں منتقل کرنا شروع کیا۔ ۱۸۷۷ء میں یہ ترجمہ شائع ہوا تو اہلِ فرانس نے بڑی گرمجوشی اور شکر گذاری سے اس کا استقبال کیا۔ موریس بوشور، مالارمے، دی بال ول

وغیرہ نے جی بھر کے تعریف کی۔ بوشور نے لکھا کہ "پین کے اس ترجمے سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ ایک جینیئس نے دوسرے جینیئس کے کلام کو اپنی زبان میں منتقل کیا ہے"۔ وی باں دِل نے پین کو ایک خط میں لکھا۔ "آپ نے یقیناً دی لوں کو اپنا شاگرد بنا لیا ہے۔ یہ کتنا بڑا اعزاز ہے جو آپ نے فرانس کو بخشا ہے اور کیسا گراں بہا تحفہ ہے جو آپ نے اپنے اہلِ وطن کو پیش کیا ہے"۔

دی لوں سے فارغ ہو کر جان پین نے الف لیلہ کا ترجمہ شروع کیا۔ چھ سال اُس نے مسلسل اس کام پر محنت کی۔ ۵ نومبر ۱۸۸۱ء کو لندن کے مشہور رسالہ ایتھینیم میں یہ خبر شائع ہوئی کہ پین نے الف لیلہ کا ترجمہ مکمل کر لیا ہے جو عنقریب کتابی صورت میں شائع ہوگا۔

یہ خبر سر رچرڈ برٹن کی نظر سے بھی گزری جو خود مدت سے الف لیلہ کو انگریزی میں منتقل کرنے کی تجویز پر غور کر رہا تھا۔ لیکن اب تک بعض وجوہ سے اس ارادے کو عملی جامہ پہنانے میں کامیاب نہیں ہوا تھا۔ برٹن نے فوراً ایتھینیم ہی میں ایک مراسلہ بھیج کر جان پین کے ترجمے کا خیر مقدم کیا۔

یہ خیال غلط ہے کہ رچرڈ برٹن نے جان پین سے پہلے الف لیلہ کا ترجمہ کیا تھا۔ ایتھینیم ہی کے مراسلے میں جو ۲۶ نومبر ۱۸۸۱ء کو شائع ہوا تھا برٹن لکھتا ہے:-

"الف لیلہ مشرقی تہذیب و تمدن کا ایک حیرت انگیز مرقع ہے۔ اس میں رنج و غم، عیش و نشاط، گناہ و ثواب اور زندگی کے عروج و زوال کی جس باریکی سے تصویر کشی کی گئی ہے وہ پڑھنے والے کو ایک اور ہی عالم میں پہنچا دیتی ہے۔ میں نے بھی مدت ہوئی اس کا ترجمہ کرنے کا ارادہ

کیا تھا لیکن میرا کام ہنوز مکمل نہیں ہو سکا۔ مجھے یہ سن کر بے حد خوشی ہوئی کہ مسٹر پین نے مشرقی ادب کے اس شاہکار کو انگریزی میں منتقل کر لیا ہے۔ دی لوں کو دیکھنے کے بعد یقین ہے کہ الف لیلہ کا ترجمہ بھی ہر اعتبار سے قابلِ تعریف ہو گا۔"

اس واقعہ کے بعد، رچرڈ برٹن اور جان پین میں دوستانہ مراسم قائم ہو گئے ۱۸۸۲ء میں پین کے ترجمے کی پہلی جلد شائع ہوئی اور آہستہ آہستہ پوری الف لیلہ کا ترجمہ نو جلدوں میں شائع ہو گیا۔ مکمل ترجمے کے پانسو نسخے چھپوائے گئے تھے اور نو جلدوں کے پورے سیٹ کی قیمت نو گنی تھی۔

عجیب بات یہ ہے کہ الف لیلہ کے ایک ایک لفظ کا ترجمہ پین نے اومنی بس میں بیٹھ کر کیا تھا۔ اس وقت لندن میں پٹرول سے بسیں نہیں چلتی تھیں۔ بلکہ گھوڑے کھینچتے تھے۔ بس کی چھت پر جان پین کتاب کھول کر بیٹھ جاتا اور لندن کی سڑکوں کے شور و شغب سے بے نیاز اور پاس بیٹھے ہوئے مسافروں کی موجودگی سے غافل، بے پروا اپنے کام میں مصروف ہو جاتا تھا، ہر شخص کا اپنا اپنا مزاج ہے۔ اکثر لوگ تنہائی اور خاموشی میں کام کرنا پسند کرتے ہیں۔ اس کے برعکس بعض ہنگامہ پسند طبیعتیں بھی ہیں۔ یہ لوگ چلتی پھرتی دنیا میں گھومتے رہتے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ لکھنے پڑھنے کا کام بھی کرتے جاتے ہیں، آئے دن روند سے ان کی یکسوئی میں خلل نہیں پڑتا۔

رچرڈ برٹن نے الف لیلہ کا جو ترجمہ کیا تھا۔ وہ ۱۲ ستمبر ۱۸۸۵ء کو شائع ہوا۔ زبان و ادب کے نقادوں کی آراء نقل کرنے کا یہ موقع نہیں، ورنہ میں بتاتا

کہ جن لوگوں نے پین اور برٹن کے تراجم ساتھ ساتھ رکھ کر پڑھے ہیں۔ اُن کا خیال ہے کہ برٹن کا ترجمہ پین کے ترجمے سے بہت ہلکا ہے۔ برٹن نے جگہ جگہ پین کی عبارت نقل کرنے سے بھی دریغ نہیں کیا اور جہاں اُس نے اپنی عبارت میں مفہوم ادا کیا ہے، وہاں اُس کا پیرایۂ بیان پین کے طرزِ تحریر کے سامنے بے کیف ہو کر رہ گیا ہے۔ وجہ ظاہر ہے۔ برٹن نے یہ ترجمہ بڑی روا روی میں کیا تھا۔ جان پین نے ۱۸۷۶ء سے ۱۸۸۲ء تک مسلسل چھ سال اِس کام پر صرف کئے تھے اور برٹن نے یہی کام دو سال میں مکمل کیا۔ اور اِن دو برسوں میں بھی وہ الف لیلہ کے علاوہ چند اور کتابوں کی تصنیف و تالیف میں مصروف تھا۔

سر چارلز برٹن کو ۱۸۸۶ء میں سر کا خطاب ملا۔ اور اکتوبر ۱۸۸۸ء کو وہ لندن سے آخری مرتبہ رخصت ہوا اور ۲۰ اکتوبر ۱۸۹۰ء کو الجزائر میں اُس کا انتقال ہو گیا۔ برٹن کے متعلق مشہور ہے کہ مسلمان ہو گیا تھا۔ اِس بارے میں کوئی قطعی شہادت ہمیں دستیاب نہیں ہو سکی۔ لیکن پین نے جگہ جگہ اس خیال کا اظہار ضرور کیا ہے کہ برٹن کے نزدیک اگر کوئی مذہب برحق تھا، تو اسلام تھا۔ ایک جگہ لکھتا ہے :-

"برٹن کے مذہبی عقائد کے بارے میں کچھ کہنا مشکل ہے۔ لیکن اگر وہ کچھ تھا تو مسلمان تھا۔ اُس کے نزدیک اِسلام ہی ایک ایسا مذہب تھا جو ایک قابلِ عمل اخلاقی نظام پیش کرتا ہے۔ ویدانت کی قسم کے مابعد الطبیعیاتی تصورات اُس کے دائرۂ خیال سے باہر تھے۔"

ایک اور جگہ لکھتا ہے :-

"ہمارے درمیان اکثر اس مسئلے پر بحث ہوا کرتی تھی اور برٹن کو میرے اس نظریے سے کلی اتفاق تھا، کہ عوام کے لیے اسلام سے بہتر کوئی اور مذہب نہیں، یہی ایک مذہب ہے جو ایک قابل عمل اخلاقی نظام پیش کرتا ہے اور جو پیشہ ور پادریوں کی اجارہ داری اور توہمات سے پاک ہے۔ برٹن کو میرے اس خیال سے بھی اتفاق تھا، کہ مستقبل قریب میں اسلام مسیحیت کو شکست دے کر دنیا بھر میں پھیل جائے گا۔ کیونکہ اخلاقی نظام کی حیثیت سے مسیحیت قطعاً کوئی قابل عمل اصول پیش نہیں کرتی۔"

الف لیلہ کے ترجمے سے فارغ ہو کر جان پین نے اٹلی کے دو مشہور ادیبوں بوکاشیو اور میتو بوندیلو کے ناولوں کا ترجمہ شروع کیا اور ۱۸۹۰ء میں اس کام سے فارغ ہوا۔ لیکن ان تراجم کے ساتھ ساتھ اس نے رباعیات خیام اور دیوان حافظ کا ترجمہ بھی شروع کر دیا تھا۔ خیام کی رباعیوں کا پہلی بار فٹز جیرلڈ نے ۱۸۵۹ء میں ترجمہ کیا تھا جو بے حد مقبول ہوا تھا۔ لیکن دراصل یہ ترجمہ نہیں بلکہ فٹز جیرلڈ نے عمر خیام کی شاعرانہ روح کو اس کی رباعیات سے نکال کر اپنے بے نظیر و سحر متمنع انداز میں انگریزی خواں دنیا کے سامنے پیش کیا ہے۔ جان پین نے اس کے برعکس رباعیات خیام کا لفظی ترجمہ کرنے کی کوشش کی، فارسی میں رباعی ایک خاص وزن میں لکھی جاتی ہے۔ انگریزی میں یہ صنف شعر سرے سے ناپید ہے۔ اس لیے یہاں اس قسم کا کوئی وزن موجود نہیں۔ تاہم پین نے رباعی سے ملتا جلتا وزن خود

ایجاد کیا اور اس بات کا التزام کیا کہ چاروں مصرعوں میں پہلا، دوسرا اور چوتھا مصرع ہم قافیہ ہوں۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ کام آسان نہ تھا۔ اوّل تو شعر بجائے خود ایک ایسی لطیف چیز ہے، کہ دوسری زبان میں اس کا ترجمہ ہو نہیں سکتا۔ اس پر جان پین نے عمر خیام کو لفظاً و معناً انگریزی میں منتقل کرنے کے لیے جو کڑی پابندیاں اپنے اوپر عائد کی تھیں انھوں نے اس کام کو اور زیادہ مشکل بنا دیا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا، کہ جب مکمل ترجمہ کتابی صورت میں شائع ہوا، تو چاروں طرف سے اعتراضات کی بوچھاڑ شروع ہو گئی۔ لوگ فٹز جیرلڈ کا عمر خیام پڑھنے کے عادی ہو چکے تھے، جہاں الفاظ نہیں مے و انگبیں کے گھونٹ ہیں، جن سے پڑھنے والا خوش کام بھی ہوتا ہے اور مدہوش بھی ہو جاتا ہے۔ جان پین کا ترجمہ اگرچہ لفظی و معنوی صحت کے لحاظ سے بے عیب اور عمر خیام کی صحیح تصویر تھا، لیکن قبولِ عام کی خلعت سے سرفراز نہ ہو سکا۔

رباعیات سے فارغ ہو کر پین نے ساری توجہ حافظ پر صرف کر دی۔ حافظ کا مداح تو وہ مدت سے تھا۔ بلکہ کہا کرتا تھا، کہ حافظ، ڈانٹے اور شیکسپیر دنیا کے سب سے بڑے شاعر ہیں۔ ایک اور جگہ لکھتا ہے۔ کہ:-

"حافظ، شیکسپیر، سقراط اور مندلسون[1] عام انسانوں سے بالکل مختلف نوعیت کے مالک ہیں۔ انسانی عظمت کو ناپنے کے لیے جو پیمانے

---

[1] مندلسون، جرمنی کا بہت بڑا فلسفی اور ادیب تھا، مذہب کے اعتبار سے یہودی تھا۔ ۱۷۲۹ء میں پیدا ہوا اور ۱۷۸۶ء میں فوت ہوا۔ اس کی قبر پر جو کتبہ لگایا گیا اس پر لکھا تھا کہ مندلسون جرمنی کا سقراط تھا۔

اب تک ایجاد ہوئے ہیں، اُن سے اِن چاروں کی عظمت کو ناپنا گناہ ہے۔ یہ لوگ بلاشبہ انسان ہیں۔ لیکن انسانوں کی دُنیا سے ماوراء ایک اور جہان کے رہنے والے ہیں۔ یہ لوگ حدود و قیود سے آزاد پیدا ہوئے اور اُس لالہ صحرائی کی طرح زمین سے اُگے، جسے انسانی ہاتھ کا لمس ملوّث نہیں کر سکا۔"

جان پین کی اس کوشش سے پیشتر انگلستان میں کوئی شخص حافظ سے واقف نہیں تھا۔ پین نے اِس کام پر ہاتھ ڈالنے سے پہلے حافظ پر فارسی اور ترکی میں جو کچھ لکھا گیا تھا اُس کا ایک ایک لفظ غور سے پڑھا اور اُس کے بہارستانِ شاعری کے ایک ایک گوشے کی سیر کی۔

حافظ اُن چند خوش نصیب شعرا میں سے ہے جن کی شراب کو اہلِ مشرق نے افشردۂ انگور کی بجائے شرابِ معرفت کا درجہ عطا کیا ہے۔ چنانچہ اُسے محض شاعر نہیں بلکہ لسان الغیب کا ارفع مقام حاصل ہے۔ جان پین کہتا ہے:۔

"حافظ کے جسم میں دو مختلف روحیں کام کر رہی ہیں۔ ایک روح اُس ملکوتی شاعر کی تھی، جو فضائے علوی کا رہنے والا تھا جس کے ہونٹوں سے شعلوں کی طرح سُرخ، تابناک اشعار الہامی نغمے بن بن کر نکلتے تھے، جو اِس خاکدانِ ارضی کی کثیف اور تاریک فضا میں سانس لینے کے باوجود، یہاں کی کثافتوں سے منزّہ و پاک تھا۔ جو اُس نورِ ازل کی جھلک دیکھ چکا تھا۔ جس کی چمک سے آنکھ آشنا ہو جائے تو کائنات کے تمام جلوے اپنا رنگ و روپ کھو بیٹھتے اور تمام

روشنیاں ماند پڑ جاتی ہیں۔ جس کے کانوں نے وہ نغمۂ سرمدی سن لیا تھا، جسے سننے کے بعد سازِ زندگی کی ہر لَے بے کیف اور چنگ و رباب کا ہر ترنّم بے آہنگ ہو کر رہ جاتا ہے۔ جس کا دل اُس برقِ تجلّی سے منوّر تھا، جس کے ایک پرتو سے ارض و سما کی پہنائیاں جگمگا اُٹھتی ہیں۔

دوسری روح اُس انسان کی تھی جس نے عیشِ امروز کے بدلے نقدِ حیات بیچ ڈالا تھا۔ حافظ اِس روح کو ایک دیو سے تعبیر کرتا ہے جو فرشتوں کے رخصت ہونے کے بعد اُس کے جسم میں حلول کر جاتی تھی، جس کے نزدیک زندگی عبارت تھی مئے کہنہ و معشوقِ جواں سے، جو رات کو گردنِ مینا میں ہاتھ ڈال کر سوتا اور دن ہنگامہ گستری میں بسر کرتا تھا، جو فطرت کے لاڈلے بچے کی طرح غمِ فردا سے بے نیاز و بے خبر رہنا چاہتا تھا، جو زندگی کے اِس تیز رو دھارے سے جلد از جلد اپنی پیاس بجھانا چاہتا تھا، جو آبِ رکناباد کو بھی پانی نہیں بلکہ مئے و انگبیں سمجھ کر پیتا تھا، جس کی دریا دلی کا یہ عالم تھا، کہ رخسارۂ ماہ وش کے تِل کے بدلے سلطنتیں اور خزانے لٹا دینے سے دریغ نہ کرتا، جو بہار کی ایک دل افروز صبح کو کنجِ باغ میں بیٹھ کر بلبل کی ہمنوائی کرنا عقبیٰ کی نعمتوں سے بڑھ کر عزیز رکھتا تھا، جو عالمِ سرخوشی میں پائے ساقی پر سر رکھ کر بہشت کے خواب دیکھتا تھا، جو چاندنی راتوں میں آبِ رواں کے کنارے رامش و رنگ کی محفلیں برپا کرتا اور بادۂ تند کے

ایک پیالے میں زندگی کے غموں کو گھول کر پی جاتا تھا۔

ہم کیوں حافظ کو برا بھلا کہیں؟ اس کشاکشِ روزگار کے زمانے میں جب کہ زندگی کے مصائب نے چھکے چھڑا دیئے ہیں، ہم کیوں شیراز کے اس مغنیٔ آتش نفس کو رشک کی نگاہوں سے نہ دیکھیں، جس نے اپنے نغموں سے زندگی کی تلخیوں کو بھی شہد کی طرح شیریں بنا کر ہمارے حلق سے نیچے اتار دیا ہے۔"

دیوانِ حافظ کا ترجمہ کرنا کوئی آسان کام نہ تھا۔ دیوان میں چھ سو پندرہ غزلیں ہیں، مثنویاں، رباعیاں، قصائد، ترکیب بند، ترجیع بند وغیرہ شامل کئے جائیں تو اس قسم کی نظموں کی تعداد بھی ستر تک پہنچ جاتی ہے، اس عظیم الشان ذخیرے کو اصل بحر کے اندر رہ کر انگریزی میں منتقل کرنا ایک ایسا جان جوکھوں کا کام تھا کہ خود پین نے اس معرکے سے فارغ ہو کر کہا تھا۔ کہ:۔

"میں حافظ کی وادیٔ پرخار میں سے برہنہ پا گزرا ہوں اور میرے پاؤں کانٹوں سے چھلنی ہو گئے ہیں۔"

نقادوں کی رائے ہے کہ دیوانِ حافظ کے ترجمے پر پین نے جس قدر محنت کی تھی اس کے سامنے تو الف لیلہ کا ترجمہ گویا بچوں کا کھیل معلوم ہوتا ہے۔ چنانچہ جب یہ ختم ہوا تو پین کی صحت جواب دے چکی تھی۔

سوال کیا جا سکتا ہے کہ یہ ترجمہ ہے کیسا؟ صاف سیدھا جواب ہے کہ پین نے فن کے لوازم و محاسن برقرار رکھنے کی خاطر سے لطفِ سخن کو نظر انداز کر دیا ہے۔ فن کے قواعد سے سرِ مو انحراف نہیں کیا گیا۔ لیکن ان پابندیوں

کے حصار میں حافظ کی رندی و سرخوشی، جوش و سرمستی اور جولانی و شگفتگی دب کر رہ گئی ہے۔ امر واقعہ یہ ہے کہ پین نے عمر خیام کی طرح حافظ کا بھی لفظی ترجمہ کیا ہے اور رباعیاتِ خیام کی طرح یہ ترجمہ بھی لفظی و معنوی صحت کے اعتبار سے یقیناً بے عیب ہے لیکن شعریت مفقود ہے۔

بایں ہمہ یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ پین پہلا شخص ہے جس نے انگریزی دنیا کو حافظ سے روشناس کیا، دیوانِ حافظ کو بحر اور وزن کی قیود کے ساتھ انگریزی نظم میں منتقل کرنا ہنسی کھیل نہ تھا۔ پین کا ترجمہ دس ہزار اشعار پر مشتمل ہے جو تین جلدوں میں شائع ہوا تھا۔ کل چھ سو پچھتر نسخے چھپوائے گئے تھے اور تین جلدوں کی مجموعی قیمت تین گنی رکھی گئی تھی۔

ترجمے کے شروع میں پین نے بطورِ تمہید جو طویل نظم لکھی ہے۔ وہ حافظ کی بارگاہ میں عقیدت و نیازمندی، مدح و ستائش اور محبت و شیفتگی کا ایک ایسا سدا بہار گلدستہ ہے جس کی تازگی مرورِ زمانہ کے ہاتھوں کبھی ماند نہیں پڑ سکتی۔ کاش، میری جگہ کوئی قادر الکلام شاعر ہوتا جو پین کی اس نظم کا ترجمہ نظم ہی میں کر سکتا۔

پین کہتا ہے:-

"اے راہِ حیات کے تھکے ہارے مسافرو! اے آلامِ روزگار کے ستائے ہوئے رہ نوردو!

اے وہ لوگو! جو چھلاوے کی طرح غائب ہو جانے والی موہوم امیدوں کے سراب میں مارے مارے پھرتے ہو۔

اے فریب خوردگانِ وفا و فیقو! جن کی امیدوں کا قصر برف کے گالے

کی طرح پگھل کر رہ گیا ہو۔۔۔ اِدھر آؤ!

تم ——— جو اِس جفا پیشہ اور ستم آشنا دنیا کے ہاتھوں تنگ آ چکے ہو۔

تم ——— جو اپنے پہلو میں شعلوں کی طرح دہکتا اور زخموں سے رِستا ہوا دل چھپائے پھرتے ہو۔

سُنو ——— میری آواز سُنو! میں تمہارے تمام دُکھوں کا علاج کرنے آیا ہوں۔

میں وہ ہوں ——— جس کی چشمِ حقیقت بیں نے اَن دیکھی اور اَن جانی دنیاؤں کا راز پہچان لیا ہے۔

میں وہ ہوں ——— جس کا دستِ شفا، اُن پریشانیوں کا مداوا ہے، جو تمہارے دلوں کو پارہ پارہ کر رہی ہیں۔

میں وہ ہوں ——— جس کے ساغرِ مے کے ایک گھونٹ سے مسرتِ جاودانی حاصل ہوتی ہے

میں وہ ہوں ——— جس کی مسیحائی، زخموں سے چُور چُور انسان کو اندمال کی نعمت بخشتی ہے۔

میں حافظ ہوں ——— حافظِ شیراز۔ رشکِ صد بہاراں، سرزمینِ ایران کا فرزند۔

میں اپنے نغموں سے ستاروں کا رُخ بدلتا اور آفتاب و ماہتاب کو وجد

میں لاتا ہوں۔

دیکھو! میری مٹھیاں جواہرات سے بھری ہوئی ہیں۔ جو میں اُس دُنیا سے لایا ہوں، جسے انسان کی آنکھ نے آج تک نہیں دیکھا۔

دیکھو! میرے ہاتھ موتیوں سے بھرے ہوئے ہیں جنھیں میں اُن خواب گوں جزیروں سے نکال کر لایا ہوں جن تک انسان کی رسائی نہیں ہوئی۔

دیکھو! میرا دامن ہیروں سے لدا ہوا ہے، جن کی روشنی سے تمھاری روح کی تاریکیاں آناً فاناً مٹ جائیں گی۔

یہاں آؤ! ..... میرے پاس خونِ جگر کی طرح سُرخ اور تابناک لعل ہیں۔

میرے پاس سُنہرے یاقوت ہیں، جن کی شعاعوں سے تاریک سائے تحلیل ہو کر نابود ہو جاتے ہیں۔

میرے پاس آسمان سے اُترے ہوئے پکھراج اور نیلم ہیں، جن سے تمھارے سارے دُکھ درد کافور ہو جائیں گے۔

مناسب یہی معلوم ہوتا ہے کہ میں حافظ کی ایک غزل اور پین کا ترجمہ پہلو بہ پہلو نقل کر دوں۔ تاکہ کام کا کسی حد تک جائزہ لیا جا سکے۔

حافظ

رفتم بباغ صبحدمے تا چنم گُلے — آمد بگوش ناگہم آوازِ بُلبُلے

مسکیں چو من بعشقِ گُلے کشتۂ بلا — داند چمن نگندہ ز فریاد و غلغلے

می گشتم اندر آں چمن باغ دم بدم — می کردم اندر آں گل و بلبل تاملے

گل یار خار گشت و بلبل قرین عشق — آں را تغیرے نہ و ایں را تبدلے

چوں کرد در دلم اثر آوازِ عندلیب — گشتم چنانکہ ہیچ نماندم تحملے

بس گل شگفتہ می شود ایں باغ را ولے — کس بے جفائے خار نچیدست از و گلے

حافظ مدار امیدِ فرح از مدارِ چرخ
دارد ہزار عیب ندارد تفضلے

جان بین

I - I WENT TO THE GARDEN ONE MORNING, THAT
I MIGHT PLUCK A ROSE, WHEN, SUDDENLY, FULL
IN MY HEARING, THE SONG OF A BULBUL ROSE,

2- WITH LOVE FOR A ROSE AFFLICTED, LIKE ME
WAS THE WRETCH BECOME AND SO TO THE
MEADOW- BREEZES WAS CASTING HIS TALE
OF WOES.

3- THE GRASS OF THAT GARDEN OFTEN I'VE
COMPASSED ABOUT SINCE THEN AND STILL
ON THE ROSE AND THE BUL-BUL MY FANCY
MUSING GOES-

4.- THE ROSE OF THE THORN THE COMRADE,
THE BUL BUL OF GRIEF BECOME, THUS STILL
HATH IT BEEN AND WILL BE FOREVER WITH
THESE AND THOSE,

5- SINCE THUS ON MY HEART HATH FALLEN
THE VOICE OF THE NIGHTINGALE NO PATIENCE
WITH ME ABIDETH TO SUFFER ESTRAGEMENT'S
THROES

6- FULL MANY A ROSE IN THE GARDEN HATH
BLOSSOMED OF THIS OUR WORLD, BUT NO
ONE, WITHOUT A THORN-PICK, E'ER GATHERED
THEREOF A ROSE-

7- HAFIZ, NO HOPE OF JOYANCE HAVE FROM
THIS ROUND OF LIFE, FOR IN IT A THOUSAND
THORN-SPIKES AND NOT ONE ROSEBUD GROWS,

دیوانِ حافظ کے ترجمے سے فارغ ہو کر میں نے فردوسی کے شاہنامے کا
بھی انگریزی میں ترجمہ کرنے کا ارادہ کیا تھا اور اس مضمون کا اعلان بھی بعض اخباروں
میں شائع ہو گیا تھا۔ لیکن تصنیفی کاموں کے ہجوم میں وہ اس قدر الجھ گیا تھا کہ

شاہنامے کے لیے فرصت نہ مل سکی۔

جان پین نے جتنا کام کیا ہے، اُس کا مجموعی جائزہ لینا آسان نہیں۔ طبع زاد تصانیف سے ہٹ کر اگر صرف ترجمے پر نگاہ ڈالی جائے تو عربی، فارسی، ترکی، فرانسیسی، جرمن، اطالوی اور ہسپانوی زبانوں کے تراجم کا ایک سربفلک انبار ہمارے سامنے آجاتا ہے اور ہم حیرت و مسرت اور مرعوبیت کے ملے جلے جذبات کے اندر ڈوب کر رہ جاتے ہیں کہ ایک اولوالعزم انسان اپنی چند روزہ زندگی میں کیوں کر قلم کے زور سے، پہاڑوں کو کاٹ کر جوئے علم بہا سکتا ہے۔ موت سے پہلے پین نے جس آخری کتاب کا ترجمہ کیا، وہ بھی عربی کی ایک کتاب تھی۔ یعنی تاریخ یمن۔

زندگی کے آخری سال میں جان پین کی بصارت بالکل زائل ہو گئی تھی اور وہ سورج کی روشنی دیکھنے سے بھی معذور تھا۔ پاس بیٹھنے والے تیمارداروں میں سے کوئی شخص نظم و نثر کی کوئی کتاب بلند آواز سے پڑھ کر سناتا تھا۔ لیکن تلفظ کی غلطی یا لہجے کی کرختگی، پین کے لیے ناقابل برداشت تھی۔ چنانچہ اس امر کا خاص اہتمام کیا جاتا تھا کہ پڑھنے والے کا لہجہ اور تلفظ ہر لحاظ سے درست ہونا چاہیے۔ بالآخر ۱۱ فروری ۱۹۱۶ء کو تہتر سال کی عمر میں اُس کا انتقال ہو گیا۔[1]

پین نے ۱۸۹۲ء میں سالسٹر کے دفتر کا کام ترک کر دیا تھا۔ کتابوں سے چونکہ اچھی خاصی آمدنی ہونے لگی تھی اس لیے اپنے آپ کو کلیتہً اُس نے تصنیف و تالیف کے لیے وقف کر دیا تھا۔ زندگی، معاشرت، ادب اور اپنے ہم عصر شعرا

---

[1] جان پین کا انتقال لندن میں جنوبی کنسنگٹن کے ایک محلہ بولمٹن میں مکان ۲۸ میں ہوا تھا۔ یہ مکان میری موجودہ قیام گاہ سے پندرہ منٹ کے فاصلے پر ہے۔

کے بارے میں جان پین نے وقتاً فوقتاً جن خیالات کا اظہار کیا تھا، اُن کی یادداشت اُس کے دوست ٹامس رائٹ[1] نے اپنے پاس محفوظ کر لی تھی، رائٹ سر رچرڈ برٹن کا بھی دوست تھا اور اُس نے برٹن کی ایک نہایت اچھی سوانح عمری بھی لکھی ہے۔ ٹامس رائٹ کی اِس یادداشت سے پین کے خیالات و افکار کے بعض گوشوں پر بڑی دلچسپ روشنی پڑتی ہے۔

نطشے کے متعلق اُس کی رائے ہے کہ وہ بڑا آدمی تھا۔ اُس کا فلسفہ میرے نزدیک زندگی کا محرک ہے، دستور العمل نہیں۔ اُس کی سترہ مجلدات ہر وقت میرے مطالعہ کی میز پر موجود رہتی ہیں۔ نطشے نے اپنے فلسفے پر جو نوٹ قلم بند کئے تھے انھیں عہدِ حاضر کے ادب کی گویا معراج سمجھنا چاہیئے۔ قدرت کی ستم ظریفی ہے کہ گلیڈسٹون تو نوے سال تک زندہ رہا اور نطشے چوالیس سال ہی کی عمر میں مر گیا۔ اُس نے زندگی کے مسائل کو بالکل نئے انداز سے سلجھانے کی کوشش کی تھی۔ وہ بیک وقت شاعر بھی تھا اور فلسفی بھی۔ اُس نے اخلاق کے تمام اُصولوں اور قاعدوں کو از سرِ نو مدوّن کیا ہے۔ اُس کا یہ فقرہ کس قدر بلیغ ہے کہ فکر و نظر کی بلندی کا معیار یہ ہے کہ ایک شمع کی روشنی میں طلوعِ آفتاب کی جلوہ پاشیوں کا نظارہ کیا جائے۔"

اپنی قوم کے متعلق کہتا ہے "انگریز اوّل درجے کی منافق قوم ہے۔ ہم لوگ سخت جذباتی قسم کے انسان ہیں، لیکن اپنی جذباتیت کو سنجیدگی کے پردے میں چھپانے کی کوشش کرتے ہیں۔ دراصل بات یہ ہے کہ ہمیں اپنے جذباتی ہونے پر شرم آتی ہے۔"

سُوِن برن کے متعلق اُس کی رائے ہے کہ "جوانی میں خوب شراب پیتا تھا تو شعر

---

[1] THOMAS WRIGHT

بھی اچھے کہتا تھا۔ اب شراب ترک کر چکا ہے، تو سنجیدگی نے اُس کی شاعری کو بھی ختم کر دیا ہے۔ لیکن بلاشبہ وہ ایک جینئس ہے اور اُس کی بدیہہ گوئی کا تو جواب نہیں۔"

والٹر پیٹر کے بارے میں کہتا ہے "پیٹر اور شوپنہار کا کیا مقابلہ۔ جو بات شوپنہار دو لفظوں میں کہہ جاتا ہے، پیٹر کو اُس کے لیے پوری کتاب لکھنی پڑتی ہے پیٹر کی جڑیں بہت گہری نہ تھیں۔ اُس میں بینا کاری کی صلاحیت تو ضرور تھی لیکن بڑے پیمانے پر کام کرنے کی اہلیت سے محروم تھا۔ کسی بڑے کام کو تکمیل تک پہنچانے کے لیے جس قسم کے صبر و ضبط اور تحمل کی ضرورت ہے وہ پیٹر کو میسر نہ تھا۔"

بکل کے متعلق اُس کی رائے ہے کہ "قدرت نے اُس کو وجدان کی نعمت بدرجۂ غایت عطا کی تھی اور اس چیز نے اُس کی علمی خامیوں کا ازالہ کر دیا تھا۔"

ٹینی سن کے بارے میں کہتا ہے "اپنی تمام صلاحیتوں کے باوجود اُس نے مجھے کبھی متاثر نہیں کیا اور میں ہمیشہ اس کو بہت معمولی شاعر سمجھتا رہا ہوں۔ اُس کی مادیت پرستی نے اُسے اُن لوگوں میں یقیناً مقبول بنا دیا تھا جن کی ذہنی سطح کچھ ایسی بلند نہیں۔"

وِسلر کے متعلق کہتا ہے "اگر وہ کوشش کرتا تو بہت کچھ کر سکتا تھا لیکن اُس نے شہرت حاصل کرنے کے لیے محنت کی بجائے ہتھکنڈوں پر انحصار کیا اور ظاہر ہے کہ جو شہرت ہتھکنڈوں سے حاصل کی جائے گی اُس کی عمر ہی کتنی ہوگی۔"

آسکر وائلڈ نے اپنے ناول ڈورین گرے کی ایک جلد ہدیۃً جان مین کو پیش کی تھی۔ اور سرورق پر اپنے قلم سے یہ الفاظ لکھے تھے۔

"ادب کے عظیم الشان فن کار جان پین

کی خدمت میں

ہدیۂ ناچیز"

اس کے باوجود پین، وائلڈ کے بارے میں کہتا ہے "گلیڈسٹون کی طرح وہ بھی انیسویں صدی کا ایک شعبدہ باز تھا۔ اِدھر اُدھر سے اوروں کے فقرے اُڑا لیتا تھا اور ان پر اپنی مُہر لگا کر چلاتا تھا۔"

میتھیو آرنلڈ کے بارے میں اس کی رائے ہے کہ "آرنلڈ سے میری میل ملاقات تو آغازِ جوانی ہی میں ہو گئی تھی، لیکن اچھے گھرے مراسم دیر میں جا کر قائم ہوئے تھے سُنوں برس کے بعد آرنلڈ ہی ایک شخص ہے جس کو میں اُستاد مانتا ہوں۔ اِن معنوں میں نہیں کہ میں نے اس سے کچھ سیکھا ہے۔ بلکہ محض اس کی مہارتِ فن اور تعریف و تحسین کے اظہار کے لیے۔"

ڈانٹے روسیٹی کے متعلق اس کا خیال تھا کہ "روسیٹی میں آمد بالکل نہیں تھی۔ اس کی شاعری تمام تر آورد ہے۔ اس کی نظمیں پڑھیے تو یوں معلوم ہوتا ہے گویا کسی مشین میں ڈھل کر نکلی ہیں۔ میں نے دیکھا ہے وہ ایک سانیٹ کو بارہ بار، چودہ چودہ مرتبہ لکھتا تھا۔"

پین ترکوں کا بڑا مداح تھا کہتا ہے "ترک دُنیا کے بہترین سپاہی ہیں۔ افسوس اُن کو اچھے لیڈر نہیں ملے۔ محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) نے منافقت کو سب سے بڑا گناہ قرار دیا ہے۔ ترک صاف دل اور صاف زبان لوگ ہیں، اُن میں منافقت بالکل نہیں اسی لیے تو گلیڈسٹون اُن کا دشمن تھا۔"

جان پین کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ کسی کو اپنے لکھنے پڑھنے کے کمرے میں داخل نہیں ہونے دیتا تھا۔ اُس کا قول تھا کہ مصنف کا دارالمطالعہ ایک مقدس جگہ ہے جہاں کسی نااہل کو قدم رکھنے کی اجازت نہیں۔ اس ضمن میں ٹامس رائٹ نے ایک واقعہ بیان کیا ہے۔ کہ "میں ایک روز جان پین کے دارالمطالعہ میں بیٹھا باتیں کر رہا تھا کہ اُس کا بھائی ہیری پین بغیر اجازت کے اندر آگیا۔ جان پین نے سخت غصے کے عالم میں اُسے کھڑے کھڑے وہاں سے نکال دیا اور ڈانٹ کر کہا "جانتے نہیں کہ ایک مصنف کا دارالمطالعہ کسی خاتون کی خواب گاہ کی مانند ہے، جہاں نامحرم کو قدم رکھنے کی اجازت نہیں۔"

ٹامس رائٹ سے ایک مرتبہ پوچھا گیا تھا کہ وکٹورین دور کے سب سے بڑے سات ادیب اور شاعر کون تھے۔ تو اُس نے بالترتیب اِن لوگوں کے نام گنوائے تھے۔ کارلائل، تھیکرے، ڈکنز، مکالے، فٹز جیرلڈ، سوئن برن، جان پین۔ پین کی وفات پر ٹامس رائٹ نے جو تعزیتی مقالہ لکھا تھا، اُس کے آخر میں کہتا ہے:۔

"ایک مترجم اور ایک شاعر کی حیثیت سے جان پین کو انیسویں صدی کے آخری اور بیسویں صدی کے ابتدائی دور کے انگلستان کا سب سے بڑا آدمی تسلیم کرنا پڑتا ہے۔ ایک وقت یقیناً ایسا آنے والا ہے، جب اُس کی طبعزاد تصانیف کا صحیح جائزہ لیا جائے گا۔ تو دُنیا اِس نتیجے پر پہنچنے پر مجبور ہو گی۔ کہ جان پین کے ہمعصر شعرا میں سے سوائے سوئن برن کے اور کوئی شخص اُس کی ہمسری یا برابری

کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ مترجم کی حیثیت سے تو اُس کا کوئی مقابل نظر نہیں آتا۔ اگر نظم سے ہٹ کر صرف نثر پر غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ جو موضوع جان پین نے اپنے لیے چن لیا ہے اُس میں وہ ہر لحاظ سے یکتہ و تنہا ہے، اور دُنیا کے کسی مُلک اور کسی دَور کے مصنّف کا نام اس ضمن میں اُس کے ساتھ نہیں لیا جا سکتا۔ اُس نے کلبرن کو (لندن کا ایک محلّہ جہاں پین نے اپنی عمر کا بیشتر حصّہ صرف کیا تھا) دنیائے ادب میں اُسی عزّت و احترام کا مستحق بنا دیا ہے۔ جس طرح شیراز۔ ایوینیو[1] اور وائمر حیاتِ جاوداں حاصل کر چکے ہیں۔

سرزمینِ انگلستان سے محبّت کرنے والوں کو فخر کرنا چاہیئے کہ جان پین جیسا عظیم الشّان ادیب بھی انگلستان کا باشندہ تھا۔"

لندن ۱۹۶۱ء

---

[1] شیراز میں حافظ کا مزار ہے۔ ایوینیو (جنوب مشرقی فرانس) میں جان سٹوارٹ مل دفن ہے اور وائمر (جرمنی) میں گوئٹے کا مرقد ہے۔)

اقبال کے اُستاد

ڈاکٹر مک ٹیگرٹ

علامہ اقبال ۱۹۰۵ء سے ۱۹۰۷ء تک، دو سال، کیمبرج میں رہے۔ وہ ٹرنٹی کالج میں فلسفے کے طالب علم تھے۔ جن اساتذہ سے اُنھیں وہاں شرفِ تلمذ حاصل ہُوا۔ اُن میں سرِ فہرست ڈاکٹر مک ٹیگرٹ کا نام ہے۔ یہ تعلق ابتدائیں اُستاد اور شاگرد کی حیثیت سے پیدا ہُوا تھا جس نے آگے چل کر، ہم خیالی اور ہم ذوقی کے باعث، دوستی کا رنگ اختیار کر لیا تھا۔ چنانچہ جب تک ڈاکٹر مک ٹیگرٹ زندہ رہے، اُن کے اور اقبال کے درمیان خط و کتابت کا سلسلہ برابر جاری رہا۔

ڈاکٹر مک ٹیگرٹ کا پورا نام جان مک ٹیگرٹ[1] ایلس مک ٹیگرٹ تھا۔ وہ ۳ ستمبر ۱۸۶۶ء کو لندن میں پیدا ہوئے تھے۔ اُن کے والد کا نام فرانسس ایلس تھا لیکن بعد کو اُنھوں نے اپنا خاندانی نام بدل کر ایلس کی بجائے مک ٹیگرٹ رکھ لیا

---

[1] JOHN MC TAGGART ELLIS MC TAGGART

تھا۔ چار سال کی عمر میں مک ٹیگرٹ کے والد کا انتقال ہو گیا اور آئندہ اُن کی تعلیم و تربیت کا سارا بوجھ اُن کی والدہ کے کندھوں پہ آ پڑا۔

مک ٹیگرٹ کی ابتدائی تعلیم ٹے برج کے قصبے میں ہوئی جہاں سے وہ کلفٹن کے پبلک سکول میں چلے گئے۔ اُنیس سال کی عمر میں اُنھیں کیمبرج کے ٹرنٹی کالج میں داخلہ مل گیا اور ۱۸۸۸ء میں اُنھوں نے بڑے اعزاز سے فلسفے میں درجۂ اوّل کی ڈگری حاصل کی۔ ۱۸۹۰ء میں مک ٹیگرٹ کی والدہ اپنے بچوں کو لے کر نیوزی لینڈ چلی گئیں لیکن مک ٹیگرٹ کو چونکہ کیمبرج کے ٹرنٹی کالج کا فیلو منتخب کر لیا گیا تھا اس لیے وہ انگلستان ہی میں رہے۔ چند سال بعد اُنھیں ٹرنٹی کالج میں باقاعدہ لیکچرار مقرر کر دیا گیا اور یہ درس و تدریس کا سلسلہ ۱۹۲۵ء تک قائم رہا۔

۱۸۹۸ء میں مک ٹیگرٹ اپنی والدہ سے ملنے نیوزی لینڈ گئے جہاں اُنھوں نے ایک شریف گھرانے میں شادی کر لی۔ مک ٹیگرٹ کی بیوی نہایت مہذب، ہمدرد اور خوش اطوار خاتون تھی جس کی رفاقت مک ٹیگرٹ کے لیے انتہائی راحت اور مسرت کا سرچشمہ ثابت ہوئی۔

ڈاکٹر مک ٹیگرٹ ستائیس سال کیمبرج میں فلسفے کا درس دیتے رہے۔ اُن کی علمی زندگی بڑی خاموش، پُرسکون اور اطمینان بخش تھی جس میں سیاست کے ہنگامے بار نہ پا سکتے تھے۔ لیکن مک ٹیگرٹ اپنی بعض خصوصیتوں کے اعتبار سے بڑے دلچسپ انسان تھے۔ مثلاً وہ ہستیٔ باری تعالےٰ کے منکر تھے لیکن حیاتِ بعد الموت کے قائل تھے۔ اُنھیں مروّجہ رسمی مذاہب سے کوئی تعلق نہ تھا لیکن کلیسائے انگلستان (چرچ آف انگلینڈ) کے بڑے حامی تھے۔ جب ایک مرتبہ اُن سے اِس تضادِ خیالی

کی وجہ دریافت کی گئی تو انھوں نے جواب دیا کہ ہر شخص تو مک ٹیگرٹ نہیں کہ مذہبی قیود سے بے نیاز ہو کر بھی اخلاق اور معاشرت کے ضابطے کی پابندی کر سکے۔ عوام کو سیدھے راستے پر قائم رکھنے اور ملک میں یک جہتی پیدا کرنے کے لیے چرچ کی سخت ضرورت ہے۔ حیاتِ بعد الموت کا عقیدہ رکھنے کے باوجود ڈاکٹر مک ٹیگرٹ تناسخ کے بھی قائل تھے۔ اُن کا خیال تھا کہ انسان کی روح کو عرفان حاصل کرنے کے لیے بار بار کئی زندگیوں میں سے گذرنا پڑتا ہے۔

جب ۱۹۲۰ء میں کیمبرج کے پروفیسر نکلسن نے اقبال کی مثنوی اسرارِ خودی کا انگریزی میں ترجمہ شائع کیا تو مک ٹیگرٹ نے اقبال کو ایک خط میں لکھا۔

"مجھے آپ کی مثنوی پڑھ کر بے حد خوشی ہوئی، لیکن آپ نے اپنے خیالات میں یہ تبدیلی کیونکر پیدا کر لی۔ جب آپ یہاں تھے اور ہمارے درمیان فلسفیانہ بحثیں ہوا کرتی تھیں تو آپ وحدت الوجود کے سخت قائل تھے۔ اب اسی نظریے کی آپ مخالفت کرتے ہیں"

اس خط میں آگے چل کر مک ٹیگرٹ اقبال کو لکھتے ہیں کہ

"سوال غالباً اپنے اپنے ملک کے مقامی اور قومی تقاضوں کا ہے۔ مجھے آپ سے اتفاق ہے کہ ہندوستان ضرورت سے زیادہ اندرون بینی اور تفکر میں مبتلا ہے۔ اس کے برعکس انگلستان ہی نہیں پورا یورپ اس تفکر سے محروم ہے۔ آپ کو ہم سے عمل کا درس لینا چاہیے اور ہمیں آپ سے غور و فکر کی نعمت حاصل کرنی ضروری ہے"

اقبال نے ایک مرتبہ اپنے ایک مضمون میں لکھا تھا کہ جب وہ کیمبرج میں پڑھتے تھے اور قریباً روزانہ ڈاکٹر مک ٹیگرٹ سے ملاقات ہوتی تھی تو گفتگو ہر پھر کر ہستیٔ باری تعالےٰ پر آ کر ٹھہر جاتی تھی۔ مک ٹیگرٹ خدا کے وجود سے انکار کرتے تھے۔ اور اُن کے زبردست دلائل کے سامنے اگرچہ اقبال کی زبان بند ہو جاتی تھی لیکن وہ اقبال کو اپنا ہم خیال کبھی نہ بنا سکے۔

اِس کے باوجود اقبال کی رائے ہے کہ مک ٹیگرٹ کا فلسفہ ایک خاص قسم کا تصوف تھا جس نے عقل کی روشنی میں اُن کو یزداں شناسی کا راستہ دکھایا۔ وہ مک ٹیگرٹ کو ایک صوفی کا مرتبہ عطا کرتے ہیں اور اس سلسلے میں مک ٹیگرٹ کے ساتھ امام غزالی۔ فلاطینوس اور برگساں کے نام بھی لیتے ہیں۔ اقبال کا خیال ہے کہ صوفیا اپنی واردات قلب کا اظہار دوسروں سے نہیں کرتے کیونکہ یہ واردات سراسر انفرادی وجدان پر منحصر ہوتی ہیں جنھیں عام لوگ سمجھنے سے معذور ہیں۔ اسی طرح مک ٹیگرٹ بھی اپنے قلبی واردات دوسروں سے بیان نہیں کرتے تھے۔

کیمبرج میں مک ٹیگرٹ کا حلقۂ احباب خاصا وسیع تھا۔ روجر فرائی۔ نیتھینیل ویڈ اور جی ڈکنسن تو یونیورسٹی میں اُن کے ہم عصر تھے۔ اس کے علاوہ آرتھر بالفور۔ ہالڈین۔ ٹامس ہارڈی اور سر فرانسس بینگ ہز بنڈ اُن سے ملاقات کے لیے اکثر آتے رہتے تھے۔ یوں بھی مک ٹیگرٹ کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اُن میں دوست بنانے کی خاص صلاحیت تھی۔ اکثر ایسا ہوتا کہ وہ کیمبرج سے لندن آتے تو گاڑی کے مختصر سے سفر میں اپنی خوش گفتاری سے لوگوں کو اپنا گرویدہ بنا لیتے تھے۔ حالانکہ پاس بیٹھے ہوئے مسافروں کو معلوم تک نہ ہوتے پاتا کہ جس شخص کے ساتھ وہ باتیں کر رہے ہیں وہ انگلستان

کا ایک بہت بڑا فلسفی ہے۔

ڈاکٹر مک ٹیگرٹ کے فلسفیانہ افکار کے متعلق کچھ عرض کرنا میرا منصب نہیں کیونکہ میں صرف فلسفے کے مبادی سے واقف ہوں۔ مک ٹیگرٹ، ہیگل کے بڑے مداح تھے۔ اور انھوں نے ہیگل کے فلسفے کی شرح تین جلدوں میں لکھی ہے۔ لیکن بعض نقادوں کی رائے ہے کہ مک ٹیگرٹ کی بہترین تصنیف دی نیچر آف ایگزسٹنس THE NATURE OF EXISTENCE ہے۔

فلسفے کے علاوہ مک ٹیگرٹ کو شعر و ادب کا بھی نہایت اچھا مذاق تھا۔ اُن کے مطالعہ کی رفتار اس قدر تیز تھی کہ ہر روز ایک ناول ختم کرتے تھے۔ ڈکنز کے ناولوں کا ایک ایک لفظ انھوں نے پڑھ ڈالا تھا۔ ہارڈی اور میریڈتھ کے اکثر ناول بھی اُن کے مطالعہ سے گذر چکے تھے۔ شعرا میں سے انھیں سوئن برن۔ عمر خیام۔ پوپ اور شیکسپیر نسبتاً زیادہ محبوب تھے۔ تاریخ کا انھیں کچھ خاص ذوق نہیں تھا۔ لیکن مشاہیر کی خود نوشت سوانح عمریاں اور مکاتیب بڑے شوق سے پڑھتے تھے۔ سیاسی عقائد کے اعتبار سے وہ ٹوری تھے۔ لیکن بعض معاملات میں اُن کے خیالات ٹوری پارٹی سے بھی مختلف تھے۔ مثلاً وہ اس بات کے حامی تھے کہ عورتوں کو ووٹ دینے کا حق ضرور ملنا چاہیئے۔ اس کے علاوہ بین الاقوامی تجارت سے تمام پابندیاں اُٹھا لینے کی بھی حمایت کرتے تھے۔ جب ۱۹۱۴ء کی جنگ عظیم شروع ہوئی تو مک ٹیگرٹ نے پوری تن دہی سے برطانوی حکومت کی مدد کی۔ اس لحاظ سے اُن کی حب الوطنی ایمان کے درجے تک پہنچ گئی تھی۔ جب برٹرنڈ رسل نے جنگ کی مخالفت میں ایک پمفلٹ شائع کیا تو محض فرض شناسی

کے احساس سے مک ٹیگرٹ نے رسل سے تمام تعلقات منقطع کر لیے اور کیمبرج سے برٹرنڈ رسل کو نکلوانے میں خود مک ٹیگرٹ کا بہت بڑا حصّہ تھا۔

دسمبر ۱۹۲۴ء کی تعطیل میں مک ٹیگرٹ اور اُن کی اہلیہ لندن آئے اُس وقت مک ٹیگرٹ کی صحت بظاہر بہت اچھی تھی۔ اور خوش و خرّم دکھائی دیتے تھے۔ یکایک ایک روز اُن پر قلب کی بیماری کا حملہ ہوا۔ اُنھیں فوراً ہسپتال پہنچا دیا گیا۔ لیکن تمام کوششیں بے کار ثابت ہوئیں اور ۱۸ جنوری ۱۹۲۵ء کو اُن کا انتقال ہو گیا۔

وفات سے ایک روز پہلے، جب اُنھیں یقین ہو گیا کہ اب وہ زندہ نہیں رہ سکتے، تو انھوں نے اپنی بیوی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہا "جانِ من! تم سے جدا ہونے کا غم تو ضرور ہے۔ لیکن تم جانتی ہو، میں موت سے بالکل نہیں ڈرتا۔"

علامہ اقبال کی رائے ہے کہ موت سے بے خوفی اور بے اعتنائی کا یہ دو ٹوک اظہار وہی شخص کر سکتا ہے جس نے حقیقتِ کبریٰ کا مشاہدہ اپنی آنکھ سے کر لیا ہو۔ عجیب اتفاق ہے کہ خود اقبال کی وفات سے ایک روز پہلے، جب تیمارداروں نے اضطراب اور پریشانی کا اظہار کیا تو علامہ مرحوم نے فرمایا کہ "میں مسلمان ہوں۔ میں موت سے نہیں ڈرتا۔"

رُباعیاتِ عمرِ خیّام کے انگریزی ترجمے کا پس منظر

پچھلے دنوں لندن کے مرکزی علاقے میں کتابوں کی ایک چھوٹی سی دکان دیکھنے کا اتفاق ہوا جس کے طفیل انگلستان میں ایک عظیم الشّان ادبی تحریک ظہور میں آئی تھی۔ بعض نقّاد تو یہاں تک کہہ گزرتے ہیں کہ اِس سے بڑی تحریک اِس مُلک کی ادبیات میں آج تک رونما نہیں ہوئی۔

لیسٹر سکوئیر سے چیرنگ کراس روڈ پر آئیں تو دائیں ہاتھ ایک گلی میں جس کا نام کیسل سٹریٹ ہے۔ یہ دُکان موجود ہے۔ مالک کا نام برنرڈ کوریچ تھا۔ اور اِسی نام سے یہ دُکان اب تک موسوم ہے، اِس دکان نے عمر خیام کی رباعیات کا ترجمہ، جسے فٹز جیرلڈ نے مکمل کیا تھا، پہلی مرتبہ ۱۸۵۹ء میں شائع کیا

تھا۔ یہ ترجمہ کیوں کر ہوا، کتاب چھپ کر پہلے قعرِ گمنامی میں کیسے پڑی رہی، اور بعد میں کیوں کر روشناسِ خلق ہوئی۔ اور پھر آہستہ آہستہ شہرت و ناموری کی منزلیں طے کرتی ہوئی ہفت آسمان پر کس طرح پہنچی۔ یہ ساری داستان بڑی دلچسپ ہے۔

فٹز جیرلڈ کا ایک دوست کوول آکسفرڈ میں پڑھتا تھا۔ اور فارسی کا دلدادہ تھا۔ اسی نے فٹز جیرلڈ کو فارسی کی تحصیل کی طرف متوجہ کیا۔ اور ابتدا میں صرف و نحو کے چند درس خود دیئے۔ آہستہ آہستہ فٹز جیرلڈ چل نکلا۔ اور فردوسی۔ حافظ۔ سعدی۔ عطار اور جامی کا کلام شوق سے پڑھنے لگا۔ اس نے سعدی اور جامی کی بعض متفرق نظموں کے ترجمے بھی انگریزی میں کئے۔ کوول کو اتفاق سے آکسفرڈ کی بادلین لائبریری میں رباعیاتِ خیام کا ایک نسخہ مل گیا۔ جس کی اس نے فوراً دو نقلیں کر لیں۔ ایک نقل خود رکھ لی اور دوسری فٹز جیرلڈ کو دے دی، خیام سے اس وقت تک انگلستان میں کوئی شخص واقف نہیں تھا۔ ۱۸۵۶ء میں کوول کو کلکتہ میں ملازمت مل گئی۔ اور وہ ہندوستان چلا گیا۔

کوول کے جانے کے بعد فٹز جیرلڈ نے مشرقی زبانوں کے مشہور فرانسیسی عالم گارساں دتاسی کو رباعیاتِ خیام کی ایک نقل بھیجی۔ اور ساتھ یہ بھی لکھا کہ اگر پیرس کے کتب خانوں میں عمر خیام کی رباعیوں کے نسخے موجود ہوں تو ان کی نقول حاصل کر لی جائیں۔ لیکن اسے پیرس سے کوئی نسخہ دستیاب نہ ہوا، بلکہ دتاسی نے جواب میں لکھا کہ وہ خود اس سے قبل خیام کے نام اور کام سے بالکل ناآشنا تھا۔

البتہ کوول کو کلکتہ پہنچ کر بنگال ایشیاٹک سوسائٹی کے کتب خانے میں رباعیات کا ایک مسودہ مل گیا۔ جس کی ایک نقل اُس نے فٹز جیرلڈ کو بھیجدی۔

سال بھر تک یہ دونوں نسخے فٹز جیرلڈ کے زیرِ مطالعہ رہے۔ اور جوں جوں اُس نے رباعیات کے الفاظ و معانی پر غور کیا شاعری کی نئی نئی راہیں اُس کی آنکھوں کے سامنے بے نقاب ہونے لگیں۔ اسی زمانے میں اُس نے اپنے دوست الفریڈ ٹینی سن کو جو خطوط لکھے اُن میں وقتاً فوقتاً عمر خیام کا ذکر موجود ہے۔ ۱۴ جولائی ۱۸۵۷ء کو اپنے دیہاتی مکان کے پائیں باغ میں ٹہلتے ہوئے فٹز جیرلڈ نے پہلی مرتبہ جس رُباعی کا انگریزی میں ترجمہ کیا وہ یہ تھی۔

"برخیز و بیا بیاز بہرِ دلِ ما
حل کن بجمالِ خویشتن مشکلِ ما
یک کوزہ مے بیار تا نوش کنیم
زاں پیش کہ کوزہا کنند از گلِ ما"

چھ مہینے کے اندر اُس نے رباعیات کا بہت بڑا حصہ انگریزی میں منتقل کر لیا لیکن انگلستان کا وہ دور جسے "عہدِ وکٹوریہ" سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ ذہن و فکر کی اُس آزادی اور ذوق و نظر کی اُس ندرت کا دور نہیں تھا، جو آج انگریزی معاشرت کی امتیازی خصوصیت سمجھی جاتی ہے۔ لوگوں پر قدامت کا رنگ جما ہوا تھا۔ اور اخلاق۔ مذہب اور تہذیب کے چند لگے بندھے قاعدوں سے باہر قدم رکھنا عوام اور خواص دونوں گوارا نہ کرتے تھے۔ روایات کی شدت سے پابندی کی جاتی تھی۔ اور اِن روایات کا دائرہ لباس اور خوراک سے لے کر شعر و ادب

تک ہر چیز پر چھایا ہوا تھا۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کی غیر متحرک اور منجمد معاشرت میں عمر خیام ایسے شاعر کا کلام نہ صرف باغیانہ ثابت ہوتا بلکہ اس سے مذہب و اخلاق کی خوش عقیدہ عمارت کے بہت سے کنگرے ہل جانے کا احتمال تھا، فٹز جیرلڈ نے اپنے نقطۂ نگاہ کے مطابق "بے ضرر اور معصوم" قسم کی رُباعیاں منتخب کر کے اپنے ایک دوست پارکر کو جو ایک ادبی رسالے کا ایڈیٹر تھا اشاعت کے لیے بھیجیں۔ لیکن پارکر کو انھیں اپنے رسالے میں شائع کرنے کا حوصلہ نہ ہوا۔ سال بھر تک یہ مسودہ پارکر کے دفتر میں پڑا رہا، آخر اُس نے بصد معذرت فٹز جیرلڈ کو واپس بھیج دیا۔

اب فٹز جیرلڈ کے لیے اِس کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ رباعیوں کی اشاعت اپنی ذمہ داری پر کرے۔ چنانچہ اُس نے مزید چالیس رُباعیوں کا اضافہ کر کے کُل پچھتر رباعیات کا مجموعہ طبع کرایا۔ دام اُس نے اپنی جیب سے خرچ کیے تھے۔ لیکن سرورق پر مترجم کا نام درج نہ کیا، سارے ڈھائی سو نسخے شائع ہوئے، جن میں سے چالیس تو فٹز جیرلڈ نے خود رکھ لیے۔ اور باقی برنرڈ کوریچ کی دُکان پر برائے فروخت رکھ دیئے گئے۔ چالیس نسخوں میں سے فٹز جیرلڈ نے صرف تین جلدیں اپنے دوستوں میں تقسیم کیں۔ ایک کوول کو ہندوستان بھیجدی۔ دوسری ڈوسنے اور تیسری جارج بروکو دی۔ باقی پینتیس جلدیں غالباً دیمک کی نذر ہو گئی ہوں گی۔

کتاب کی قیمت ایک شلنگ مقرر کی گئی تھی، لیکن دو سال میں ایک جلد بھی فروخت نہ ہوئی۔ برنرڈ کوریچ نے لندن کے دو ادبی رسالوں میں اِشتہار بھی دیا،

بعض جرائد کو ریویو کے لیے بھی متعدد نسخے بھیجے، لیکن دو سال انتظار کرنے کے باوجود بھی جب کسی شخص نے اِس عجیب و غریب کتاب کو قابلِ اعتنا نہ سمجھا تو دکاندار نے تنگ آکر دو سو دس نسخے ایک ردّی کے ٹوکرے میں پھینک دیئے، اِس ٹوکرے میں، جو دکان کے عین سامنے رکھا رہتا تھا، اور بھی بے کار اور بے مصرف کتابوں کا انبار پڑا تھا، ۱۸۶۷ء کے اوائل میں کسی راہگیر نے، جو غالباً پرانی کتابوں کا شوقین تھا، اِس ٹوکرے کو کھنگالا، اور خدا جانے کس جذبے کے تحت اُس نے رباعیات کے دو نسخے دو پنس میں خرید لیے۔ عمر خیام کے مغربی قدردان آج تک اُس غیر معروف شخص کا نام پتہ دریافت کرنے کی کوشش کر رہے ہیں جس کی نگہِ التفات نے سب سے پہلے رباعیات کو سرفراز کیا تھا۔ اور جس کی دریادلی نے ایک پینی کے بدلے ایک جلد خریدی تھی۔ اِس سلسلے میں مختلف لوگوں نے مختلف اشخاص کا تعین کیا ہے۔ لیکن یہ محض قیاس کی باتیں ہیں۔ اصل خریدار کا اب تک پتہ نہیں چل سکا۔

لندن سے ایک رسالہ سیٹرڈے ریویو نکلتا تھا، اُس کے ایڈیٹر نے بھی ایک نسخہ خریدا، اور اُس کے مطالعہ سے متاثر ہو کر اُس نے روسیٹی سے ذکر کیا۔ روسیٹی نے مشہور شاعر سوئن برن اور کارلائل سے بات کی، چنانچہ اگلے روز روسیٹی، سوئن برن اور کارلائل تینوں نے برنرڈ کوریچ کی دکان پر جا کر رباعیات خریدیں۔ دکاندار نے جب دیکھا کہ قدردانوں کی تعداد بڑھ رہی ہے تو اُس نے جھٹ کتاب کی قیمت ایک پینی سے بڑھا کر دو پنس کر دی۔

۱۸۶۸ء میں برنرڈ کوریچ نے کتاب کا دوسرا ایڈیشن شائع کیا، اور

قیمت ساڑھے تین شلنگ مقرر کی، فٹز جیرلڈ اتنی گراں قیمت کا مخالف تھا۔ اُس کا خیال تھا کہ کتاب ہرگز اس قابل نہیں کہ لوگ اتنے زیادہ دام خرچ کرنے پر آمادہ ہو سکیں گے سرورق پر اس مرتبہ بھی مترجم کا نام نہیں تھا۔ تاہم لندن میں آہستہ آہستہ مترجم کی پُراسرار شخصیت سے پردے اٹھنے لگے۔ اس دوران میں رباعیات کا چرچا امریکہ میں بھی پھیل گیا تھا اور وہاں بعض رسائل میں عمر خیام کی شاعری پر مقالے بھی چھپنے لگے

چنانچہ امریکہ میں رباعیات کی دھڑا دھڑ مانگ ہوئی تو برنرڈ کویرچ کو دو نئے ایڈیشن طبع کرانا پڑے۔ فٹز جیرلڈ کے انکسار کا یہ عالم تھا کہ وہ اس مقبولیت کو اپنی ہنرمندی کا ثبوت سمجھنے کی بجائے امریکی لوگوں کی اعجوبہ پسندی پر محمول کرتا تھا۔

۱۸۷۰ء میں انگلستان کے بعض رسائل نے پہلی بار رباعیات کو قابل توجہ سمجھ کر اُن پر تبصرہ کیا۔ کارلائل پہلا شخص تھا جس نے مترجم کی شخصیت کا صحیح پتہ چلانے میں کامیابی حاصل کی۔ رسکن نے رباعیات کا مطالعہ کرنے کے بعد فٹز جیرلڈ کو جو خط لکھا اُس کے چند الفاظ یہ ہیں:-

"خدا کے لیے عمر خیام کی اور نظموں کا بھی ترجمہ کیجیے، میں نے اپنی زندگی میں آج تک رباعیات سے بہتر شاعری نہ کہیں دیکھی نہ پڑھی، اس میدان میں اپنا قلم ہرگز مت روکیے۔"

۱۹۳۶ء میں برنرڈ کویرچ نے رباعیات کا وہ نسخہ جو ایک زمانے میں سُکون برن کے مطالعہ میں رہ چکا تھا۔ اور جس کے ایک صفحے پر سُکون برن کے ہاتھ کی تحریر بھی تھی نو ہزار ڈالر میں فروخت کیا۔ دُوسرا نسخہ جو کسی زمانے میں ولیم مورس

کی ملکیت تھا۔ ایک شخص نے ساڑھے چار ہزار ڈالر میں خریدا۔

فٹز جیرلڈ کا انتقال جون ۱۸۸۳ء میں ہوا۔ اس نے اپنی زندگی میں رباعیات کی روز افزوں مقبولیت دیکھ لی تھی۔ امریکہ۔ فرانس جرمنی اور اٹلی تک فٹز جیرلڈ کے ترجمے نے عمر خیام کی شہرت پھیلا دی تھی۔ لیکن رباعیات کو جو عروج فٹز جیرلڈ کے مرنے کے بعد حاصل ہوا اس کا تصور تو اس کے ذہن کے کسی بعید ترین گوشے میں بھی نہ ہوگا۔ آبِ زر سے لکھے ہوئے نسخے بادشاہوں کو تحفے کے طور پر پیش ہونے لگے۔ چاہنے والوں نے اپنی معشوقاؤں کو رباعیات کا ہدیہ محبت نذر کیا۔ سپاہیوں نے میدانِ جنگ میں تلواروں کی جھنکار اور توپوں کی گرج کے اندر بھی رباعیات کو سینے سے لگائے رکھا۔ اکثر نوجوانوں نے رباعیات سے متاثر ہو کر خودکشی کر لی، پولیس جب تفتیش کے لیے پہنچی تو لاش کے قریب جام و مینا کے ٹکڑے پڑے ہوتے۔ اور ایک طرف رباعیات کا نسخہ کھلا ہوتا تھا۔

جس حسن و جمال اور خوش سلیقگی سے رباعیات کے سیکڑوں ایڈیشن شائع ہوئے اس کی مثال انگریزی کی کسی کتاب کو اب تک حاصل نہیں ہوئی۔ آج بھی مختلف تقطیع کے مجلا۔ مطلا اور مرصع ایڈیشن شائع ہو رہے ہیں۔ انگلستان کی بڑی سے بڑی لائبریری اور بڑے سے بڑے کتب فروش کی دکان بھی رباعیات کے بغیر مکمل نہیں سمجھی جاتی۔ یورپ کے بعض نامور مصوروں نے عمر خیام کے معانی کو تصویر کا جامہ پہنانے کی بھی کوشش کی۔ چنانچہ رباعیات کے اکثر مصور نسخے بھی چھپ چکے ہیں۔ فٹز جیرلڈ کے علاوہ کئی اور ادیبوں نے بھی رباعیات کا انگریزی میں ترجمہ کیا ہے۔ ان میں بعض فارسی کے بڑے جید عالم بھی تھے۔ لیکن جو لطفِ خداداد

اور قبولِ عام فسٹز جیرلڈ کو نصیب ہوا وہ کسی اور کے حصے میں نہ آسکا۔

اِس تمام شہرت و ناموری اور قبولیت و کامرانی کے پیچھے ایک غیر معروف گم نام اور نامعلوم رہگیر ہے جس نے ۱۸۱۶ء کے ابتدائی دنوں میں ایک روز چیرنگ کراس روڈ پر چلتے ہوئے، یونہی بغیر کسی خارجی تحریک کے برنرڈ کوریچ کی دکان پر پڑے ہوئے ردی کے ٹوکرے کو دیکھا اور پھر کرم خوردہ کتابوں کے ڈھیر کو اُلٹ پلٹ کر رباعیات کا نسخہ نکالا اور بے نیازی کے عالم میں ایک پیسہ دکان پر پھینک کر آگے بڑھ گیا ؎

کہ ہم نے انقلابِ چرخِ گردان یوں بھی دیکھے ہیں

آسکر وائلڈ کی صد سالہ سالگرہ

ابر روتا ہے کہ بزمِ طرب آمادہ کرو
برق ہنستی ہے کہ فرصت کوئی دم دے ہم کو

دو برس ہوئے، ۱۶ر اکتوبر ۱۹۵۴ء کو، بیک وقت لندن، ڈبلن اور پیرس میں آسکر وائلڈ کی صد سالہ سالگرہ منائی گئی تھی۔ لندن کی تقریب میں مجھے بھی شریک ہونے کا موقع ملا تھا۔ صبح گیارہ بجے چیلسی کے محلّے میں ٹائٹ سٹریٹ کے اُس مکان پر جس میں ۱۸۸۴ء سے ۱۸۹۵ء تک، گیارہ برس وائلڈ مقیم رہا تھا، لندن کونٹی کونسل نے پتھر کی ایک نیلے رنگ کی سِل نصب کی جس پر یہ الفاظ درج تھے۔ "آسکر وائلڈ ۱۸۵۴ء تا ۱۹۰۰ء
مزاح نگار اور ڈرامہ نویس
یہاں رہتا تھا"

میں پونے گیارہ بجے کے قریب ٹائٹ سٹریٹ میں پہنچا تو مکان کے سامنے خاصا ہجوم تھا۔ گلی کے کنارے پر پولیس کے چند سپاہی ٹہل رہے تھے اور گاڑیوں کی آمد و رفت کچھ وقت کے لیے بند کر دی گئی تھی۔ وائلڈ کے مکان کے دروازے سے عین متصل لکڑی کا ایک چبوترہ بنا کر اُس پر ایک کرسی اور مائیکروفون رکھ دیا گیا تھا۔ مکان کی بیرونی دیوار کا وہ حصہ، جہاں پتھر نصب کیا گیا تھا یونین جیک سے ڈھکا ہوا تھا۔ اور پرچم کے ساتھ ایک رسّی بندھی ہوئی تھی جس کا سرا لکڑی کے چبوترے پر لٹک رہا تھا۔

میں نے ہجوم پر نگاہ ڈالی تو بعض ایسی نامور ہستیاں نظر آئیں جو آج انگلستان کے شعر و ادب کی مملکت میں بڑا بلند مرتبہ رکھتی ہیں۔ سامنے ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ کھڑے تھے۔ اُن کے پاس سر کامپٹن میکنزی تھے۔ چند قدم کے فاصلے پر ماڈلن کالج (آکسفرڈ) کے سی۔ جی ہارڈی اور ٹرنٹی کالج (ڈبلن) کے پروفیسر پارک کھڑے باتیں کر رہے تھے۔ آسکر وائلڈ اِن دونوں درس گاہوں میں طالب علم رہ چکا تھا۔ ایک صاحب جو چلنے پھرنے سے معذور تھے۔ پہیوں والی کرسی پر بیٹھے تھے۔ معلوم ہوا کہ مشہورۂ آفاق مصور آگسٹس جان ہیں۔ ایک اور بڑی نمایاں وضع قطع کے شخص تھے۔ پتہ چلا کہ آپ تھیٹر کے مشہور ایکٹر مائیکل ریڈگریو ہیں۔ فرانس جرمنی اور آئرلینڈ کے سفارت خانوں نے سرکاری طور پر اس تقریب میں شرکت کی تھی۔ چنانچہ اِن تینوں سفارت خانوں کے بعض معزز عہدیدار اپنے اپنے ملک کی نمائندگی کر رہے تھے۔

چونکہ مکان پر تختی نصب کرنے کا کام لندن کونٹی کونسل کے اہتمام سے

ہوا تھا۔ اِس لیے چیلسی کا میئر اپنا مخصوص لباس پہن کر جلسے میں موجود تھا۔ ایک اور صاحب بڑی متانت اور ذمّہ داری سے ادھر اُدھر گھوم رہے تھے۔ دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ آپ پارلیمنٹ کے رُکن منٹگمری ہائنڈ ہیں۔ اور آسکر وائلڈ کی سالگرہ منانے کے لیے جو خاص مجلس بنائی گئی ہے اُس کے صدر ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ آج وائلڈ کی زندگی اور اُس کی تصانیف پر سب سے بڑی سند منٹگمری ہائنڈ ہے۔ ہائنڈ نے برسوں کی مسلسل کاوش اور جستجو سے جس طرح آسکر وائلڈ کی زندگی کی خفیف سے خفیف جزئیات معلوم کی ہیں اُس سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ اس شخص کو وائلڈ سے گویا عشق ہے۔ آسکر وائلڈ کے مقدمے پر چار سو صفحات کی ایک ضخیم کتاب لکھ کر منٹگمری ہائنڈ نے اس باب میں غیر فانی شہرت حاصل کی ہے۔

عین گیارہ بجے منٹگمری ہائنڈ نے چبوترے پر کھڑے ہو کر مختصر الفاظ میں آج کی تقریب کی اہمیت بیان کی۔ اس کے بعد چیلسی کے میئر تشریف لائے۔ اُنھوں نے اپنی چند منٹ کی تقریر میں فخریہ اس بات کا ذکر کیا کہ یہ شرف چیلسی ہی کو حاصل ہے کہ انگریزی کے جتنے ادیب، مصنّف، شاعر اور فن کار یہاں رہ چکے ہیں۔ مجموعی طور پر لندن کے کسی اور علاقے میں نہیں رہے۔

اب منٹگمری ہائنڈ نے سر کامپٹن میکنزی سے درخواست کی کہ آسکر وائلڈ کے نام کی تختی کی نقاب کشائی فرمائیں۔ کامپٹن میکنزی نے اپنی تقریر میں وائلڈ کی ادبی عظمت کا ذکر کرتے ہوئے انتہائی رنج و اندوہ سے اس بات کا اعتراف کیا آج سے ساٹھ سال قبل انگلستان کی حکومت اور سماج نے متحد ہو کر جس

ظالمانہ طریق سے آسکر وائلڈ کو تباہ کیا تھا۔ اُس کے تصور سے ہمارے رونگٹے کھڑے ہو جاتے۔ اور شرم و ندامت سے ہماری گردنیں جھک جاتی ہیں۔ بہرکیف ہمیں یقین ہے کہ آئندہ اس قسم کی سنگدلی کا اعادہ نہیں ہوگا۔

اِس کے بعد کاپٹن میکنزی نے رسّی کھینچ کر یونین جیک کو دیوار سے ہٹا دیا اور نیچے سے آسکر وائلڈ کے نام کی تختی نکل آئی۔ مجمع نے بے اختیار تالیاں بجائیں۔ اور فوٹو گرافروں نے دھڑا دھڑ تصویریں کھینچنا شروع کر دیں۔ ہجوم میں آسکر وائلڈ کے صاحبزادے ویویین ہالینڈ بھی تھے۔ اور میں اُن سے ملنا چاہتا تھا۔ بھیڑ کو چیر کر میں اُن کے پاس پہنچا تو مصافحہ کرتے ہوئے میں نے عرض کیا کہ "میں آپ کے نامور والد کا اُس وقت سے مدّاح، بلکہ قتیل ہوں، جب میں کالج کا ایک معمولی طالب علم تھا۔"

پوچھنے لگے "کہاں سے آئے ہو؟"

میں نے اپنا اتا پتا بتایا۔ تو خوش ہو کر بولے کہ "میرے باپ کے عظمت شناس کہاں کہاں سے چلے آ رہے ہیں۔"

ویویین ہالینڈ کا قد چھوٹا ہے۔ اور شکل و صورت سے ذہانت کے آثار نظر نہیں آتے۔ حالانکہ وائلڈ لمبے قد کا آدمی تھا۔ اور جن لوگوں نے اُس کو جوانی میں دیکھا تھا اُن کی رائے ہے کہ اُس کے چہرے مہرے سے بلا کی ذہانت ٹپکتی تھی۔

اب آسکر وائلڈ کے مکان کے دروازے کھول دیئے گئے تھے۔ اور تمام لوگوں نے خاموشی سے اندر جا کر در و دیوار کو حسرت بھری نظروں سے دیکھنا شروع کیا۔ گذشتہ جنگ میں لندن کے بے شمار مکانوں کی طرح اِس مکان

پر بھی کونٹی کونسل نے قبضہ کر لیا تھا۔ اور اب اس میں کونسل کے بہت سے کرائے دار رہتے ہیں۔ مکان پرانا اور بوسیدہ ہے۔ مدت سے مرمت بھی نہیں ہوئی، دیواروں، چھتوں اور دروازوں کا رنگ روغن بگڑ گیا ہے۔ فرش بھی جگہ جگہ سے اکھڑا ہوا ہے۔ کھڑکیوں پر شیشوں کی جگہ کہیں کہیں لکڑی کے تختے لگا دیئے گئے ہیں، میں ایک ایک اینٹ کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ اور سوچ رہا تھا کہ یہاں وہ شخص رہتا تھا۔ جو اپنے دورِ بہار میں لندن کا سب سے خوش پوشاک اور خوش خوراک شخص مشہور تھا۔ جو لندن کا سب سے شاہ خرچ اور دریا دل شخص سمجھا جاتا تھا، جسے لندن کا سب سے خوش گفتار اور بذلہ سنج شخص تسلیم کیا گیا تھا۔ جو زبان و بیان کا بادشاہ اور الفاظ کا سب سے بڑا جادوگر تھا۔ اور جس کے سحرِ تکلم کے سامنے لندن میں کسی بڑے سے بڑے لسان کا چراغ نہ جل سکتا تھا۔

مگر گاہے نظیری می کند آرام گاہ ایں جا
جنوں از سایۂ دیوارِ ایں ویرانہ می خیزد

ٹائٹ سٹریٹ آج ایک غیر معروف اور بے رونق سی گلی ہے لیکن اُنیسویں صدی کے آخر میں یہاں بڑے بڑے نامور لوگ رہتے تھے۔ وہسلر، ویم مورس، کارلائل، رسکن، روسیٹی۔ برن جونز۔ جارج ایلیٹ وغیرہ کے مکان اسی نواح میں تھے۔ ٹائٹ سٹریٹ سے ہٹ کر تھوڑے سے فاصلہ پر، اوکلے سٹریٹ میں آسکر وائلڈ کی والدہ رہتی تھیں۔ اور وائلڈ کے متعلق یہ بات ہر شخص کو معلوم ہے کہ وہ بڑا سعادت مند بیٹا تھا۔ اور ہزار مصروفیتوں کے باوجود ہفتے میں دو

بتن بار اپنی ماں کے سلام کو ضرور حاضر ہوتا تھا۔

جن لوگوں نے وائلڈ کی زندگی میں اس کا یہ مکان دیکھا تھا اُن کی رائے ہے کہ کمروں کی آرائش اور سجاوٹ میں آسکر وائلڈ نے ذوق و نظر کی اُسی ندرت کا ثبوت دیا تھا جو اُس کے لباسِ فاخرہ سے ظاہر ہوتی تھی۔ فرش ایران و کاشان کے قالینوں سے مزین تھا۔ دروازوں پر حریر و دیبا کے پردے لٹکتے تھے۔ بیش قیمت صوفے اطلس و کمخواب سے ڈھکے رہتے تھے۔ اور خوب صورت، نقش و نگار سے آراستہ الماریاں ادبی نوادر سے معمور تھیں۔ تمول اور خوش حالی کے اس ماحول میں آسکر وائلڈ کی حسین و جمیل اور نیک دل بیوی کانسٹنس، اپنے دو بچوں سیرل اور ویویین کے ساتھ، بیرونی دنیا کے شور و غوغا سے محفوظ، اپنے شوہر کے روز افزوں عروج کو فخر و اطمینان سے دیکھ دیکھ کر خوش ہوتی تھی۔

۱۶ر اکتوبر کو صبح آسکر وائلڈ کے مکان پر اُس کے نام کی تختی کی نقاب کشائی کی گئی۔ اور شام کو سیوائے ہوٹل میں اُس کی یاد میں ایک دعوتِ طعام منعقد ہوئی۔ جہاں دیگر اکابر کے علاوہ موجودہ لارڈ کوئنز بری بھی شریک ہوئے۔ یہ کوئنز بری اُس کوئنز بری کے پرپوتے ہیں جس نے ۱۸۹۵ء میں آسکر وائلڈ کو جیل بھجوایا تھا۔ میں نے اُنھیں کھانے کی میز پر ویویین ہالینڈ کے پہلو بہ پہلو بیٹھے ہوئے دیکھا تو تعجب ہوا کہ وقت کیوں کر رستے ہوئے زخموں کو مندمل اور غم و غصہ کی کدورتوں کو صاف کر دیتا ہے۔ سر کامپٹن میکنزی نے وائلڈ کی یاد میں جامِ صحت تجویز کیا۔ اور اُس کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے فرمایا کہ وائلڈ کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ اُس نے وکٹورین دور کی تہذیب و معاشرت کا ایک اہم جزو ہوتے ہوئے اُس معاشرت

کے تمام مضحکہ انگیز پہلوؤں کی ایسی دلآویز عکاسی کی ہے کہ یوں معلوم ہوتا ہے گویا وہ خود ہجوم سے بہت دور کسی گوشے میں بیٹھ کر آئندہ روند کا تماشہ دیکھ رہا تھا کامپٹن میکنزی نے اپنے تاثرات کا ذکر کرتے ہوئے یہ بھی کہا کہ "جب میں نے نوجوری میں پہلی بار وائلڈ کی تصانیف کا مطالعہ کیا تو ایک حیرت آمیز مسرت کے ساتھ مجھے یوں محسوس ہوا تھا گویا ادب و انشا کا کوئی انمول خزانہ ہاتھ آگیا ہے۔ اور وہ تاثرات اب تک قائم ہیں۔"

سر کامپٹن کی تائید میں جرمنی، فرانس اور آئرلینڈ کے سفارت خانوں کے نمائندوں نے تقریریں کیں اور آخر میں لاس انجلس یونیورسٹی کے پروفیسر ڈانلڈ ہائڈ نے بڑے فخر سے اس بات کا اظہار کیا کہ وائلڈ کی تصانیف کے مسودوں اور اس کی دیگر ادبی دستاویزوں کا جتنا ذخیرہ اس وقت لاس انجلس میں ہے اور کہیں نہیں۔

انگریزی۔ فرنچ اور جرمن زبانوں میں آسکر وائلڈ پر کم از کم اسی نوے کتابیں لکھی جا چکی ہیں۔ اور یہ سلسلہ ابھی تک جاری ہے۔ برنرڈ شا نے ایک مرتبہ وائلڈ کے قدردانوں اور نقادوں کو مخاطب کر کے کہا تھا کہ "بس۔ اب اس غریب پر رحم کرو اور کوئی نئی کتاب نہ لکھو۔"

لیکن جس طرح شا کی ہر تحریر کے پیچھے ایک خندۂ استہزا یا زہر آلود طنز کی جھلک نظر آتی ہے۔ وائلڈ کے بارے میں بھی اس کے ان الفاظ کے پس پردہ ایک خاص دل گرفتگی اور چبھن چھپی ہوئی ہے۔ آسکر وائلڈ اور برنرڈ شا تقریباً ہم عمر تھے (وائلڈ شا سے دو سال بڑا تھا) قومیت کے اعتبار سے

دونوں آئرش تھے۔ دونوں نقلِ مکانی کر کے لندن آ بسے تھے۔ اور دونوں نے
اپنے قلم کی جولانیوں کے لیے افسانہ نویسی اور ڈرامہ نگاری کے میدان کو منتخب
کیا تھا۔ لیکن قدرت کے انعامات دیکھئے کہ جس اُس وقت جب آسکر وائلڈ
سیم و زر میں تل رہا تھا۔ برنرڈ شا کو روٹیوں کے لالے پڑے ہوئے تھے۔

آسکر وائلڈ کے عزیز دوست اور اس کے اوّلیں سوانح نگار رابرٹ شیرارڈ
نے لکھا ہے۔ کہ جیل جانے سے دو سال قبل وائلڈ کی سالانہ آمدنی آٹھ ہزار پونڈ
تھی (موجودہ معیارِ زندگی کے مطابق یہ رقم آج کل چالیس ہزار پونڈ کے برابر ہے)
اس کے برعکس ۱۸۸۹ء سے ۱۸۹۵ء تک برنرڈ شا کی زندگی جس عسرت
میں گذری ہے، اُس کا ایک معمولی ثبوت یہ ہے کہ اُس کے ناول اوّل تو لندن
کا کوئی ناشر چھاپنے کو تیار نہ تھا، اور جب بہ ہزار مصیبت چار ناول طباعت و
اشاعت کی منزلوں سے گزر بھی گئے تو پڑھنے والے ناپید تھے۔ ان ناولوں کی رائلٹی
سے جو رقم شا کو میسر آئی وہ آٹھ دس پونڈ سے زیادہ نہ تھی۔ اُدھر اُسی زمانے
میں آسکر وائلڈ کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ برطانیہ کے ولی عہدِ سلطنت (جو
بعد میں ایڈورڈ ہفتم کے لقب سے بادشاہ بنے) اُس کے ذاتی دوست تھے
اور مارلبرو ہاؤس کی ہر معاشرتی تقریب میں اُسے شرکت کا دعوت نامہ موصول
ہوتا تھا۔ انگلستان کے خاندانی امرا کے طبقے میں مشکل ہی سے کوئی اونچا گھرانا
ہوگا۔ جہاں صاحبِ خانہ کو وائلڈ سے ملنے کا اشتیاق یا اُس کی آمد کا انتظار نہ
رہتا ہو۔ جب وہ کسی بڑی سے بڑی محفل میں اپنی زبان کھولتا تو مجمع سمٹ کر
اُس کے قریب آجاتا تھا۔ اور لوگ سارے کام چھوڑ کر اس کی باتوں میں محو ہو جاتے

تھے۔ جس رات اُس کا ڈرامہ آئیڈیل ہز بنڈ پہلی بار لندن میں کھیلا گیا تو وہ شہر سے باہر، کسی گاؤں میں جا کر بیٹھ گیا تھا۔ کیونکہ اُس کے مداحوں کی کثرت کا یہ عالم تھا کہ اُسے لندن میں چین سے سانس لینا محال ہو گیا تھا۔ وہ جدھر سے نکل جاتا چاروں طرف سے خلقت ٹوٹ پڑتی تھی۔ روپیہ تو گویا اُس کے ہاتھ کا میل تھا، جسے وہ بے دردی سے خرچ کرنا جانتا تھا۔ دوپہر کا کھانا کیفے رائل اور شب کا ڈنر میسوائے میں کھایا جاتا تھا۔ جہاں ہر روز چھ سات آدمی اُس کے دسترخوان پر موجود ہوتے تھے۔ دو قدم پیدل چلنا اُس کے لیے دشوار تھا۔ صبح سے شام تک کرائے کی اعلیٰ درجے کی فٹن اُس کے مکان کے دروازے پر کھڑی رہتی تھی۔ جب اُس کے معاصرین یہ شان شوکت دیکھتے۔ اور اپنی تنگ دستی کا وائلڈ کی خوش حالی سے مقابلہ کرتے تو دل ہی دل میں زہر کے گھونٹ پی کر رہ جاتے تھے۔ برنرڈ شا اپنی ساری وسعتِ قلب و نظر کے باوجود اپنی زندگی کا وہ تلخ دور کبھی فراموش نہ کر سکا۔ چنانچہ مرتے دم تک اُس کی یہ کیفیت رہی کہ جب کبھی وائلڈ کا ذکر آتا تھا اُس کی زبان سے ہمیشہ چبھتے ہوئے لفظ نکل جاتے تھے۔

وائلڈ کو ڈرامہ نگاری کی ترغیب پہلے پہل جارج الگزینڈر نے دی تھی۔ جو تھیٹر کا مشہور ایکٹر تھا۔ بعد میں اُس نے ایکٹنگ ترک کر کے سینٹ جیمز تھیٹر کے نام سے اپنا کاروبار شروع کر دیا تھا۔ وائلڈ کے حسنِ تکلم کی دھاک تو پورے لندن میں بیٹھی ہوئی تھی۔ جب وہ باتیں کرتا تو ترشے ترشائے فقرے اور سانچے میں ڈھلے ہوئے الفاظ اِس روانی سے اُس کے منہ سے نکلتے تھے گویا وہ کوئی چابک دست جوہری ہے جو آن کی آن میں ہیروں کے ڈھیر لگاتا جا رہا ہے۔

اُس کی گفتگو کا سب سے نمایاں وصف پیراڈاکس تھا (پیراڈاکس کے لیے اُردو میں کوئی موزوں لفظ نہیں ملتا۔ قولِ متناقض" یا باطل نما حقیقت" سے بھی وہ مفہوم ادا نہیں ہوتا) جو بیک وقت سننے والوں کے دل و دماغ کو متاثر کرتا تھا۔ سامعین اُس کی باتوں سے ہنستے بھی تھے۔ لیکن الفاظ کے پس پردہ جو زبردست حقیقت چھپی ہوتی تھی اُس کی تہہ تک پہنچنے کے لیے سننے والے کو اپنا ذہن و فکر استعمال کرنا پڑتا تھا۔ جارج الگزنڈر نے سوچا کہ وائلڈ ایسا شخص جو مکالمے کا بادشاہ ہے اگر یہی باتیں ڈرامے کے مختلف کرداروں کی زبان سے ادا کرے تو یقیناً تماشائی خوب محظوظ ہوں گے۔ چنانچہ اُس نے آسکر وائلڈ کو ڈرامہ لکھنے کی طرف متوجہ کیا۔ اور ایک معقول رقم پیشگی بھی ادا کر دی۔

فروری ۱۸۹۲ء میں اس کا پہلا ڈرامہ "لیڈی ونڈرمیئر کی پنکھیا" اور اپریل ۱۸۹۳ء میں "ومن آف نو امپورٹنس" کھیلا گیا۔ الگزنڈر کا اندازہ بالکل صحیح نکلا۔ اور سارا لندن اِن دو ڈراموں پر دیوانہ وار ٹوٹ پڑا۔ تیز و طرار مکالمے تیر کی طرح دل میں اُتر جانے والے پیراڈاکس اور شستہ و رفتہ مزاح۔ ان تمام چیزوں نے مل کر آسکر وائلڈ کو آناً فاناً لندن کا سب سے محبوب ادیب بنا دیا۔ ۱۸۹۴ء میں اُس نے "آئیڈیل ہزبنڈ" اور ۱۸۹۵ء کے اوائل میں "ارنسٹ" مکمل کیا۔ اور یہ دونوں ڈرامے ایک ہی وقت میں لندن کے دو مختلف تھیٹروں میں کھیلے جانے لگے۔

اب لاریب آسکر وائلڈ لندن کے ادبی حلقوں کا بادشاہ تھا۔ دولت اُس پر مینہ کی طرح برس رہی تھی۔ اور شہرت و کامیابی تو گویا اس کی خانہ زاد کنیز

بن گئی تھی۔ مقبولیت و مسحوریت کا یہ عالم تھا کہ جب اُس نے آئیڈیل ہزبنڈ کے مکالموں میں کہیں کہیں تبدیلی کرنا چاہی تو ولی عہدِ انگلستان پکار اُٹھے کہ "خدارا اِن مکالموں کو جوں کا توں رہنے دو۔ اگر تم نے ایک لفظ بدلا تو ہم پر ظلم کرو گے۔"

وکٹورین دور کے لگے بندھے قاعدوں نے انگلستان کی معاشرت میں جو بیوست پھیلا دی تھی اور سماج پر ایک منافقت آمیز اخلاقی رعب مسلط کر رکھا تھا، وائلڈ کے ڈراموں نے اُس پر ایک ضربِ کاری لگائی۔ اُس نے اپنی ہنرمندی سے سماج کو ایک ایسا آئینہ دکھایا جس میں حبشی کو اپنی اصلی صورت نظر آنے لگی تھی۔ وہ لوگ جو اپنے آپ کو خدائی فوجدار یا اصلاحِ اخلاق کا ٹھیکیدار سمجھتے تھے۔ چھپ چھپ کر اُسے بُرا بھلا کہتے تھے۔ لیکن کھلے بندوں کسی کو ایک لفظ کہنے کی جرأت نہ تھی۔ جن لوگوں نے وائلڈ کو اُس زمانے میں دیکھا تھا اُن کی رائے ہے کہ کامیابی کے نشے نے اُسے بدحواس سا کر دیا تھا۔ وہ بڑے سے بڑے انسان اور اہم سے اہم مسئلہ کا ذکر اس ہلکے پن سے کرتا تھا گویا عظمت و بزرگی کے مروجہ معیار کا قائل ہی نہ تھا۔ خودداری کی جگہ رعونت اور وضعداری کی جگہ تکبر نے لے لی تھی۔ اُس کے روزمرہ مصارف اِس قدر بڑھ گئے تھے کہ وہ رائلٹی کی رقوم پیشگی وصول کرنے پر مجبور ہو گیا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ بلند اقبالی کا آفتاب نصف النہار پر پہنچ گیا تھا۔ اور اب اُسے بڑی سُرعت سے اُفقِ مغرب کی جانب کوچ کرنا تھا۔

۱۸۹۱ء کے موسمِ گرما کی ایک شام کو لارڈ الفریڈ ڈگلس اور آسکر وائلڈ

ایک دوسرے سے متعارف ہوئے۔ اور یوں وہ مہلک اور تباہ کن دوستی شروع ہوئی جس نے چار ہی سال کے اندر وائلڈ کو لندن کی روشن اور ضیا پاش زندگی سے نکال کر زنداں کی تنگ و تاریک کوٹھری میں پھینک دیا۔ جب اس افسوسناک دوستی کا آغاز ہوا تو وائلڈ کی عمر بینتیس سال تھی۔ اور الفریڈ ڈگلس اکیس برس کا نوجوان تھا۔ وائلڈ شعر و ادب کی مملکت کا ایک نامور شخص تسلیم کیا جا چکا تھا۔ اور الفریڈ ڈگلس سکاٹ لینڈ کے ایک دودمان عالی کا چشم و چراغ تھا۔ دونوں ایک دوسرے کی بے پناہ کشش کا شکار ہو گئے۔ اس دوستی کی نوعیت اور اس کے دردناک انجام پر ہزاروں صفحے سیاہ کئے جا چکے ہیں۔ ہر شخص نے اپنے اپنے فہم کے مطابق نتائج اخذ کئے ہیں۔ لیکن اس واقعہ سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ کہ یہی دوستی آسکر وائلڈ کی بربادی کی ذمہ دار تھی اگر کارکنانِ قضا و قدر الفریڈ ڈگلس کو اس کے راستے میں نہ ڈال دیتے تو وائلڈ کی زندگی کامیابی و کامرانی کی منزلیں طے کرتی ہوئی اطمینان سے اپنے مستقر پر پہنچ جاتی۔

۲ مارچ ۱۸۹۵ء کو آسکر وائلڈ نے الفریڈ ڈگلس کے والد لارڈ کوئنزبری کے خلاف ازالۂ حیثیتِ عرفی کا استغاثہ دائر کیا۔ ۳ اپریل کو اولڈ بیلی میں استغاثے کی سماعت شروع ہوئی۔ ۵ اپریل کو وائلڈ نے استغاثہ واپس لے لیا۔ اور کوئنزبری کو عدالت نے باعزت طریقے سے بری کر دیا۔ اسی شام کریمنل لا امنڈمنٹ ایکٹ ۱۸۸۵ء کی دفعہ ۱۱ کے تحت آسکر وائلڈ کو گرفتار کر لیا گیا۔ ۲۶ اپریل کو اس کے خلاف عدالت میں سماعت شروع ہوئی۔ یکم مئی کو جیوری کے ارکان میں باہمی اختلاف ہوا۔ اور ۷ مئی کو پانچ ہزار پونڈ کی ضمانت پر آسکر وائلڈ کو رہا

کر دیا گیا۔ ۲۱ مئی کو جسٹس ولز کی عدالت میں نئی جیوری کے سامنے دوبارہ مقدمہ پیش ہوا۔ اور ۲۵ مئی کو وائلڈ کو مجرم قرار دیا گیا اور دو سال قیدِ بامشقت کی سزا ہو گئی۔

جیل میں وائلڈ پر جو کچھ بیتی ہو گی اُس کا صرف تصور کیا جا سکتا ہے۔ رنج۔ غم۔ یاس۔ حرماں۔ بے بسی۔ انتقام۔ غصے کی کوئی خوفناک کیفیت ایسی نہ تھی جس کے شعلوں میں سے وہ نہ گذرا ہو۔ جس شخص کے لیے سیوائے میں بھی خاص اہتمام سے کھانا پکتا تھا، اب اُسے مٹی ملے ہوئے آٹے کی روٹی حلق سے نیچے اتارنا پڑتی تھی۔ جو شخص مخملیں بستر پر سونے اور دوپہر کو جاگنے کا عادی تھا، اب اُسے لکڑی کے تختے پر رات کاٹنا پڑتی تھی اور صبح چھ بجے جیل کے چوکیدار کی کرخت آواز اُسے اُٹھ بیٹھنے پر مجبور کر دیتی تھی۔ جس شخص کی فن کارانہ اختراعات نے لندن کے درزیوں کو لباس کے نئے سے نئے نمونے تیار کرنا سکھائے تھے اب اُسے قیدیوں کی مکروہ وردی میں اپنا جسم چھپانا پڑتا تھا۔ جس شخص کے حُسنِ تکلم کا شہرہ لندن سے نکل کر پیرس اور نیویارک تک پہنچ چکا تھا، اب اُسے زبان بندی کا حکم دے دیا گیا تھا اور اگر وہ کسی قیدی سے بات کرتے ہوئے دیکھ لیا جاتا تو سزا ملتی تھی۔ جس شخص نے قلم سے موتی بکھیرنے کے علاوہ عُمر بھر کوئی کام نہ کیا تھا اب اُسے پتھر کوٹنے اور زمین کھودنے کی مشقت پر لگا دیا گیا تھا۔ وائلڈ کے اِن دو برسوں کی سرگزشت بڑی رُوح فرسا۔ عبرت انگیز اور دردناک ہے۔ اُنیسویں صدی میں انگلستان کے جیل جہنم کا نمونہ تھے۔ جہاں ہر ممکن طریقے سے جسم و روح کو کچل دینے کی کوشش

کی جاتی تھی۔

آسکر وائلڈ کے گرفتار ہوتے ہی تھیٹر میں اُس کے ڈرامے بند کر دیئے گئے ناشروں نے اُس کی کتابیں چھاپنے اور کتب فروشوں نے بیچنے سے انکار کر دیا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ رات بھر میں قلاش اور فقیر ہو کر رہ گیا۔ وہ برسوں سے جس فضول خرچی اور عیش پسندی کی زندگی بسر کرتا آ رہا تھا اُس نے اُس کے مصارف کو آمدنی سے دو چند کر رکھا تھا۔ اب کہ موجودہ ابتلا میں اُسے اپنا مقدمہ لڑنے کے لیے بہت بڑی رقم کی ضرورت تھی اُس کی جیب میں ایک کوڑی تک نہ تھی۔ جو لوگ اُس کے دورِ عروج میں اُس کی ہم نشینی پر فخر کرتے تھے اب اُس کے سائے سے یوں گریزاں تھے گویا وہ جذام کا مریض ہے جس کے چھونے سے وہ خود بھی ماؤف اور ملوث ہو جائیں گے۔ اخبارات و رسائل پنجے جھاڑ کر اُس کے پیچھے پڑ گئے۔ مقدمہ ہنوز عدالت میں پیش تھا کہ اخباروں نے برملا اُس کو غلیظ ترین گالیوں کا ہدف بنانا شروع کر دیا۔ آسکر وائلڈ کے قدردان اُس کے وکیل سر ایڈورڈ کلارک کے ہمیشہ شکر گزار رہیں گے کہ اُس نے صرف لارڈ کوئنز بری کے استغاثے میں وائلڈ سے فیس وصول کی تھی۔ اس کے بعد جب وائلڈ کی گرفتاری عمل میں آئی تو سرکاری چالان سے لے کر وائلڈ کی سزا یابی تک اُس نے ایک پیسہ فیس کا مطالبہ نہیں کیا۔ اور دونوں مقدموں میں مُفت پیروی کرتا رہا۔

فریقِ مخالف کا وکیل ایڈورڈ کارسن جرح کا بہت بڑا ماہر شخص تھا۔ مقدمے کی پوری روئداد میں کارسن جگہ جگہ اُبھرتا، چمکتا اور گرجتا نظر آتا ہے۔

کوئنز بری نے اپنی صفائی میں ایک یہ حجت بھی پیش کی تھی کہ آسکر وائلڈ کی بعض تصانیف مخرب اخلاق ہیں۔ اور ثبوت میں اُس کے مشہور ناول ڈورین گرے اور بعض دیگر مطبوعہ مضامین کا حوالہ دیا تھا۔ چند خطوط بھی پیش کئے گئے تھے جو اُس نے وقتاً فوقتاً لارڈ الفریڈ ڈگلس کو لکھے تھے۔ کارسن نے ان خطوں کی عبارت کو نہایت گھناؤنے معنے پہنانے کی کوشش کی تھی۔ مقدمے کا یہ حصہ بڑا دلچسپ ہے۔ اور ادبیات کے ہر طالب علم کو اس کا مطالعہ کرنا چاہیئے۔ آسکر وائلڈ پہاڑ کی مانند اپنی جگہ کھڑا ہے۔ اور کارسن کے سوالوں کا ریلا دریا کی لہروں کی طرح چٹان سے ٹکرا ٹکرا کر واپس چلا جاتا ہے۔ وائلڈ کی شہرۂ آفاق حاضر جوابی، بدیہہ گوئی اور طنز اپنے عروج پر نظر آتی ہے۔

کارسن دائیں بائیں اور آگے پیچھے سے وار کرتا ہے۔ لیکن آسکر وائلڈ کے منجھے ہوئے اور نوکِ نشتر کی طرح تیز فقرے کارسن کے تمام حربوں کو بے کار بنا دیتے ہیں۔ کہیں کہیں تو اس کی ظرافت اس قدر بے پناہ ہو گئی ہے کہ خود جج اور جیوری کے ارکان بھی ہنسی کو روک نہیں سکے۔ کارسن یہ ثابت کرنا چاہتا ہے کہ آسکر وائلڈ کا نظریہ ادب برائے ادب اخلاق کی مروجہ اقدار کے خلاف ہے۔ اِس موضوع پر وائلڈ نے کارسن کو جو جواب دیئے وہ اس کے ادبی نقطۂ نگاہ کی پوری وضاحت کرتے ہیں۔ حق یہ ہے کہ جرح کے اس حصے میں کارسن آسکر وائلڈ کے سامنے دب کر رہ گیا ہے۔

اب کارسن نے فوراً پینترا بدلا اور جرح کا رُخ وائلڈ کی نجی زندگی کی طرف پھیر دیا۔ وائلڈ اس نوع کی آزمائش کے لیے تیار نہ تھا۔ کارسن نے ایک ایک

کر کے بہت سے نوجوانوں کے نام لینا شروع کئے جن سے وائلڈ کا ربط و ضبط تھا۔
ان میں کوئی ہوٹل کا بیرا تھا۔ اور کوئی سائیس۔ کوئی اخبار فروش تھا اور کوئی چپراسی
کوئی قلعی گر تھا۔ اور کوئی کوچبان۔ وائلڈ نے اس غیر متوقع حملے کے سامنے بھی
کچھ دیر جم کر کھڑے رہنے کی کوشش کی، لیکن سہو کہیے یا اضطرار، اس کی زبان
سے ایک ایسی بات نکل گئی جس سے اس کی بعض اخلاقی کمزوریوں کی
پردہ دری ہوتی تھی۔ کارسن نے اس موقع سے خوب فائدہ اٹھایا۔ اور شیر کی
طرح جھپٹ کر ایک ہی جست میں اپنے شکار کو دبوچ لیا۔ وائلڈ نے ہر چند ہاتھ
مارنے کی کوشش کی۔ لیکن اب وہ پوری طرح کارسن کے پنجے میں آچکا تھا۔
جب کوئنز بری کے خلاف استغاثہ واپس لے لیا گیا تو آسکر وائلڈ کے لیے
انگلستان سے باہر چلے جانا نہایت آسان تھا۔ خود اس کے وکیل سر ایڈورڈ کلارک
نے بھی اشاروں اشاروں میں یہی مشورہ دیا تھا۔ وائلڈ کی بیوی اور تمام دوستوں
نے بھی یہی رائے دی۔ حتیٰ کہ حکومت کا منشاء بھی یہی تھا کہ وائلڈ چلا جائے تو بہتر
ہے۔ لیکن اس پر ایک ایسی اندوہناک کیفیت طاری ہو گئی تھی جس نے
اس کے اعصاب کو مفلوج کر دیا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ آسکر وائلڈ ایک
تخیل پرست انسان تھا۔ دنیادار آدمی نہ تھا۔ عام پیشہ ور لوگوں کے ہتھکنڈوں
سے وہ قطعاً ناواقف تھا۔ اس نے اپنے قلم کی جنبش سے جو دنیا وضع کی تھی
وہ سراسر غیر حقیقی تھی۔ اس غیر حقیقی دنیا کے رمز و کنایہ سے تو وہ خوب آشنا تھا
لیکن جب اس پر حقیقی دنیا کے مصائب ٹوٹ پڑے تو ایک شیر خوار بچے کی طرح
سہم کر گر گیا۔

دنیا کی ہر چیز جس کا وائلڈ سے ظاہری یا معنوی تعلق تھا۔ اب لوگوں کے غم و غصہ کا ہدف بن گئی تھی۔ وائلڈ کے دونوں معصوم بچوں کو اُن کے باپ کے جرم کی پاداش میں سکول سے نکال دیا گیا۔ اُس کے مکان پر اوباش لوگ آ آ کر پتھر پھینکنے لگے۔ وائلڈ کے دوست ہر جگہ منہ چھپائے پھرتے تھے جب عافیت کی اور کوئی جگہ نظر نہ آئی تو وائلڈ کی بدقسمت بیوی اپنے بچوں کو لے کر انگلستان سے چلی گئی۔ سوئٹزرلینڈ، جرمنی، فرانس، اٹلی، جگہ جگہ یہ خانماں برباد کنبہ یوں پھرتا رہا گویا ذلت و رسوائی اُن کا تعاقب کر رہی ہے اور انھیں ارض و سما کے درمیان کہیں پناہ نہیں ملتی۔ بچوں کا خاندانی نام بدل دیا تھا۔ اب سیرل وائلڈ اور ویویین وائلڈ کی جگہ سیرل ہالینڈ اور ویویین ہالینڈ کہلاتے تھے۔ یہ بات شدت سے اُن کے ذہن نشین کرائی گئی تھی کہ اگر کسی محفل میں یا کسی شخص کے سامنے انھوں نے اپنے باپ کا نام لیا تو انھیں سخت سزا دی جائے گی۔ بار بار کہا جاتا تھا کہ اپنے باپ کو بالکل بھول جاؤ۔ بچوں کا ماموں ان کا سرپرست بن گیا تھا۔ اور قانونی کارروائی کے ذریعہ سے آسکر وائلڈ کا اپنی اولاد پر حقِ سرپرستی ساقط کرا دیا گیا تھا۔

وائلڈ کو جیل میں داخل ہوئے بمشکل پانچ مہینے گزرے تھے کہ قرضخواہوں نے جن میں پیش پیش لارڈ کوئنز بری تھا، اُس کے خلاف نالش کر دی اور عدالت نے اُسے دیوالیہ قرار دے دیا۔ اُس کے گھر کا بیش قیمت سامان اُس کے بچوں کے کھلونے۔ اُس کا کتب خانہ۔ اُس کی غیر مطبوعہ تصانیف کے مسودے سب کچھ نیلام کی بولی میں کوڑیوں کے دام لٹ گیا۔

قید کے آخری چند مہینوں میں وائلڈ کو جیل کے حکام نے کچھ لکھنے کی اجازت دے دی تھی۔ اس رعایت سے فائدہ اٹھا کر اس نے لارڈ الفریڈ ڈگلس کو اسّی صفحے کا ایک خط لکھا جس کے بعض حصوں نے بعد میں ڈی پروفنڈس کے نام سے کتابی صورت میں شائع ہو کر عالمگیر شہرت حاصل کی تھی۔ وائلڈ کو بیک وقت کاغذ کا صرف ایک ورق دیا جاتا تھا۔ اور جب وہ پورا ہو جاتا تو داروغہ جیل لے کر اپنے پاس رکھ لیتا۔ اور نیا ورق دے دیتا تھا۔ اس طرح ایک ایک کر کے آسکر وائلڈ نے اسّی صفحوں میں اپنے اس محبوب دوست کو، جو اٹلی اور فرانس کے مرغزاروں میں عیش و مسرت سے وقت گذار رہا تھا، اپنی تباہی اور بربادی کی داستان لکھی۔ رنج و غم کی اس خونچکاں سرگذشت میں وائلڈ نے اس بلا انگیز دوستی کے تمام پہلوؤں پر بحث کی ہے جس نے انجام کار اس کو زندان کی کال کوٹھری کے حوالے کر دیا تھا۔

الفریڈ ڈگلس کو ہمیشہ یہ شکایت رہی کہ یہ خط اس تک نہیں پہنچا۔ اس کے برعکس وائلڈ کا دوست رابرٹ راس کہتا تھا کہ اس نے خط کا اصلی مسودہ تو اپنے پاس رکھ لیا تھا۔ اور نقل ڈگلس کو بھیجدی تھی۔ بعد میں یہی خط بہت سے لڑائی جھگڑوں کا باعث بنا۔ اور بار بار عدالتوں میں زیر بحث آیا۔ ۱۹۰۹ء میں رابرٹ راس نے اصلی مسودے کو مہر کر کے اس ہدایت کے ساتھ برٹش میوزیم کے حوالے کر دیا تھا کہ ساٹھ سال تک اس کو نہ کھولا جائے گا لیکن جب ۱۹۴۵ء میں الفریڈ ڈگلس کا انتقال ہو گیا تو پورا خط شائع کرنے میں اب کوئی رکاوٹ باقی نہ تھی۔ چنانچہ ۱۹۴۹ء میں پہلی بار ڈی پروفنڈس کا

مکمل مسودہ کتاب کی صورت میں شائع ہوا۔ اور لوگوں نے بادیدۂ گریاں اور با سینۂ بریاں اس تحریر کا مطالعہ کیا جس کی نگارش میں آسکر وائلڈ نے دستانی کی جگہ خونِ جگر استعمال کیا تھا۔

تم سے بے جا ہے مجھے اپنی تباہی کا گلہ
اس میں کچھ شائبۂ خوبیٔ تقدیر بھی تھا

۱۹ مئی ۱۸۹۷ء کو وائلڈ قید خانے سے رہا ہوا۔ لیکن اب اُس کے لیے پوری دُنیا جیل سے کم نہ تھی۔ خدا کی وسیع سرزمین میں چپہ بھر جگہ ایسی نہ تھی جہاں وہ اطمینان سے بیٹھ کر سانس لے سکتا تھا، گھر بار لُٹ چکا تھا۔ بچے چھن گئے تھے۔ بیوی نے ساتھ رہنے سے انکار کر دیا تھا۔ تصانیف کے جملہ حقوق دیوالہ کی عدالت کے قبضے میں چلے گئے تھے۔ بے سروسامانی کی اس حالت میں وائلڈ نے اُسی شام انگلستان کو خیرباد کہہ کر فرانس کا رُخ کیا۔ چند مخلص و بے ریا دوستوں کی محبت اُس کی زندگی کی سب سے بڑی متاع تھی۔ اور یہ متاع آخر وقت تک اُسے حاصل رہی۔ رابرٹ راس۔ ریجی ٹرنر اور رابرٹ شیرارڈ اُس کے ہمراہ فرانس گئے۔ اور اُنہی کی مدد سے وائلڈ نے نئے سرے سے زندگی شروع کرنے کا منصوبہ تیار کیا۔

لیکن اب ذہناً و فکراً آسکر وائلڈ ختم ہو چکا تھا۔ جب وہ قلم اور کاغذ لے کر بیٹھتا تو ماضی کا بھوت اُس کے دماغ پر چھا جاتا تھا۔ گذرے ہوئے دنوں کی یاد اُسے رہ رہ کر ستاتی تھی۔ اور جب وہ گذشتہ دورِ عروج کا اپنی موجودہ المناک زندگی سے مقابلہ کرتا تو ایک آہِ سرد اُس کے سینے سے نکلتی اور اس کا

قلم دفعتہً رک جاتا تھا۔ اُس کا دماغ خیالات و احساسات کا ایک محشرستان تھا۔ لیکن یہ محشر اپنے اظہار کے لیے الفاظ کا محتاج تھا اور وہ شخص جو ایک زمانے میں الفاظ و محاورات کا خالق اور زبان و بیان کا مالک تسلیم کیا گیا تھا۔ اب گھنٹوں اِس انتظار میں پیچ و تاب کھاتا کہ اُس کے افکار الفاظ کا جامہ پہن کر نہاں خانۂ دماغ سے باہر آئیں۔ اور جب وہ اپنی بے بسی سے تنگ آجاتا تو قلم اور کاغذ پھینک کر اُٹھ کھڑا ہوتا تھا۔

خارجی دنیا کے مظاہر بھی اُس کے لیے اپنی جاذبیت کھو چکے تھے۔ انگلستان میں اُس کا نام تک لینا معیوب خیال کیا جاتا تھا۔ ایک روز وہ پیرس کی نمائش میں گھوم رہا تھا کہ اُسے دیکھتے ہی تمام انگریز، جن میں عورتیں اور مرد دونوں شامل تھے، فوراً نمائش گاہ سے باہر چلے گئے۔ اگر وہ کسی ہوٹل میں قدم رکھتا تو ہوٹل کا مالک، اِس خوف سے کہ اُس کے گاہک وہاں آنا ترک کر دیں گے، اُسے کھڑے کھڑے ہوٹل سے نکال دیتا تھا۔ عورتیں اُس کو دیکھ کر شرم اور غصے کے مارے ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپا لیتی تھیں۔ بہت سے لوگ جو ایک زمانے میں اُس کی ثنا خوانی کرتے اور دوستی کا دم بھرتے تھے۔ اب اگر کہیں اُسے راستے میں دیکھ لیتے تو کنی کاٹ کر نکل جاتے تھے۔ تنگ دستی مفلوک الحالی اور ستم رسیدگی کا مرقع بنا ہوا، آسکر وائلڈ پیرس کی سڑکوں پر مارا مارا پھرتا تھا۔ اُس کے چند جاں نثار دوست حتی الامکان مدد سے دریغ نہ کرتے تھے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ انہی کے سہارے وہ زندگی کے دن پورے کر رہا تھا۔

۷ اپریل ۱۸۹۸ء کو اس کی بیوی اٹلی کے ایک دور افتادہ گاؤں میں

فوت ہو گئی، اور یوں مہر و اُلفت کا وہ آخری بندھن بھی ٹوٹ گیا جس کے متعلق بعض لوگوں کو گمان تھا کہ شاید یہ رشتہ کبھی وائلڈ کے دُکھے ہوئے دل کے لیے مرہم کا کام دے گا۔ ٹھرا پی پی کر اُس نے اپنے اعصاب تباہ کر لیے تھے اُس کا مضبوط و توانا جسم صرف ایک چلتا پھرتا ڈھانچہ رہ گیا تھا۔ اور زندگی گویا ایک تہمت بن کر اُس کے ساتھ چپک گئی تھی۔ اس دَور میں اس کا سب سے بڑا کارنامہ وہ طویل نظم ہے جو اُس نے ریڈنگ جیل کا گیت کے عنوان سے لکھی تھی۔ آسکر وائلڈ نے ایک شاعر کی حیثیت سے کبھی نام پیدا نہیں کیا۔ لیکن ریڈنگ جیل کا گیت بلاشبہ انگریزی ادب میں ایک غیر فانی چیز ہے۔

اکتوبر ۱۹۰۰ء میں اُس پر درد سر کے دَورے پڑنے لگے بعض اوقات درد کی شدت سے وہ بے ہوش ہو ہو جاتا تھا۔ جب معمولی دوا دارو سے کام بنتا نظر نہ آیا تو ڈاکٹروں نے آپریشن کا مشورہ دیا۔ لیکن آپریشن کی فیس اتنی زیادہ تھی کہ وائلڈ اس کا متحمل نہ ہو سکتا تھا۔ جب گھڑی بھر کے لیے درد رفع ہوتا تو آسکر وائلڈ کی خوش طبعی لوٹ آتی تھی۔ اور وہ پھر بذلہ سنجی اور بدیہہ گوئی سے اپنے گرد و پیش بیٹھنے والوں کو محظوظ کرتا تھا۔ نومبر میں اُس کا مرض ناقابلِ برداشت ہو چلا تھا۔ اور یہ خبر سنتے ہی اُس کا وفادار دوست رابرٹ راس تیمارداری کے لیے آ گیا۔ آخر ۳۰ نومبر ۱۹۰۰ء کی سہ پہر کو ایک جاں گسل کشمکش کے بعد، یہ یادگارِ زمانہ شخص ختم ہو گیا، اور کیٹس اور شیلے کی طرح اسے بھی غربت میں ابدی آرام گاہ میسر آئی۔

زمینِ غربتش آخر بہ از وطن باشد

آج سے تیس چالیس سال قبل اُردو ادب پر آسکر وائلڈ کا اچھا خاصا اثر پڑا تھا۔ نیاز فتح پوری، ل۔ احمد اکبر آبادی اور خلیقی دہلوی کی ابتدائی تحریروں میں یہ اثر نمایاں ہے۔ حکیم احمد شجاع کے مشہور افسانے "حسن کی قیمت" میں بھی وائلڈ کا پرتو نظر آتا ہے۔ ہادی حسین سابق ایڈیٹر ہزار داستان (حال ؎ ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی
کچھ ہماری خبر نہیں آتی)

ایک زمانے میں ولد الزنا گانِ وائلڈ میں شمار ہوتے تھے۔ اُنھوں نے ڈورین گرے کا ترجمہ بھی شروع کیا تھا۔ جو بعض وجوہ سے مکمل نہ ہو سکا۔ اگر ہادی حسین کو فکارِ معیشت فرصت دیتے تو وائلڈ کے بہترین مترجم ثابت ہو سکتے تھے۔ ن۔ م۔ راشد نے بھی اِس ناول کے ابتدائی دو باب اُردو میں منتقل کئے تھے۔ سیّد عابد علی عابد نے ڈی پروفنڈس کا ترجمہ شروع کیا تھا۔ لیکن وہ بھی تکمیل کو نہ پہنچ سکا۔ وائلڈ کے بعض مختصر افسانوں اور دو ایک ڈرامے کا بھی اُردو میں ترجمہ ہوا ہے لیکن سچ یہ ہے کہ ترجمے میں وائلڈ کے حُسنِ بیان کو قائم رکھنا معمولی انشا پرداز کے بس کی بات نہیں۔ اس کے لیے ہزار شیوہ قلم درکار ہے۔

موت کے وقت آسکر وائلڈ کی عمر صرف چھیالیس برس تھی۔ اگر وہ قید و بند کا شکار نہ ہوتا اور عام حالات کے مطابق پندرہ، بیس سال اور زندہ رہتا تو ارنسٹ کے پائے کے کم از کم دس بارہ ڈرامے ضرور لکھ جاتا۔ وائلڈ کا موجودہ ادبی سرمایہ کچھ بہت زیادہ نہیں۔ لیکن یہی سرمایہ اُس کو بقائے دوام بخشنے

کے لیے کافی ہے۔ جو لوگ وائلڈ کے ادب کو سطحی کہہ کر ناک بھوں چڑھانے کے عادی ہیں، انھیں اُس کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ پڑھنا چاہیے، جس میں اس نے وہ اجتہادی نظریے پیش کیے ہیں۔ جنھوں نے اُس کے عصر کو چونکا دیا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ بائرن کی طرح وائلڈ کی طوفانی زندگی اُس کی ادبی تخلیقات سے بڑھ کر لوگوں کی توجہ کا مرکز بنی رہی ہے۔ ورڈزورتھ یقیناً بائرن سے بڑا شاعر ہے۔ لیکن بائرن پر جتنی کتابیں شائع ہوئی ہیں۔ اُن سے نصف کتابیں ورڈزورتھ پر نہیں لکھی گئیں، یہی حال آسکر وائلڈ کا ہے۔ اُس کے عروج و زوال اور انجام کی دردانگیز داستان ہمیشہ لوگوں کے لیے دلچسپی اور عبرت کا سامان مہیا کرتی رہے گی۔

پہلی جنگِ عظیم کے بعد سے آسکر وائلڈ کی تصانیف نے پھر سے انگلستان میں اپنا اصلی مقام حاصل کر لیا ہے۔ بدنامی کے سارے داغ دھل گئے ہیں۔ اور فضا یکسر بدل گئی ہے۔ ماحول میں یہ خوشگوار تبدیلی پیدا کرنے کا سہرا وائلڈ کے عزیز دوست رابرٹ راس کے سر ہے۔ جس کی دن رات کی کوششوں سے کتابوں کے نئے ایڈیشن طبع ہونا شروع ہوئے۔ یہاں تک کہ ۱۹۰۶ء ہی میں وائلڈ کے تمام قرض خواہوں کا حساب چکا دیا گیا۔ اور جملہ تصانیف کے حقوق آسکر وائلڈ کے بچوں کے نام منتقل ہو گئے۔ چلسی کے ٹاؤن ہال میں وائلڈ کی تصویر آویزاں کی گئی اور اُس کے ڈرامے بار بار انگلستان کے ناٹک گھروں میں کھیلے جانے لگے۔ ۱۹۳۸ء میں ارنسٹ مسدل نو جھینے لندن کے ایک ہی تھیٹر میں چلتا رہا اور لوگوں کا ذوق و شوق کم ہونے میں نہ آتا تھا۔

سنہ ۱۹۰۴ء میں پھر ارنسٹ کھیلا گیا۔ اور بادشاہ جارج ششم اپنی ملکہ اور دونوں شہزادیوں کے ساتھ کھیل دیکھنے آئے۔ نومبر سنہ ۱۹۵۰ء میں جب وائلڈ کی وفات کی پچاسویں برسی منائی گئی تو ٹائمز ایسے اخبار نے بھی اپنے پہلے تین صفحے آسکر وائلڈ کے کام پر تنقید و تبصرہ کے لیے وقف کر دیئے تھے۔

پچھلے دنوں وائلڈ کے صاحبزادے ویویین ہالینڈ نے مجھے بتایا کہ صرف سنہ ۱۹۴۶ء اور سنہ ۱۹۴۷ء کے دو برسوں میں اُنھوں نے اپنے باپ کی تصانیف سے جو رائلٹی وصول کی، اُس کی مجموعی رقم سترہ ہزار پونڈ تھی۔ اِسی ایک واقعہ سے ہوا کا موجودہ رُخ معلوم کیا جا سکتا ہے۔

اب کہ آسکر وائلڈ کی عظمتِ رفتہ بحال ہو چکی ہے۔ اور تعصب کے سیاہ بادل جنھوں نے اُس کے نام اور کام کو چھپا رکھا تھا ایک ایک کر کے چھٹ گئے ہیں۔ دُنیا کے گوشے گوشے سے دلدادگانِ شوق اور آشفتگانِ عشق یہاں آیا کریں گے۔ اور ٹائٹ سٹریٹ میں چونتیس نمبر کے مکان کے سامنے کھڑے ہو کر اُس شخص کی یاد میں اپنی چشمِ تر سے ایک آنسو گرائیں گے جس کے قلم کی سحر کار جنبش نے فکر کو نئی پرواز، الفاظ کو نئے معنی اور زبان کو نیا رنگ روپ عطا کیا تھا۔ جس کی غیر معمولی انفرادیت نے اُسے شہرت و ناموری کے آسمان پر پہنچایا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے ذلت و رسوائی کے تحت الثریٰ میں گرا دیا۔

لندن سنہ ۱۹۵۶ء

شیکسپیئر کا وطن

پچھلی گرمیوں میں پھر ایک بار مجھے شیکسپیئر کے وطن کی سیر کا اتفاق ہوا۔ سٹریٹفرڈ کا قصبہ جو شیکسپیئر کا مولد بھی ہے اور مدفن بھی، لندن سے نوّے میل دور دریائے ایون کے کنارے واقع ہے۔ اس لیے سٹریٹفرڈ آن ایون کہلاتا ہے قصبے کی آبادی تیرہ ہزار کے لگ بھگ ہے۔ سڑکیں، کوچے، بازار بالکل وہی ہیں، جو انگلستان کے علم قصبوں میں آپ کو نظر آئیں گے۔ اس بارے میں سٹریٹفرڈ کو قطعاً کوئی خصوصیت حاصل نہیں۔ البتہ قصبے کا ایک ایک گوشہ شیکسپیئر کے نام سے منسوب ہو کر حیاتِ جاوداں حاصل کر چکا ہے۔

ہنلے سٹریٹ میں وہ مکان اب تک محفوظ ہے جہاں ۲۳ اپریل ۱۵۶۴ء کو شیکسپیئر پیدا ہوا تھا۔ یہاں سے ہٹ کر مشرقی سمت کو جائیں تو پندرہ ایک منٹ کے فاصلے پر وہ مکان کھڑا ہے جو نیو پلیس کے نام سے مشہور ہے شیکسپیئر نے

اپنی زندگی کے آخری سات سال یہاں گزارے تھے، اور ۲۳ اپریل ۱۶۱۶ء
کو اُس کا انتقال بھی اِسی مکان میں ہوا تھا۔ اِس سے متصل نیو پلیس میوزیم کی عمارت
ہے جہاں ایک زمانے میں شیکسپیئر کی نواسی الزبتھ اور اُس کا شوہر ڈاکٹر ناش
رہتے تھے۔ قصبے کی چرچ سٹریٹ میں وہ گریمر سکول بھی موجود ہے جہاں شیکسپیئر
پڑھتا تھا۔ سکول کی عمارت کے نچلے حصے میں وہ گلڈ ہال ہے جہاں شیکسپیئر کے زمانے
میں ناٹکوں کی سفری کمپنیاں اپنے کھیل دکھایا کرتی تھیں۔ بعض نقادوں کی رائے
ہے کہ بچپن میں یہی کھیل دیکھ دیکھ کر شیکسپیئر کا رُجحان تھیٹر کی طرف ہوا تھا
ایک اور مکان جو ہالز کرافٹ کے نام سے موسوم ہے۔ شیکسپیئر کی چھوٹی بیٹی سوسن
اور اُس کے شوہر ڈاکٹر جان ہال کی اقامت گاہ رہ چکا ہے۔ دریائے ایون کے
اُس پار ہولی ٹرنٹی کا گرجا ہے جس کے ایک کونے میں شیکسپیئر دفن ہے۔ شیکسپیئر
کے مرقد کے قریب ہی اُس کی بیوی، بیٹی، داماد اور نواسی کی قبریں ہیں۔ دیوار پر
شیکسپیئر کا ایک خوب صورت مجسمہ نصب ہے۔ عام خیال ہے کہ شیکسپیئر کے مرنے
کے سات سال بعد یہ مجسمہ تراشا گیا تھا۔ اِس لیے شکل و صورت کے اعتبار سے اُسے
شیکسپیئر کی صحیح تصویر قرار دیا جاتا ہے۔ دریا کے مغربی کنارے پر شیکسپیئر میموریل
تھیٹر کی خوب صورت عمارت ہے۔ یہ تھیٹر پہلے پہل ۱۸۷۹ء میں قائم ہوا
تھا۔ لیکن ۱۹۲۶ء میں یہاں خوفناک آگ لگی۔ جس سے ساری عمارت جل گئی۔ ۱۹۳۲ء
میں موجودہ عمارت تعمیر کی گئی تھی، جس کے لیے یورپ اور امریکہ میں چندہ جمع ہوا
اور شیکسپیئر کے مداحوں نے دل کھول کر روپیہ دیا۔ رات کے وقت جب اِس
چراغاں ہوتا ہے۔ اور روشنی کا عکس سطحِ دریا پر پڑتا ہے تو یوں معلوم ہوتا ہے

کہ تھیٹر کی عمارت گویا دریا کے عین وسط میں تیر رہی ہے۔

قصبے میں داخل ہوں تو جو چیز سب سے پہلے ہماری توجہ کی طلب گار بنتی ہے، وہ شیکسپیئر کی ولادت گاہ ہے۔ یہ ایک چھوٹا سا دو منزلہ مکان ہے، جس کے نچلے حصے میں تین کمرے اور باورچی خانہ ہے۔ زینہ چڑھ کر اوپر جائیں تو سڑک کے رُخ وہ کمرہ ہے جہاں شیکسپیئر پیدا ہوا تھا۔ اس کمرے کی ظاہری وضع قطع بالکل اس قسم کی ہے جیسے سولہویں صدی میں انگلستان کے عام مکانوں کی تھی۔ کمرے میں ایک پلنگ، دو کرسیاں اور ایک پنگوڑا رکھا ہے۔ یہ عادت غالباً دُنیا کے ہر حصے میں پائی جاتی ہے کہ لوگ جب کوئی پرانی تاریخی عمارت دیکھنے جاتے ہیں تو دیواروں اور کواڑوں پر اپنے اپنے نام بھی لکھ دیتے ہیں۔ شیکسپیئر کی اس ولادت گاہ کے دریچے پر جن لوگوں کے دستخط اب تک محفوظ ہیں۔ اُن میں سر والٹر سکاٹ۔ ٹامس کارلائل۔ ہنری اِرونگ۔ براؤننگ اور ایلن ٹیری جیسی مشہور و معروف ہستیاں بھی شامل ہیں۔

شیکسپیئر کی زندگی میں یہ مکان دو حصوں میں تقسیم تھا۔ ایک حصے میں شیکسپیئر کے باپ کی دُکان تھی اور دوسرے میں اُس کا کنبہ رہتا تھا۔ لیکن اب یہ دونوں حصے ملا دیئے گئے ہیں۔ نچلی منزل کے ایک کمرے کو میوزیم کی شکل دے کر شیکسپیئر کے خاندان کی بہت سی چیزوں کو بطور یادگار جمع کر دیا گیا ہے۔ شیکسپیئر کے باپ کو قصبے کی کونسل نے کسی وجہ سے دس پونڈ جرمانہ کر دیا تھا۔ اس جرمانے کی سرکاری یادداشت کو ایک چوکھٹے میں محفوظ کر کے دیوار پر لگا رکھا ہے۔ شیکسپیئر کی ایک تلوار اور ایک انگوٹھی بھی موجود ہے۔ شیکسپیئر کے کسی دوست رچرڈ کوئنے نے لندن

سے ۲۵ اکتوبر ۱۵۹۸ء کو شیکسپیئر کو خط لکھا تھا کہ مہربانی کر کے مجھے تیس پونڈ قرض عنایت کیجیے۔ وہ خط بھی بجنسہٖ محفوظ ہے۔ کہا جاتا ہے کہ شیکسپیئر کے دوستوں اور عزیزوں نے اُس کو جو خطوط لکھے تھے اُن میں سے صرف یہی خط اِس وقت محفوظ ہے۔[1]

مکان کے ساتھ ایک چھوٹا سا خوب صورت پائیں باغ بھی ہے جس میں پھولدار پودوں کے علاوہ چُن چُن کر وہ درخت لگائے گئے ہیں جن کا ذکر شیکسپیئر کے ڈراموں میں آتا ہے۔ ہنلے سٹریٹ جس پر یہ مکان واقع ہے، قصبے کی اچھی خاصی بارونق سڑکوں میں شمار ہوتی ہے نہیں کہا جا سکتا کہ خود شیکسپیئر کے وقت میں اِس شارع عام کی کیا کیفیت تھی۔ مکان دیکھنے کے لیے ڈیڑھ شلنگ کا ٹکٹ خریدنا پڑتا ہے۔ اندر ایک رجسٹر بھی رکھا ہے جس پر زائرین اپنے دستخط کرتے ہیں۔ اِن دستخطوں کی تعداد سے اندازہ کیا گیا ہے کہ ہر سال تقریباً ڈھائی لاکھ آدمی اس مکان کی زیارت کو آتے ہیں جن میں رُوس اور امریکہ سے لے کر مصر و روم و شام تک ہر ملک کے وارفتگانِ شوق شامل ہیں۔

شیکسپیئر کی ولادت گاہ کو دیکھ کر سیاح اُس مکان کا رُخ کرتے ہیں جہاں شیکسپیئر فوت ہوا تھا۔ اس مکان کا نام نیو پلیس ہے۔ روایت ہے کہ شیکسپیئر نے ۱۵۹۷ء میں یہ مکان ساٹھ پونڈ میں خریدا تھا۔ اور پھر اس میں بہت سی تبدیلیاں کر کے

---

[1] اس خط کی زبان بڑی عجیب و غریب ہے۔ "Lovinge good frende and Countreyman M. Wm. Shackespere. You shall ffrende me muche in helpinge me out of all debtes I owe in London."

بالکل نئی وضع قطع دے دی تھی۔

۱۶۰۹ء میں جب شیکسپیئر لندن کے ہنگاموں سے کنارہ کشی کر کے واپس وطن آیا تو اُس نے نیو پلیس ہی میں اقامت اختیار کی تھی۔ اور دو ڈرامے ٹمپسٹ اور وِنٹرز ٹیل اِسی مکان میں لکھے تھے۔ اُس کے دوست بن جانسن اور مائیکل ڈریٹن شیکسپیئر کی ملاقات کو اسی مکان میں آتے تھے اور یہیں محفلِ ہاؤ ہُو برپا ہوتی تھی۔ مرنے سے پہلے شیکسپیئر نے یہ مکان اپنی بیٹی سوسن ہال اور نواسی الزبتھ کو جیتے کر دیا تھا۔

نیو پلیس کو بھی اب ایک میوزیم کی صورت میں تبدیل کر دیا گیا ہے۔ جہاں بہت سے ایسے نوادر رکھے ہیں جن کا تعلق سٹریٹفرڈ کی قدیم ترین تاریخ سے ہے۔ شیکسپیئر کے ذاتی استعمال کی بھی چند چیزیں محفوظ کی گئی ہیں۔ شیکسپیئر کی زندگی میں یہاں شہتوت کا ایک بہت بڑا درخت تھا جس کی لکڑی سے بنی ہوئی ایک بیضوی شکل کی میز بھی موجود ہے۔

مکان سے ملحق وہ ایسے خوبصورت، دلآویز اور حسین و جمیل باغ ہیں۔ کہ اُن میں قدم رکھتے ہی یوں محسوس ہوتا ہے گویا ہم یکایک عالمِ سفلی سے نکل کر فردوسِ بریں میں پہنچ گئے ہیں۔ زمین کا یہ قطعہ شیکسپیئر کی زندگی میں نیو پلیس کا حصہ تھا، جہاں سبزی کاشت کی جاتی تھی۔ اب اِس میں باغ لگا دیئے گئے ہیں۔ انگلستان میں باغبانی کا فن یوں بھی بڑا ترقی یافتہ ہے۔ لیکن نیو پلیس کے باغ دیکھ کر تو یہاں کے باغبانوں کی فن کاری اور ذوقِ جمال کی بے اختیار داد دینے کو جی چاہتا ہے۔ روشیں اتنی خوبصورت اور پاکیزہ ہیں کہ چلتے وقت دھڑکا ہوتا ہے کہ کہیں ہمارے قدموں

سے ملوث ہو کر خراب نہ ہو جائیں۔ پھولوں کی کثرت اور تنوع کو دیکھ کر جنبشِ نگاہ کا مفہوم سمجھ میں آتا ہے۔ ماحول اتنا پُرسکون اور فرحت بخش اور ہوا اتنی عطر بیز کہ گھنٹوں بیٹھ کر بھی سیری نہیں ہوتی۔ نیو پیلس میں داخل ہونے کے لیے ڈیڑھ شلنگ کا ٹکٹ خریدنا پڑتا ہے۔

اب آئیے اُس اسکول کی ایک جھلک دیکھیں، جہاں شیکسپیئر پڑھتا تھا۔ شیکسپیئر کے نقادوں کے لیے یہ مسئلہ ایک عقدۂ لاینحل ہے۔ کہ دُنیا کے اِس سب سے بڑے ڈرامہ نگار نے تعلیم کہاں تک حاصل کی تھی۔ بعض کہتے ہیں کہ وہ یونہی سی لاطینی زبان جانتا تھا لیکن یونانی سے بالکل ناآشنا تھا۔ کچھ بھی ہو یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ فطرتِ انسانی کے رموز و غوامض کو جس قدر شیکسپیئر سمجھتا تھا دُنیا کے بہت کم شاعروں اور ادیبوں کو وہاں تک رسائی حاصل ہوئی ہے۔ ۱۵۷۱ء میں شیکسپیئر اِس اسکول میں داخل ہوا تھا اور قدیم روایات سے پتہ چلتا ہے کہ اُس کی نشست گاہ کمرے کے شمال مغربی گوشے میں تھی۔ جس ڈیسک پر وہ بیٹھا کرتا تھا وہ اب تک محفوظ ہے۔ ایک روایت یہ بھی مشہور ہے کہ تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد شیکسپیئر اسی اسکول میں مدرّس ہو گیا تھا۔ لیکن بعض زبردست شواہد کی بنا پر اس روایت کو درست تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔

اسکول کے سامنے جو مکانوں کی قطار ہے وہیں ایک مکان میں شیکسپیئر میموریل لائبریری ہے۔ شیکسپیئر کی زندگی اور ڈرامہ نگاری سے تعلق رکھنے والی جزئیات میں شاید ہی کوئی ایسی بات ہو گی، جس کے متعلق مستند اور غیر مستند ہر قسم کا مواد یہاں موجود نہ ہو۔ دنیا کی مختلف زبانوں میں شیکسپیئر کے ڈراموں کے جس قدر تراجم کئے گئے

ہیں اُن کی جلدیں ترتیب وار اس جگہ رکھی ہیں۔ تھیٹر کی فنی ضروریات پوری کرنے کے لیے شیکسپیئر کے ڈراموں کے متن میں وقتاً فوقتاً جو تبدیلیاں ہوتی رہی ہیں اُن کی نقول بھی یہاں الماریوں میں پڑی ہوئی ہیں۔ غرضکہ شیکسپیئر پر تحقیق و تنقید کا کام کرنے والے طالب علم کے لیے اس لائبریری سے بہتر جگہ غالباً اور کوئی نہ ہوگی۔

لائبریری سے متصل ایک دوسری عمارت میں شیکسپیئر پکچر گیلری ہے۔ دہلیز سے اُس طرف قدم رکھتے ہی تصویروں اور رنگ برنگ مرقعوں کا ایک طلسم ہوشربا آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔ گیلری اوپر ہے۔ جہاں زینہ طے کرکے جانا پڑتا ہے لیکن سیڑھیوں کے ساتھ ساتھ پوری دیوار آئینہ بندی سے مزین کی گئی ہے۔ اور رنگ دار شیشوں پر جگہ جگہ شیکسپیئر کے متعدد ڈراموں کے مناظر، بڑی چابک دستی سے نقش کئے گئے ہیں۔ اس گیلری کے بانی ایک شخص چارلس ایڈورڈ فلاور تھے۔

تصویروں کی یہاں اس قدر بہتات اور فراوانی ہے کہ بلا مبالغہ چشم تماشا تھک کر مجروح ہو جاتی ہے۔ یورپ، امریکہ اور ایشیا میں جہاں جہاں اور جس جس زمانے میں شیکسپیئر کے ڈرامے دکھائے گئے ہیں۔ ہر ملک اور ہر دور کے تمام ایکٹروں اور ایکٹرسوں کی تصویریں دیواروں پر آویزاں ہیں جس جس ملک میں جو جو لباس، ان ڈراموں کے لیے وضع کئے گئے تھے۔ اُن ملبوسات کی تصویریں بھی لٹک رہی ہیں۔ سٹیج کے سیکڑوں مختلف مناظر کے رنگین مرقعے چوکھٹوں میں جڑے ہوئے ہیں۔ خود شیکسپیئر کی بہت سی تصویریں بھی یہاں رکھی ہیں غرض کہ شیکسپیئر سے دلچسپی رکھنے والا ہر شخص، محض اِن تصویروں کو ایک نظر دیکھ لینے کے بعد شیکسپیئر کے ڈراموں کے متعلق اچھی خاصی معلومات حاصل کر سکتا ہے۔ اس

گیلری میں داخل ہونے کے لیے بھی ڈیڑھ شلنگ کا ٹکٹ خریدنا پڑتا ہے۔

تھیٹر کے عین سامنے، لب دریا ایک خوب صورت سبزہ زار میں شیکسپیئر کا تبتی مجسمہ نصب ہے۔ عمارت کی شکل یہ ہے کہ ایک وسیع چبوترے کے درمیان پتھر کا ایک مینار کھڑا کر کے اس کے اوپر شیکسپیئر کا مجسمہ لگایا گیا ہے شیکسپیئر کو کرسی پر بیٹھا ہوا دکھایا گیا ہے اور نیچے مینار پر شیکسپیئر کے چند مشہور ڈراموں کے یادگار فقرے کندہ کئے گئے ہیں۔

چبوترے کے چاروں کونوں پر شیکسپیئر کے تخلیق کئے ہوئے چار زندہ جاوید ڈرامائی کرداروں کے مجسمے نصب کئے گئے ہیں، جن میں ہملٹ۔ لیڈی میکبتھ جان فالسٹاف اور پرنس ہال شامل ہیں۔ شیکسپیئر کا مجسمہ اتنا بلند ہے کہ دور سے صاف نظر آتا ہے۔

سٹریٹفرڈ کے گرد و نواح میں بھی اگر دو دو میل تک گھومنے کا اتفاق ہو۔ تو بعض ایسی یادگار عمارتیں ملیں گی جن کا شیکسپیئر کی زندگی کے ساتھ بہت گہرا تعلق ہے۔ مثلاً شیکسپیئر کی سسرال کا مکان، جہاں سے وہ اپنی بیوی این ہاتھاوے کو ۱۵۸۲ء میں بیاہ کر لایا تھا۔ نوجوان دولھا کی عمر اس وقت اٹھیس سال تھی، اور دلہن اس سے سات سال بڑی تھی۔ یہ مکان بھی آثار قدیمہ کے طور پر محفوظ ہے۔ اور اندر جانے کے لیے ڈیڑھ شلنگ کا ٹکٹ خریدنا پڑتا ہے۔

اس کے علاوہ ہیمپٹن لوسی، شارل کوٹ۔ فل برک پارک۔ کلاپٹن ہاؤس، ٹمپل گریفٹن، میری ایڈن ہاؤس وغیرہ ایسے متعدد مکان ہیں، جن کا تعلق شیکسپیئر

کی نجی زندگی سے ہے۔ اور جن کا ذکر اُس کے بعض ڈراموں میں بھی ملتا ہے۔

سٹریٹفرڈ میں دو اور مکان بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ ایک ہارورڈ ہاؤس، جو جان ہارورڈ کی ملکیت تھا۔ جس نے امریکہ کی مشہور ہارورڈ یونیورسٹی کی بنیاد رکھی تھی۔ یہ شخص ۱۶۰۷ء میں اس مکان میں پیدا ہوا تھا۔ اور وطن چھوڑ کر امریکہ چلا گیا تھا۔ جہاں اکتیس سال کی عمر میں تپ دق سے اُس کا انتقال ہوا۔ مرتے وقت اُس نے اپنی نصف جائداد، جس کی قیمت کا اندازہ سات سو اسّی پونڈ کیا جاتا ہے ہارورڈ کالج قائم کرنے کے لیے وصیت کر دی تھی۔ اس کے علاوہ اپنا پورا کتب خانہ بھی جس میں تین سو کے لگ بھگ نسخے تھے، اس کالج کو وقف کر دیا تھا۔ وہی معمولی سا کالج جس کی بنیاد ۱۶۳۸ء میں سات سو اسّی پونڈ سے رکھی گئی تھی آج بڑھتے بڑھتے ہارورڈ یونیورسٹی کی صورت اختیار کر چکا ہے۔ جو دنیا بھر میں علم و دانش کی سب سے بڑی درس گاہ سمجھی جاتی ہے۔ ہارورڈ ہاؤس بھی آثارِ قدیمہ کے تحت محفوظ ہے اور داخلے کے لیے ایک شلنگ خرچ کرنا پڑتا ہے۔

قصبے کی چرچ سٹریٹ میں ایک مکان موسومہ میسن کرافٹ بھی بعض لوگوں کے لیے بڑی کشش رکھتا ہے۔ کیونکہ انگلستان کی مشہور ناول نویس خاتون میری کوریلی کی اقامت گاہ رہ چکا ہے۔ جس نے ۱۸۹۹ء میں سٹریٹفرڈ کو اپنا وطن بنا لیا تھا۔ اور مسلسل پچیس سال اس مکان میں مقیم رہی تھی۔ آج کل یہاں برٹش کونسل کا دفتر ہے۔

سٹریٹفرڈ میں ہر سال ۲۳ اپریل کو شیکسپیئر کی سالگرہ کا جشن بڑی دھوم دھام سے منایا جاتا ہے۔ یہ تقریب اپنی نوعیت کے اعتبار سے ایک طرح عالم گیر شہرت

حاصل کر چکی ہے۔ جہاں دنیا کے دور دراز گوشوں سے لوگ شرکت کے لیے آتے ہیں۔ انگریزی میں اس کو شیکسپیئر فیسٹیول کا نام دیا گیا ہے۔ اس کی ابتدا ۱۸۲۴ء میں ہوئی تھی۔ جب مسلسل ہفتہ بھر شیکسپیئر کا ایک کھیل "میچ ایڈو اباؤٹ نتھنگ" سٹیج پر دکھایا گیا تھا۔ اندن کی تھیٹریکل دنیا کے بڑے بڑے نقادوں اور ایکٹروں نے سٹریٹفرڈ کی اس جرأت کو ایک "قصباتی ناٹک" کہہ کر حقارت اور تمسخر کا اظہار کیا تھا۔ لیکن وہی قصباتی ناٹک آہستہ آہستہ اتنی ترقی کر گیا کہ آج انگلستان کے بہترین ایکٹر سٹریٹفرڈ میں کام کرنا اپنے لیے باعثِ فخر سمجھتے ہیں۔

۱۹۰۸ء میں فیسٹیول کی تقریب میں ایک جدت پیدا کی گئی وہ یوں کہ دنیا کے مختلف ممالک کے جو سفارت خانے لندن میں موجود تھے اُن کے نمائندے اپنے اپنے ملک کے پرچم اٹھا کر سٹریٹفرڈ پہنچے اور ۲۳ اپریل کو صبح ساڑھے نو بجے جب شیکسپیئر کے مکان سے جلوس روانہ ہوا تو ان تمام غیر ملکی نمائندوں نے اپنا اپنا پرچم ہوا میں لہرایا۔ جس سے جلوس میں تنوع اور وقار کے ساتھ ایک قسم کی بین الاقوامی اہمیت بھی پیدا ہو گئی۔

۱۹۴۸ء سے جلوس کا وقت تبدیل کر دیا گیا ہے۔ تاکہ لندن سے لوگ بآسانی پہنچ سکیں۔ اب صبح کی بجائے سہ پہر کو سوا تین بجے جلوس مرتب ہوتا ہے اور ترتیب یہ ہوتی ہے کہ جلوس شیکسپیئر کے مکان واقع ہنلے اسٹریٹ سے روانہ ہوتا ہے۔ سب سے آگے بینڈ باجا بجتا ہے۔ پیچھے سٹریٹفرڈ کا میئر اور مقامی و غیر مقامی اکابر ہوتے ہیں اور ان کے پیچھے پیچھے ہزاروں تماشائی۔ جب یہ جلوس دریائے ایون کے پل پر پہنچتا ہے تو سٹریٹفرڈ کا میئر برطانوی پرچم یعنی یونین جیک

کو ہوا میں بلند کرتا ہے اور اس کے ساتھ ہی ساتھ ہی آناً فاناً اسی نوع کے ملکوں کے رنگ برنگے جھنڈے فضا میں لہرانے لگتے ہیں۔

شیکسپیئر کے پرانے گرامر اسکول کے تمام طلبہ اور ماسٹر اپنے اسکول کے سامنے قطار باندھ کر کھڑے منتظر رہتے ہیں۔ جب جلوس قریب پہنچتا ہے تو یہ لوگ بھی شامل ہو جاتے ہیں۔ اور سب سے آگے چلتے ہیں۔ اب میئر کا تقرر ختم ہو جاتا ہے۔ کیونکہ سٹرٹیفرڈ کی یہ روایت قدیم سے چلی آ رہی ہے کہ شیکسپیئر کے جلوس کی قیادت کا شرف اس کے اسکول کے طلبہ اور سٹاف کو حاصل ہے۔ جلوس آہستہ آہستہ اس گرجے کی طرف بڑھتا ہے جہاں شیکسپیئر دفن ہے۔ وہاں پہنچ کر شیکسپیئر کے مرقد پر پھولوں کے بے شمار ہار چڑھائے جاتے ہیں۔ بہت سے ہار یورپ اور امریکہ سے بھی آتے ہیں۔

ابتدا میں یہ رونق اور گہما گہمی ہفتہ بھر رہتی تھی، لیکن اب اپریل سے ستمبر تک گرمیوں کا پورا موسم گویا اسی فیسٹیول کی نذر کر دیا جاتا ہے۔ میموریل تھیٹر میں ہر رات شیکسپیئر کا کوئی کھیل دکھایا جاتا ہے جس میں چوٹی کے نامور ایکٹر حصہ لیتے ہیں۔ برٹش کونسل کے زیر اہتمام لیکچروں کا انتظام بھی کیا جاتا ہے۔ جہاں انگلستان کی بعض یونیورسٹیوں کے فضلا شیکسپیئر پر لیکچر دیتے ہیں۔ اور اس قیمتی موقع سے فائدہ اٹھانے کے لیے دور دور سے لوگ یہاں آ کر ان لیکچروں میں شامل ہوتے ہیں۔

گرمیوں میں تو سٹرٹیفرڈ میں دن بھر ایک میلہ سا لگا رہتا ہے۔ چاروں طرف سیاح گھومتے پھرتے نظر آتے ہیں۔ لندن سے سٹرٹیفرڈ تک سپیشل ٹرین بھی چلتی ہے

اکثر لوگ، صبح جا کر شام کو واپس آجاتے ہیں۔ بعض لوگ کھیل دیکھنے کے لیے رات وہیں گزارتے ہیں۔ سچ پوچھئے تو سٹرٹیفرڈ کی سیر کا پورا لطف جبھی آتا ہے کہ رات کو میموریل تھیٹر میں شیکسپیئر کا کھیل بھی دیکھا جائے۔ چنانچہ ہم لوگ اسی ارادے سے رات وہاں ٹھہر گئے تھے۔ سٹرٹیفرڈ میں اچھے اچھے ہوٹل موجود ہیں۔ جہاں مناسب رقم میں قیام و طعام کی سہولتیں میسر آسکتی ہیں۔

اُس رات کنگ لیئر دکھایا جا رہا تھا۔ جسے گلن بائم شا نے ڈائرکٹ کیا تھا۔ مشہور تھا کہ بائم شا عنقریب اپنے کام سے سبکدوش ہونے والے ہیں۔ اور یہ کھیل غالباً اُن کی ڈائرکشن کا آخری کارنامہ ہوگا۔ لیئر کا پارٹ چارلس لاٹن نے کیا تھا۔ انگلستان میں ڈرامے کے موجودہ نقاد، جب کنگ لیئر پر بحث کرتے ہیں تو ہمیشہ چارلس لاٹن کے مقابلے میں ورنر کراس کو ترجیح دیتے ہیں۔ اُن کی رائے ہے کہ لیئر کا کردار پیش کرنے میں لاٹن اُس بلندی پر نہیں پہنچتا جہاں ورنر کراس پہنچتا تھا۔

بہرحال فنی محاسن و معائب سے قطع نظر ہم اُس رات اس کھیل سے خوب محظوظ ہوئے۔ رعونت، خون ریزی، غداری، ہوس اور حسن کشی کنگ لیئر کا سارا تانا بانا انہی عناصر خمسہ سے مرکب ہے۔ اور جملہ ایکٹروں نے اِن جذبات کی جیتی جاگتی عکاسی کرنے میں کوئی کوتاہی نہیں کی تھی۔ سٹرٹیفرڈ میموریل تھیٹر میں کام کرنا بہت بڑا اعزاز سمجھا جاتا ہے۔ لندن اور ہالی وڈ کے وہ نامور ایکٹر جنھیں علم حالات میں ہزاروں پونڈ معاوضہ ملتا ہے یہاں روپیہ کمانے کی ہوس میں نہیں آتے۔ بلکہ محض شیکسپیئر کے حضور میں ہدیۂ نیاز پیش کرنے کے لیے حاضر ہوتے ہیں۔ سر مائیکل ریڈگریو اور سر ایلک گنس جیسے بین الاقوامی شہرت کے ایکٹروں کو بھی

رٹر ٹیفرڈ میں پچاس ساٹھ پونڈ ہفتہ وار سے زیادہ تنخواہ نہیں مل سکتی۔ یہ سب کچھ گویا شیکسپیئر کے کمالِ فن کا اوتے اعتراف ہے۔

ہمارے ہاں لاہور میں بھی ایک ڈرامہ نویس دفن ہے جس کا نام آغا حشر تھا اور جسے ہم نے اُس کی زندگی میں "انڈین شیکسپیئر" کا خطاب دیا تھا۔ حشر شیکسپیئر تھا یا نہیں؟ اِس سے بحث نہیں۔ لیکن یہ واقعہ ہے کہ وہ جب تک زندہ رہا، کشمیر سے لے کر مدراس تک پورے برِ عظیم میں اُس کے نام کا ڈنکا بجتا تھا اور ڈرامہ نگاری کے کسی بڑے سے بڑے مدعی کو بھی اُس کے سامنے دم مارنے کی ہمت نہ تھی، وہ اپنی زندگی میں بلا مبالغہ چاندی اور سونے میں تلتا رہا۔ شہرت اُس پر نثار تھی اور کامیابی تو گویا اُس کی خانہ زاد کنیز بن کر رہ گئی تھی۔ جس ایکٹر پر اُس کی نظر پڑ گئی، وہی قبولِ عام کی دولت سے مالا مال ہو گیا۔ اور جس تھیٹر میں اُس کا کھیل دکھایا جاتا اُسی پر سیم و زر کی بارش شروع ہو جاتی۔ جو لفظ اُس کے قلم سے نکل جاتا اُس کو ادب کی ٹکسال میں سند کا رتبہ مل جاتا تھا۔

حشر نے ایک دفعہ ترنگ میں آ کر انجمن حمایت اسلام کے جلسے میں اپنی نظم شکریہ یورپ پڑھ دی تھی تو اقبال کا رنگِ سخن بھی پھیکا پڑ گیا تھا۔ اس نے فارسی آمیز اُردو سے اپنے عنانِ قلم کو موڑ کر جب ٹھیٹ ہندی لکھنے کی طرف توجہ کی، تو بنارس کے پنڈتوں نے اپنے کان پکڑ لئے تھے۔ اس نے ہزاروں صفحے سیاہ کئے۔ لیکن عام انشا پردازوں کی طرح کبھی قلم اور کاغذ ہاتھ میں لے کر فکرِ سخن نہیں کی۔ بلکہ دائیں بائیں دو منشی بٹھا کر ایک ایک نشست میں بلا تکلف سو سو صفحے لکھوا دیتا تھا۔ وہ تقریر و تحریر کا بادشاہ تھا۔ جس کا ایک دنیا میں دُور دُور تک

کوئی حریف نہ تھا۔ جس نے پھبتی کہنے اور فقرہ چست کرنے کو بھی ادبِ لطیف کی ایک صنف بنا دیا تھا۔ جس کی محفل میں بڑے سے بڑے زبان آور کے ہونٹوں پہ بھی مُہرِ سکوت لگ جاتی تھی۔ جسے عروس البلاد لاہور سے بے پناہ محبت تھی، اور جو محض اس محبت کے ہاتھوں مجبور ہو کر کلکتے سے لاہور اُٹھ آیا تھا۔

ہاں یہی تھا وہ یگانۂ روزگار آغا حشر جسے ہم نے ۲۸ اپریل ۱۹۳۵ء کو لاہور کے ایک قبرستان میانی صاحب میں دفن کیا تھا، اُس کی کچی قبر برسوں ہماری بے التفاتی کی شکوہ سنج رہی۔ پھر آہستہ آہستہ اُس قبر کی جگہ ایک گڑھا سا بننا شروع ہوا۔ اور اب تو سنتا ہوں کہ اُس کا نشان بھی مٹ گیا ہے۔

اس پر بھی ہمیں اپنے آپ سے نہیں بلکہ غیروں سے شکایت ہے کہ لوگ ہمارے مشاہیر کا ذکر اچھی طرح کیوں نہیں کرتے؟

ایک ہم ہیں کہ لیا اپنی بھی صورت کو بگاڑ
ایک وہ ہیں جنھیں تصویر بنا آتی ہے

لندن ۱۹۶۱ء

ٹیپو سلطان کا کتب خانہ

۶ مئی ۱۷۹۹ء کو ٹیپو سلطان نے جامِ شہادت نوش کیا۔ اور اسی روز دولت خانۂ خاص اور محلاتِ شاہی پر انگریزی فوج کا قبضہ ہو گیا۔ سرنگا پٹم کی لوٹ میں زر و جواہر کے جو انبار انگریزوں کے ہاتھ لگے، اس کی مثال مرشد آباد کے خزانوں میں بھی نہیں ملتی۔ وجہ یہ تھی کہ پلاسی کے بعد کلایو اور اس کے ساتھیوں کو مرشد آباد سے جو کچھ ملا۔ وہ میر جعفر نے، بطورِ ممنونیت عطا کیا تھا۔ گویا یوں کہنا چاہیئے کہ وہ کلایو کا حق الخدمت تھا۔ لیکن سرنگا پٹم کے سقوط اور سلطنتِ خداداد کی تباہی پر تو انگریزوں نے کھلم کھلا اور دل کھول کر لوٹ مچائی تھی۔ اسی لوٹ میں ٹیپو کا کتب خانہ بھی انگریزوں کے ہاتھ آیا۔

یہ کتب خانہ مختلف منازل و مراحل طے کرتا ہوا ۱۸۳۸ء میں انگلستان پہنچا۔ اور آج کل لندن کی ایک لائبریری کے ایک خاص حصے میں موجود ہے۔ پارسال

مجھے مسلسل چار پانچ ہفتے اس کتب خانے میں بیٹھ کر تحریری کام کرنے کا اتفاق ہوا تھا۔ اکثر کتابیں نظر سے گذریں۔ جن پر ٹیپو کے دستخط موجود تھے۔ اور دل حزیں نے عبرت و بصیرت کے بہت سے سبق حاصل کئے۔

یہ کتب خانہ لندن کیونکر پہنچا۔ اس کی داستان بھی بڑی دلچسپ ہے۔ ۲۶ مئی ۱۸۰۰ء کو میجر جنرل پامپھم نے ہندوستان کے گورنر جنرل، لارڈ ولزلی کی خدمت میں ذیل کی عرضداشت ارسال کی:-

"مائی لارڈ

سرنگاپٹم فتح کرنے والی فوج کے افسروں کی خواہش کے مطابق اس عریضۂ نیاز کے ہمراہ حضور والا کے ملاحظہ کے لیے دو فہرستیں پیش کر رہا ہوں، جن میں ٹیپو سلطان کے کتب خانے کے مخطوطات کی تفصیل درج ہے۔ تاکہ یہ مخطوطات آنریبل کمپنی کے ڈائرکٹروں اور ایشیاٹک سوسائٹی کے حوالے کئے جا سکیں۔

مجھے امید ہے کہ ان فہرستوں کے مطالعہ سے حضور والا یقیناً محظوظ ہوں گے۔ بالخصوص اس خیال سے تو حضور پر نور کی مسرت میں زیادہ اضافہ ہوگا۔ کہ فوج نے کیسی شاندار مہم فتح کر کے اس کتب خانے پر قبضہ کیا۔ اور پھر اپنی عقیدت و وفاشعاری کے اظہار کے لیے وہی فوج اب اس کتب خانے کو اپنے احباب اور حکام بالا کی خدمت میں بطور ہدیۂ نیاز پیش کر رہی ہے۔

منسلکہ فہرستوں کے علاوہ اور بھی بہت سے مجلدات ہیں

فوج کا ارادہ تھا کہ انھیں فروخت کر دیا جائے لیکن کرنل کلوز[1]
اس رائے کے مخالف تھے۔ انھوں نے کہا۔ کہ ساحلی علاقوں میں فارسی
زبان کی تحصیل و ترویج کی سخت ضرورت ہے۔ اس لیے اگر ان مجلدات
کا کچھ حصہ فورٹ سینٹ جارج کے فارسی دفتر میں محفوظ کر دیا جائے
تو یہ امر فارسی زبان کے طلبہ کے لیے بہت مفید ہوگا۔ مجھے موصوف
کی رائے سے کلی اتفاق ہے۔ بلکہ میں تو سمجھتا ہوں کہ اس قسم کا
انتظام بمبئی میں بھی ہو جانا چاہیئے۔ مجھے امید ہے۔ کہ حضور بھی اس
تجویز کو شرفِ پسندیدگی بخشیں گے۔

اب میں اس کام میں حضورِ والا کی ہدایات کا منتظر ہوں۔ تاکہ
اُن پر عمل کیا جائے۔ بالخصوص اس بارے میں حضور کا ارشاد معلوم
کرنے کا متمنی ہوں۔ کہ اس ذخیرۂ کتب میں سے آنریبل کمپنی کے
ڈائرکٹروں کا کتنا حصہ الگ کیا جائے۔ اور اسے یورپ بھیجنے کی کیا
تدابیر اختیار کی جائیں۔"

میجر جنرل پاپہم کی اس عرضداشت کے جواب میں گورنر جنرل ولزلی نے جو ہدایات
صادر کیں وہ یہ تھیں:۔

"..... کمپنی چونکہ ایشیائی زبانوں کی ترقی و ترویج کی دل

---

[1] سر ہیری کلوز نظامِ دکن کے دربار میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے ریزیڈنٹ تھے ۱۸۱۳ء
میں فوت ہوئے۔ انھوں نے ہندوستان سے فارسی کتابوں کا ایک بڑا ذخیرہ جمع کیا تھا
مرتے وقت یہ سارا ذخیرہ وہ کمپنی کو دے گئے تھے۔

سے خواہاں ہے۔ اور اُس کا خیال ہے۔ کہ انگلستان کے علاوہ کمپنی کے اُن ملازموں میں بھی، جو ہندوستان میں کام کر رہے ہیں، ایشیائی زبانوں کی تحصیل کا شوق پیدا ہونا چاہیئے۔ لہذا گورنر جنرل کی رائے ہے کہ آنریبل کمپنی کے ڈائرکٹروں کے حصے کی کتابیں انگلستان بھیجنے کی بجائے فورٹ ولیم کالج کی لائبریری میں جمع کر دی جائیں۔

"گورنر جنرل نے اسی مضمون کا ایک خط آنریبل کمپنی کے صدر کو لندن لکھ دیا ہے کہ ان کتابوں کو فورٹ ولیم کالج میں رکھنے کی اجازت مرحمت فرمائی جائے۔ اس لیے جب تک لندن سے کسی قطعی فیصلے کی اطلاع موصول نہیں ہوتی یہ کتابیں فورٹ ولیم کالج ہی میں رہیں گی۔ ..... باقی رہا فورٹ سینٹ جارج اور بمبئی کا معاملہ چونکہ اس قسم کے احکام صادر کئے جا چکے ہیں، کہ فورٹ سینٹ جارج اور بمبئی کے تمام جونیئر ملازم، آئندہ فورٹ ولیم کالج ہی میں تعلیم حاصل کریں گے، اس لیے ٹیپو سلطان کے کتب خانے کا بقیہ حصہ بھی اسی کالج میں شامل کر دیا جائے۔ فورٹ سینٹ جارج اور بمبئی کو عطا کرنے کی چنداں ضرورت نہیں۔ ان دونوں پریذیڈنسیوں کے ملازم، جن کی خاطر سے یہ کتابیں وہاں بھیجنے کی تجویز عرضداشت میں پیش کی گئی ہے، اب نئے انتظام کے تحت بآسانی فورٹ ولیم کالج میں، ان سے استفادہ کر سکیں گے۔"

گورنر جنرل کی یہ تجویز کہ ٹیپو کا کتب خانہ فورٹ ولیم کالج کی نذر کر دیا جائے۔

کمپنی کے ڈائرکٹروں کو سخت ناگوار گذری۔ اُنہی دنوں خود کمپنی کے ڈائرکٹر لندن میں ایک لائبریری اور ایک عجائب خانہ قائم کر رہے تھے۔ تاکہ ہندوستان سے جس قدر علمی و ادبی نوادر اور مصوری و سنگ تراشی کے گراں بہا نمونے دستیاب ہوں۔ انھیں ایک جگہ جمع کر دیا جائے۔ چنانچہ ڈائرکٹروں نے ۱۸۰۶ء جون کو ایک تہدید آمیز خط گورنر جنرل کو لکھا۔ کہ ٹیپو سلطان کا کتب خانہ اب تک لندن کیوں نہیں بھیجا گیا۔ اس خط کا ایک ٹکڑا ملاحظہ فرمائیے:

"اب ہم آپ کی توجہ ٹیپو سلطان کے کتب خانے کی طرف مبذول کراتے ہیں۔ جو سرنگا پٹم کے سقوط کے وقت ہماری فوج کے قبضے میں آیا تھا۔ اور جس کا یہاں بھیجا جانا اشد ضروری تھا۔ ابتدا سے ہماری یہ رائے ہے کہ اس کتب خانے کے لیے موزوں ترین جگہ کمپنی کی لائبریری ہے۔ آپ نے اب تک باضابطہ اور سرکاری طور پر اس کتب خانے کی کوئی فہرست ہمارے پاس نہیں بھیجی۔ آپ کی اس غفلت کی وجہ سے ہم کتب خانے کے متعلق کوئی واضح اور معین ہدایات جاری نہیں کر سکے۔ ہمیں امید ہے۔ کہ یہ کتب خانہ اچھی حالت میں اور کسی محفوظ جگہ پر ہوگا۔ لہٰذا ہم اس کے متعلق احکام صادر کرتے ہیں۔

ایک پرائیویٹ ذریعہ سے جو فہرست ہمارے پاس پہنچی ہے اُس کے مطابق اِس کتب خانے میں قرآن اور شاہنامے کے بعض نہایت قیمتی اور مجلّا و مطلّا نسخے موجود ہیں۔ اس کے علاوہ ہمیں یہ بھی معلوم ہوا

ہے، کہ بہت سی گراں پایہ تصانیف ایسی ہیں، جو حسنِ کتابت کا نادر مرقع ہونے کے علاوہ مصوّری کے لاجواب نمونوں سے بھی مزیّن ہیں، اور جن کی جلدیں بڑی بیش قیمت ہیں۔

آپ کو ہدایت کی جاتی ہے کہ ایسی تمام کتابیں بڑی احتیاط سے الگ کر دی جائیں۔ ان کے علاوہ نظم و نثر کی دیگر کتب کے، اگر دو دو نسخے موجود ہیں تو اُن میں سے بھی ایک ایک نسخہ علیحدہ کر لیا جائے۔ ہمیں معلوم ہوا ہے۔ کہ ایسی بے شمار کتابیں اس ذخیرے میں موجود ہیں۔

اِس طرح تمام ذخیرے کو بڑی احتیاط سے بکسوں میں بند کر کے فوراً یہاں بھیج دیا جائے سمندر کے سفر میں چونکہ خطرے بہت ہوتے ہیں اس لیے تمام بکسوں کو ایک ہی جہاز میں لادنے کی بجائے دو یا تین مختلف جہازوں میں تقسیم کر کے بھیجئے۔

اِس کے علاوہ کتب خانے کی دو مکمل فہرستیں بھی ارسال کیجئے۔ ایک فارسی اور دوسری انگریزی میں۔ کتب خانہ پہلے دن جس حالت میں سرنگا پٹم سے برآمد ہوا تھا، اُس کی مکمل فہرست درکار ہے دوسری فہرست میں اُن کتابوں کے ناموں کا اندراج ہونا چاہیئے جو ہماری اِس ہدایت کے مطابق یہاں بھیجی جا رہی ہیں۔"

ڈائرکٹروں کی اس ہدایت کے باوجود پورا کتب خانہ پھر بھی انگلستان نہ پہنچ سکا۔ البتہ پہلی قسط لارڈ ولزلی نے جولائی ۱۸۰۰ء میں لندن بھیجی۔ اس قسط

ہیں ۴۱۰ کتابیں تھیں۔ ۱۰ جولائی ۱۸۰۶ء کی فٹے بک میں ان کتابوں کی وصولی کا اندراج موجود ہے۔

۱۸۳۳ء میں جب لارڈ میکالے نے ہندوستانیوں کی تعلیم کے بارے میں اپنا مشہور فیصلہ صادر کیا۔ جس کی رو سے آئندہ اس برعظیم میں انگریزی کو ذریعۂ تعلیم قرار دیا گیا تھا، تو کلکتہ کا فورٹ ولیم کالج بند کر دیا گیا۔ اور ٹیپو سلطان کا پورا کتب خانہ لندن بھیج دیا گیا۔

اس وقت جو کتب خانہ ٹیپو سلطان کے نام سے منسوب ہے۔ اس میں کتابوں کی تعداد دو ہزار کے لگ بھگ ہے۔ نہیں کہا جا سکتا۔ کہ یہ اصل کتب خانے کا ایک جزو ہے یا مکمل کتب خانہ۔ قیاس ہے کہ سرنگا پٹم میں کتابوں کی تعداد یقیناً زیادہ ہو گی۔ لوٹ مار اور افراتفری میں بہت سی کتابیں ضائع ہو گئی ہوں گی۔

مضامین کے اعتبار سے ان کتابوں کو بیس عنوانوں کے تحت تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً تاریخ و سوانح، شعر و سخن، علم ہیئت۔ علم الاسنہ۔ دینیات۔ ادعیہ۔ احادیث۔ تفاسیر، قصص و حکایات۔ تصوف۔ ریاضی، طبیعیات، لغت۔ قانون۔ فلسفہ۔ کیمیا۔ اخلاقیات۔ مصوری و خطاطی۔ فن حرب۔

بیشتر کتابیں عربی اور فارسی کی ہیں۔ کچھ کتابیں ترکی زبان کی ہیں۔ ہندی اور دکھنی نظم و نثر کے بھی بعض مجلدات موجود ہیں۔ جی تو چاہتا ہے کہ پورے کتب خانے کی فہرست درج کر دوں۔ کہ یہ نوادر اس سانحۂ عظیم کی یادگار ہیں جس کے متعلق اقبال نے لکھا تھا کہ ۱۷۹۹ء کا سال دنیائے اسلام کے اہم ترین

حوادث میں شمار کیا جانا چاہیئے کیونکہ سلطانِ شہیدؒ کے رخصت ہوتے ہی مسلمانوں کے سیاسی عروج کی تمام امیدیں بھی ہندوستان سے رخصت ہو گئیں۔

سرِ دست صرف اُن کتابوں کے نام درج کرتا ہوں جن کا تعلق تاریخ و سوانح سے ہے۔

تاریخ روضۃ الصفا، خلاصۃ الاخبار۔ حبیب السیر۔ تاریخ طبری۔ تاریخ گزیدہ۔ منتخب الاخبار۔ منتخب التاریخ، تاریخ مختصر۔ روضۃ الطاہرین۔ تاریخ الفی۔ طبقاتِ ناصری۔ تاریخ احمد اللہ۔ تاریخ موسوی، داراب نامہ، نظام التواریخ، مجمع النساب۔ ترجمہ فتوحِ عربی۔ تاریخ فتوحِ شام۔ ظفر نامہ، تاریخ صاحب قرانی۔ تاریخ تیموریہ۔ تاریخ شاہ رُخ۔ کتابِ تیموریہ، تذکرۃ الشعرا دولت شاہی، روضۃ الجنات، تاریخ ہشت بہشت، تاریخ عالم آرائی عباس۔ عبداللہ نامہ۔ طبقاتِ اکبری۔ تاریخ فرشتہ۔ تاریخ بہمنی۔ تاریخ ابراہیمی۔ تاریخ خانی خاں، منتخب اللباب۔ تاریخ شیر شاہی۔ تاریخ اکبری۔ مآثر رحیمی۔ اقبال نامہ جہانگیری۔ شاہ جہاں نامہ۔ عالمگیر نامہ۔ مآثرِ عالمگیری۔ تاریخ بہادر شاہ۔ تاریخ فرخ سیر۔ تاریخ پادشاہانِ ہند۔ لطائف الاخبار، تاریخ خان جہاں لودھی۔ مخزنِ افغانی۔ تاریخ ملکِ شام۔ مآثر الامراء التیموریہ۔ مجموعہ میرزا مہدی — کیفیتِ راجہائے میسور۔ تقویم التواریخ رومی۔ ہفت اقلیم۔ مجموع النفائس۔ شمشیر خانی۔ تاریخ الانبیا۔ مدینۃ الانبیاء۔ روضۃ الاحباب، معارج النبوۃ۔ مدارج النبوۃ۔ جذب القلوب۔ اخبار الاخیار۔ مطلع الانوار۔ روضۃ الشہدا وہ مجلس۔ آثارِ احمدی۔ سیرِ عفیفی۔ ثمر الفوائد۔ اخبارِ حسینیہ۔ قصۂ شاہ مردانِ علی۔

مجالس المومنین۔ مطالع الانوار۔ کرامات الانبیاء۔ ترجمہ مولود۔ سفینۃ الاولیاء۔
منتخب الحسنات۔ لطائف الطوائف۔ درّ المجالس۔ مقالات امیر خسرو۔ تاریخ
دوازدہ امام۔ لطائف الاخیار۔ مناقب غوثیہ۔ نسائم غوثیہ۔ تحفۃ القادری۔
خلاصۃ المفاخر۔ نسب نامہ غوثیہ۔ مناقب مولوی روم۔ صفوۃ الصفا۔ نکات بیدل۔
مناقب العارفین۔ رشحات۔ مقامات خواجہ بہاء الدین۔ انیس السالکین و فصل الخطاب۔
نزہت الارواح و شرح آن۔ مقامات شیخ احمد۔ مرآت الاسرار۔ روضۃ الریاحین
و مجمع الاولیا۔ تذکرۃ الاولیاء و سیر الاولیا۔ نفحات الانس۔ گلزار ابرار۔ تاریخ
حسینی۔ ترجمہ طبقات صوفیہ۔ ملفوظات شیخ احمد مغربی۔ رسالہ عبداللہ انصاری۔
نوادر سفارد مقتول نامہ۔ خلاصۃ المناقب۔ روضۃ الابرار۔ سوانح سبزواری۔
روضۃ الریاحین۔ مراۃ الجنان۔ انباء الجنان۔ کتاب عرائس۔ کتاب سیر و شمائل۔
مولود النبی۔ عیون الآثار۔ شرح المناقب۔ بہجت المحافل۔

کتابوں کے علاوہ سلطان شہید کے وہ تمام خطوط و مراسلات بھی متعدد جلدوں
میں بند ہیں۔ جو اس نے وقتاً فوقتاً نپولین۔ سلطان روم۔ شاہ ایران۔ زمان شاہ
والئ افغانستان، شہنشاہ دہلی۔ دولت راؤ سندھیا۔ پیشوا اور نظام دکن کو بھیجے
تھے۔ ان تمام مراسلات میں صرف ایک جذبہ کارفرما ہے۔ ٹیپو بار بار ان لوگوں سے
کہتا ہے کہ آؤ ہم سب متحد ہو کر انگریزوں کو ہندوستان سے نکالنے کی کوشش
کریں۔ اگر ہم آپس ہی میں لڑتے جھگڑتے رہے تو انگریز ہم میں سے ایک ایک کو
ختم کر کے پورے ملک پر قابض ہو جائیں گے۔

اس کتب خانے میں ایک بڑی دلچسپ چیز ٹیپو کا خواب نامہ ہے معلوم ہوتا

ہے ٹیپو کو خوابوں پر بڑا اعتماد تھا۔ اور وہ ہر روز صبح بیدار ہونے کے بعد رات کا خواب بڑی احتیاط سے ایک رجسٹر میں درج کر لیا کرتا تھا۔ یہ رجسٹر حد درجہ خفیہ تھا، جسے سلطان اپنی خاص الماری میں مقفل کر کے رکھتا تھا۔ صرف ایک خادم خاص حبیب اللہ کو جو سلطان کی بارگاہِ معلّٰی میں ملازم تھا، اس کا علم تھا۔ چنانچہ اسی حبیب اللہ کی نشان دہی پر کرنل کرک پیٹرک نے کتابوں کی الماریوں میں سے یہ رجسٹر برآمد کیا تھا۔

سلطان جس طرح دن بھر استخلاصِ وطن، اعلائے کلمۃ اللہ اور استیصالِ فرنگ کی تجویزیں سوچنے میں منہمک رہتا تھا۔ اسی طرح رات کو بھی اس کا دماغ اس قسم کے خواب دیکھتا تھا۔ چنانچہ ۱۹ مئی ۱۷۹۶ء کا خواب سلطان یوں بیان کرتا ہے :-

پنجشنبہ کی رات کو صبح صادق کے قریب باری تعالےٰ کے اس بندۂ ناچیز نے خواب دیکھا کہ قومِ فرانسیس کا ایک شخص میرے روبرو پیش کیا گیا ہے۔ جو اپنی ظاہری وضع قطع سے ایک افسر معلوم ہوتا ہے۔ میں اس وقت کام میں مصروف تھا۔ یہ شخص بڑے ادب سے کھڑا رہا۔ پھر میں نے اسے اپنے قریب بلایا۔ تو وہ مسند کے پاس آکر رک گیا۔ میں نے جب آنکھ اٹھا کر دیکھا تو ذرا کھڑے ہو کر اس کو اپنے سینے سے لگا لیا۔ پھر میں نے اس سے بیٹھ جانے کو کہا۔ اور اس کی طبیعت کا حال پوچھا۔ تو اس نے جواب دیا کہ میں دس ہزار جوان سرکارِ خداداد کی خدمت کے لیے لایا ہوں جو بڑے

بہادر، جری اور دلیر ہیں۔ یہ لشکر سمندر کے راستے سے وارد ہوا ہے جسے بندرگاہ پر چھوڑ کر میں خود خدمتِ سلطانی میں حاضر ہوا ہوں۔

فرانسیسی جوان کا یہ پیغام سُن کر میں نے اُسے شاباش اور مرحبا کہا اور جواب دیا کہ خدا کے فضل سے جنگ کی تمام تیاریاں مکمل ہو چکی ہیں۔ اور جمیع اہلِ اسلام عنقریب جہاد کا اعلان کرنے والے ہیں۔ عین اُس وقت سپیدۂ سحر نمودار ہوا۔ اور میری آنکھ کھل گئی۔"

ایک اور خواب کی روئداد جو سلطان نے اگست ۱۷۹۱ء میں دیکھا تھا۔ یوں درج کی گئی ہے:۔

"معلوم ہوتا تھا کہ ایک گھنے جنگل میں فرنگیوں سے سخت جنگ ہو رہی ہے۔ پھر دشمن کو شکست ہوئی۔ تو وہ بُری طرح بھاگا۔ اور سرکارِ احمدی کی فوجِ ظفر موج کو کامیابی عطا ہوئی۔ ہے دشمن کا سپہ سالار اپنی شکست خوردہ فوج کے کچھ آدمیوں کو لے کر ایک مکان میں گھس گیا اور اندر سے دروازہ بند کر لیا۔ میں نے اپنے مشیروں سے پوچھا کہ اب کیا کرنا چاہیئے، تو انھوں نے جواب دیا کہ مکان چونکہ نہایت خوب صورت ہے اس لیے آگ لگانے کی بجائے دروازہ توڑ کر اندر داخل ہونا چاہیئے۔ لیکن میں نے یہ بات نہ مانی اور کہا کہ مکان تو محض چونے گارے اور اینٹ

کا بنا ہوا ہے۔ لہذا دروازے کو آگ لگا دی جائے۔ اور تمام فرنگیوں کو قتل کر دینا چاہیئے۔

عین اُسی وقت صبح ہو گئی۔ اور میں جاگ اُٹھا۔ بفضلِ ایزدی یونہی ہو گا۔"

ایک خواب میں جو سلطان اُس وقت دیکھتا ہے، جب اُسے ۱۷۸۶ء میں بیک وقت مرہٹوں اور نظام سے مقابلہ درپیش تھا۔ اُسے روزِ محشر کا نقشہ نظر آتا ہے۔ جہاں چاروں طرف نفسی نفسی کی حالت طاری ہے۔ اِس عالمِ اضطراب والتہاب میں یکایک ایک نہایت خوب صورت وجیہہ اور روشن آنکھوں والے بزرگ آگے بڑھ کر سلطان کا ہاتھ تھام لیتے ہیں اور پوچھتے ہیں "جانتے ہو میں کون ہوں"۔ سلطان لاعلمی کا اظہار کرتا ہے تو وہ بزرگ کہتے ہیں "میں علی (کرم اللہ وجہہ) ہوں۔ حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ میں تمہارے بغیر جنت میں قدم نہیں رکھوں گا۔ میں تمہارا انتظار کروں گا۔ اور تمہیں ساتھ لے کر جنت میں جاؤں گا۔"

خواب بیان کر کے سلطان لکھتا ہے۔ کہ "جب میں جاگا۔ تو خوشی سے میرا تمام جسم کانپ رہا تھا۔ خداوند تعالیٰ قادرِ مطلق ہے۔ اور رسولِ پاک شافعِ روزِ جزا ہیں۔"

ہر کتاب کے سرورق کے اندر پہلے صفحے کے عین وسط میں پنج تن پاک اور چاروں کونوں پر خلفائے راشدین کے نام درج ہیں صفحے کی پیشانی پر سرکارِ خداداد اور نیچے اللہ کافی لکھا ہوا ہے۔

اقبالؔ نے اپنے قیامِ انگلستان کے زمانے میں کہا تھا۔

حکومت کا تو کیا رونا کہ وہ اک عارضی شے تھی
نہیں دُنیا کے آئینِ مسلّم سے کوئی چارا
مگر وہ علم کے موتی، کتابیں اپنے آبا کی
جو دیکھیں اُن کو یورپ میں تو دل ہوتا ہے سیپارا

ٹیپو کے کتب خانے کی سیر کرتے وقت یہ شعر بار بار میری زبان پر آتے رہے۔

لندن ۱۹۶۰ء

اقبال کے اُستاد

سر ٹامس آرنلڈ

سر عبدالقادر نے بانگِ درا کے دیباچے میں لکھا ہے کہ اقبال نے اپنے قیامِ انگلستان کے زمانے میں شاعری ترک کر دینے کا عزمِ مصمم کر لیا تھا۔ لیکن شیخ عبدالقادر اُن کے اِس ارادے کے خلاف تھے۔ آخر فیصلہ اس بات پر ٹھہرا کہ یہ معاملہ ٹامس آرنلڈ کے سامنے پیش کیا جائے۔ اگر وہ ترکِ شعر کا مشورہ دیں تو اقبال کو یقیناً شاعری چھوڑ دینی چاہیئے اور اگر وہ شاعری جاری رکھنے کی حمایت کریں تو اقبال کو ہرگز شاعری ترک نہیں کرنا چاہیئے۔ آگے چل کر شیخ صاحب نے لکھا ہے کہ :-

"میں سمجھتا ہوں کہ علمی دنیا کی خوش قسمتی تھی کہ آرنلڈ صاحب نے مجھ سے اتفاقِ رائے کیا۔ اور فیصلہ یہی ہوا کہ اقبال کے لیے

شاعری کو چھوڑنا جائز نہیں۔ اور جو وقت وہ اِس شغل کی نذر کرتے ہیں وہ اُن کے لیے بھی مفید ہے۔ اور اُن کے ملک و قوم کے لیے بھی مفید ہے۔"

تنہا اس واقعہ کو پیشِ نظر رکھ کر کہا جا سکتا ہے کہ آرنلڈ کا ہم پر یہ اِتنا بڑا احسان ہے کہ اس بار سے ہماری گردن سیدھی نہیں ہو سکتی۔ اگر خدانخواستہ آرنلڈ اقبال کو ترکِ شعر کا مشورہ دیتے، تو آج اقبال کے نام سے بھی لوگ واقف نہ ہوتے۔

ٹامس آرنلڈ ۱۹ اپریل ۱۸۶۴ء کو ڈیون پورٹ میں پیدا ہوئے جو لندن سے تین سو میل کے فاصلے پر ایک بے حد خوشگوار مقام ہے۔ ڈیون کا علاقہ قدرتی مناظر کی فراوانی اور ساحلِ سمندر کی دلآویزی کے اعتبار سے جنوب مغربی انگلستان کے بہترین حصوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ اِس خطے کے سبزہ زار، گل و گلزار اور آبِ رواں کی خوب صورتی نے آرنلڈ کے دل میں ایسا جذبہ پیدا کر دیا تھا جس نے اُنھیں تمام عمر قدرتی مناظر کا جویا اور دلدادہ بنائے رکھا۔ غالباً انہی تاثرات کا نتیجہ تھا کہ جب وہ بعد میں نقاشی اور مصوری کی جانب متوجہ ہوئے تو اس کے بہت بڑے نقاد ثابت ہوئے۔

آرنلڈ کی ابتدائی تعلیم اپنے قصبے کے سکول میں ہوئی۔ چند برس بعد جب اُن کا کنبہ لندن چلا آیا تو وہ سٹی آف لندن سکول میں داخل ہو گئے۔ مشرقی زبانوں کی تحصیل کا شوق انھیں اِسی سکول میں ہوا۔ اُس زمانے میں اُن کے ہم جماعت طلبہ میں دو لڑکے ایسے تھے جنھوں نے بعد میں آرنلڈ کی طرح

السنۂ شرقیہ میں بڑا نام پیدا کیا۔ یعنی پروفیسر کانوے اور سر اسرائیل گولانس[1]۔

۱۸۸۳ء میں آرنلڈ کیمبرج پہنچے۔ اور ماڈلن کالج میں داخل ہو گئے۔ یہاں انھیں بعض ایسے اساتذہ سے استفادہ کرنے کا موقع ملا جو اسلامی علوم میں فضیلت کا مرتبہ رکھتے تھے۔ ان میں دو نام خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں، یعنی پروفیسر کاول اور پروفیسر رابرٹسن انہی اکابر کی صحبت میں آرنلڈ نے عربی اور فارسی میں مہارت پیدا کی۔ اسی زمانے میں انھوں نے اسلام پر ایک تحقیقی مقالہ لکھ کر مضمون نگاری کے انعامی مقابلے میں شرکت کی۔ آرنلڈ کو انعام تو نہ مل سکا لیکن ان کا یہ مقابلہ ان کی آئندہ علمی سرگرمیوں کا گویا سنگِ بنیاد ثابت ہوا۔ اور اسلام سے جو شغف اس مقالہ کی تیاری کے سلسلہ میں پیدا ہوا تھا۔ وہ روز بروز بڑھتا گیا یہاں تک کہ یہی شغف آخر کار ان کی شخصیت کا سب سے امتیازی وصف قرار پایا۔

آرنلڈ میں زبان دانی کا حیرت انگیز ملکہ تھا، اور جس آسانی سے وہ مختلف زبانیں سیکھ لیتے تھے۔ اس سے خود ان کے معاصرین کو تعجب ہوتا تھا۔ چنانچہ کیمبرج ہی میں انھوں نے عربی۔ فارسی کے علاوہ سنسکرت۔ فرنچ۔ جرمن اور اطالوی میں بھی یکساں مہارت بہم پہنچا لی تھی۔ اس کے علاوہ ولندیزی، ہسپانوی پرتگالی اور روسی زبانوں میں بھی وہ نوشت و خواند کا کام کر سکتے تھے۔

ہندوستان میں علی گڈھ کالج قائم ہو چکا تھا۔ اور سر سید اپنی تعلیمی سرگرمیوں

---

[1] عجیب اتفاق ہے کہ سر اسرائیل گولانس کا انتقال ٹامس آرنلڈ کی وفات کے دو ہفتے بعد ۲۴ جون ۱۹۳۰ء کو ہوا۔

کے لیے ایسے انگریز اساتذہ کو ترجیح دیتے تھے جو اسلامی علوم سے شغف اور مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ کی تحریک سے ہمدردی رکھتے ہوں۔ چنانچہ ان کے ایما پر کیمبرج کے مشہور فاضل سر والٹر بیلے نے آرنلڈ کا نام تجویز کیا اور وہ ۱۸۸۸ء میں ایم اے او کالج علی گڑھ کے سٹاف میں شامل ہو گئے۔

آرنلڈ علی گڑھ میں دس سال رہے اور یہ عرصہ ان کی زندگی کا ایسا یادگار حصہ ہے جس کی چھاپ ان پر آخر وقت تک لگی رہی۔ یہیں انھیں مسلمانوں کے عروج و زوال کا مرقع قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ یہیں ان کے ذاتی مراسم ان اکابر سے قائم ہوئے جنھوں نے انیسویں صدی میں مسلمانوں کی ادبی، سیاسی اور معاشرتی زندگی پر ایسے غیر فانی نقوش چھوڑے تھے کہ ان کی تابانی اب تک برقرار ہے محسن الملک۔ وقار الملک۔ سید محمود۔ نذیر احمد۔ حالی۔ شبلی۔ ذکاء اللہ، آرنلڈ کے حلقۂ احباب میں شامل تھے۔ شبلی تو کالج میں پڑھاتے بھی تھے۔ اس لیے آرنلڈ کو ان سے خاص ربط تھا، مولانا نے آرنلڈ سے فرنچ سیکھی اور یہ فرنچ ان کے علمی کاموں میں بڑی مفید ثابت ہوئی۔

مولانا شبلی نے اپنی کتابوں میں کئی جگہ ٹامس آرنلڈ کا ذکر کیا ہے۔ شعر العجم کی جلد اول کے دیباچے میں سبب تصنیف بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"..... میں اس کمی کو مدت سے محسوس کر رہا تھا، اور اکثر اس ادھیڑ بن میں رہتا تھا، مئی ۱۸۹۴ء میں میرے معزز دوست اور استاد سر آرنلڈ نے مجھ کو اطلاع دی کہ جرمن کے ایک پروفیسر جیمس ڈارمسٹیٹر نے اسی موضوع پر فرنچ میں ایک کتاب لکھی ہے

میں اس زمانے میں فرنچ سیکھ رہا تھا۔ بڑے شوق سے کتاب منگوائی، لیکن وہ ۸۸ صفحوں کا ایک رسالہ تھا جس میں شعرا کے نہایت معمولی حالات تھے۔ ایک مدت کے بعد اس مصنف کی ایک اور ضخیم کتاب شائع ہوئی۔ جو تحقیق اور تدقیق کے لحاظ سے نہایت حیرت انگیز تھی۔ لیکن وہ زبان کی تاریخ ہے۔"

مولانا شبلی نے ۱۸۹۲ء میں ترکی، مصر، شام وغیرہ کا سفر کیا تھا، جس جہاز میں مولانا سوار تھے۔ اس جہاز میں آرنلڈ بھی انگلستان جا رہے تھے۔ چنانچہ بمبئی سے پورٹ سعید تک آرنلڈ اور مولانا ہم سفر رہے۔ پورٹ سعید سے مولانا استنبول تشریف لے گئے۔ اور آرنلڈ انگلستان آ گئے۔ مولانا نے دو سال بعد سفر نامۂ روم و مصر و شام کے نام سے اس سیاحت کی بڑی دلچسپ روئداد قلم بند کی تھی جس میں بعض جگہ آرنلڈ کا تذکرہ ملتا ہے۔ مثلاً دیباچے میں مولانا لکھتے ہیں۔

"..... اسی اثنا میں معلوم ہوا کہ مسٹر آرنلڈ جو مدرسۃ العلوم کے پروفیسر فلاسفی اور میرے استاد ہیں (میں نے ان سے فرنچ زبان سیکھی ہے) آج کل میں ولایت جانے والے ہیں۔ دفعتہً خیال آیا کہ مصر و روم کا سفر، آب و ہوا کی تبدیلی، مسٹر آرنلڈ کا ساتھ، اتفاق سے یہ سامان جمع ہو گئے ہیں۔ اس موقع کو غنیمت سمجھنا چاہیے۔"

سمندر کا سفر مولانا کے لیے بالکل نئی چیز تھی۔ چنانچہ وہ جہاز کی مختصر سی دنیا کے بعض پہلوؤں سے محظوظ بھی ہوئے۔ اور کسی قدر متفکر بھی معلوم ہوتے ہیں لکھتے ہیں۔

"..... جہاز پر مسٹر آرنلڈ وہ آرنلڈ نہیں رہے تھے۔ جو علی گڑھ میں تھے نہ وہ متانت تھی نہ وہ کم آمیزی اکثر ہنسی اور مذاق کرتے۔ بچوں سے کھیلتے۔ اور جہاز کی چھت پر اچھلتے کودتے چلتے۔"

پھر مولانا فرماتے ہیں:۔

"چونکہ عام طور پر یہ مشہور ہے کہ جہاز پر جانور ذبح نہیں کئے جاتے۔ اور مولوی سمیع اللہ خاں صاحب نے اپنے سفرنامہ میں تجربے سے اس کی تصدیق بھی کی ہے۔ میں نے دو تین روز تک پرند کا گوشت کھانے سے پرہیز کیا۔ مسٹر آرنلڈ نے مجھ سے اس کا سبب دریافت کیا۔ میں نے کہا کہ ہمارے مذہب میں منخنقہ حرام ہے۔ بولے کہ اس جہاز پر پرندے اور جانور ذبح کئے جاتے ہیں۔ گردن مروڑ کر مارے نہیں جاتے۔ چونکہ شرعاً ان کی تنہا شہادت کافی نہ تھی میں خود گیا۔ اور اس کی تصدیق کی۔ ذبح کرنے والا عیسائی تھا۔ جو ذبح کرتے وقت کچھ پڑھتا نہ تھا۔ صرف گردن پر چھری پھیر دیتا تھا۔ اگرچہ حنفیوں کے ہاں یہ ذبیحہ حلال نہیں لیکن اس مسئلے میں چند دنوں کے لیے میں شافعی بن گیا تھا۔ جن کے ہاں ہر طرح کا ذبیحہ جائز ہے۔"

ایک اور دلچسپ واقعہ بیان کیا ہے:۔

"۱۰ مئی کی صبح کو میں سوتے سے اٹھا تو ایک ہم سفر نے کہا

کہ جہاز کا انجن ٹوٹ گیا۔ میں نے دیکھا تو واقعی کپتان اور جہاز کے ملازم گھبرائے پھر رہے تھے۔ اور اس کی درستی کی تدبیریں کر رہے تھے۔ انجن بالکل بے کار ہو گیا تھا اور جہاز نہایت آہستہ آہستہ ہوا کے سہارے چل رہا تھا۔ میں سخت گھبرایا اور نہایت ناگوار خیالات دل میں آنے لگے۔ اس اضطراب میں اور کیا کر سکتا تھا۔ دوڑتا ہوا مسٹر آرنلڈ کے پاس گیا۔ وہ اس وقت نہایت اطمینان کے ساتھ کتاب کا مطالعہ کر رہے تھے۔ میں نے ان سے کہا کہ آپ کو کچھ خبر بھی ہے؟ بولے کہ ہاں انجن ٹوٹ گیا ہے۔ میں نے کہا کہ آپ کو کچھ اضطراب نہیں؟ بھلا یہ کتاب دیکھنے کا کیا موقع ہے؟ فرمایا کہ جہاز کو اگر برباد ہی ہونا ہے تو یہ تھوڑا سا وقت اور بھی قدر کے قابل ہے۔ اور ایسے قابلِ قدر وقت کو رائگاں کرنا بالکل بے عقلی ہے۔ ان کے استقلال اور جرأت سے مجھ کو اطمینان ہوا۔ آٹھ گھنٹے کے بعد انجن درست ہوا۔ اور بدستور چلنے لگا۔"

ٹامس آرنلڈ جب تک علی گڑھ میں رہے۔ انھوں نے اپنے طرزِ عمل سے کسی قسم کی اجنبیت یا بیگانگی کا اظہار نہیں ہونے دیا۔ دو چار سال کے قیام کے بعد انھوں نے انگریزی کپڑے پہننا بھی ترک کر دیئے تھے۔ اور بالکل مسلمان شرفا کا سا لباس اختیار کر لیا تھا۔ سر پر کبھی عمامہ باندھتے۔ کبھی ترکی ٹوپی پہنتے تھے۔ بدن پر انگرکھا اور شیروانی پہننے لگے تھے۔ طلبہ میں حبِّ قومی کا جذبہ بیدار کرنے کے لیے انھوں نے علی گڑھ کالج کی مشہور انجمن الفرض قائم کی۔ جس کے ہر رکن

کا فرض تھا کہ اپنے حلقۂ عمل میں تھوڑی بہت قومی خدمت بجا لائے۔

علی گڑھ ہی میں آرنلڈ نے کالج کے پرنسپل تھیوڈور بیک کی بھانجی سے شادی کر لی۔ جو عمر بھر اُن کے لیے مسرت و راحت کا سرچشمہ ثابت ہوئی۔ علی گڑھ ہی میں آرنلڈ نے وہ معرکۃ الآرا کتاب لکھی جس نے فوراً انھیں عالمِ اسلام میں عزت و محبوبیت کا بلند منصب عطا کیا۔ اس کتاب کا نام پریچنگ آف اسلام ہے۔ جس کی تیاری میں آرنلڈ نے عربی اور فارسی کے علاوہ یورپ کی ہر زبان سے مدد حاصل کیا ہے۔ آرنلڈ نے ناقابلِ تردید تاریخی شواہد سے ثابت کر دیا ہے کہ اسلام قطعاً بزورِ شمشیر نہیں پھیلا۔ لطف یہ ہے کہ اُس زمانے میں یورپ کے پادریوں اور مورخوں نے اسلام کے بزورِ شمشیر پھیلائے جانے کا الزام اس شدت اور تواتر سے عائد کیا تھا کہ خود مسلمان محسوس کرنے لگے تھے کہ یہ الزام درست ہے۔ ٹامس آرنلڈ پہلا شخص ہے جس نے دلائل و براہین کے ایک لشکر سے جھوٹ کے اس قلعہ پر حملہ کیا اور اُسے مسمار کر کے رکھ دیا۔ جزیرۃ العرب سے لے کر جاوا اور مراکش سے لے کر چین تک ایک ایک ملک میں اسلام کی نشر و اشاعت کے اسباب پر بحث کی گئی ہے۔

پریچنگ آف اسلام کے بارہ ابواب ہیں جن کے عنوان حسب ذیل ہیں:-

۱- محمد صلی اللہ علیہ وسلم بحیثیت ایک مبلغ کے

۲- مغربی افریقہ کی مسیحی اقوام میں اسلام کی اشاعت

۳- افریقہ کی مسیحی قوموں میں اسلام کی اشاعت۔

۴- سپین میں اسلام کی اشاعت۔

۵- ترکوں کے عہد میں یورپ کی مسیحی اقوام میں اسلام کی اشاعت

۶- ایران اور وسطِ ایشیا میں اسلام کی اشاعت۔

۷- مغلوں اور تاتاریوں میں اسلام کی اشاعت

۸- ہندوستان میں اسلام کی اشاعت۔

۹- چین میں اسلام کی اشاعت۔

۱۰- افریقہ میں اسلام کی اشاعت۔

۱۱- ملایا میں اسلام کی اشاعت

۱۲- خاتمہ

پریچنگ آف اسلام کا پہلا ایڈیشن ۱۸۹۶ء میں شائع ہوا۔ جو فوراً ختم ہو گیا۔ لیکن دوسرا ایڈیشن بعض ناگزیر مجبوریوں کی وجہ سے ۱۹۱۳ء سے قبل شائع نہ ہو سکا۔

۱۸۹۸ء میں ٹامس آرنلڈ انڈین ایجوکیشن سروس میں ملازم ہو کر لاہور کے گورنمنٹ کالج میں تشریف لے آئے۔ اور یہاں جس نژادِ نو کی تعلیم و تربیت کا کام اُن کے سپرد ہوا۔ اس میں دو نام قابلِ ذکر ہیں۔ علامہ اقبال اور سر فضلِ حسین۔ فضل حسین تو سال بھر کے بعد قانون کی تعلیم کے لیے انگلستان چلے گئے۔ اور اقبال مزید دو سال تک بحیثیت ایک شاگرد کے آرنلڈ سے فلسفہ کا درس لیتے رہے۔ پھر جب اقبال فارغ التحصیل ہو کر اُسی کالج میں ملازم ہو گئے تو یہ تعلق آہستہ آہستہ بے تکلف دوستی اور غم خواری کی صورت اختیار کر گیا۔

لاہور میں ٹامس آرنلڈ کے جن لوگوں سے دوستانہ مراسم تھے۔ اُن میں

دو نام اور بھی ہیں۔ ڈاکٹر پی۔ ایس۔ ایکین جو اُس وقت گورنمنٹ کالج میں پڑھاتے تھے اور بعد میں کرسٹی کالج۔ آکسفرڈ میں چلے آئے تھے۔ دوسرا نام ڈاکٹر جے۔ ووگل کا ہے۔ جو اُس وقت محکمۂ آثارِ قدیمہ میں ملازم تھے اور پھر لیڈن یونیورسٹی میں سنسکرت کے پروفیسر مقرر ہو گئے تھے۔ لاہور ہی میں آرنلڈ نے عربی کے ایک مشہور رسالہ المعتزلہ کو نئے سرے سے ایڈٹ کر کے شائع کیا۔ پروفیسر گولڈ ثیر نے، جو اُس وقت یوڈاپسٹ یونیورسٹی میں اسلامیات کے معلم اور بین الاقوامی شہرت کے مالک تھے آرنلڈ کی اِس علمی خدمت کی بڑی تعریف کی۔ اُسی زمانے میں امیر عبدالرحمٰن خاں والیٔ کابل کی تجویز سے ہندوستان میں ایک ادارہ قائم ہونے لگا تھا جس کے ذمے یہ کام تھا کہ انگریزی کتابوں کا فارسی میں ترجمہ کرے۔ امیر موصوف کی خواہش تھی کہ آرنلڈ اس ادارے کے نگران بن جائیں۔ لیکن اب آرنلڈ کو حُبِّ وطن ستا رہی تھی۔ اور وہ انگلستان جانا چاہتے تھے۔ چنانچہ ۱۹۰۴ء میں ہندوستان کو خیرباد کہہ کر انگلستان آ گئے اور یہاں پہنچتے ہی اُنھیں انڈیا آفس لائبریری میں اسسٹنٹ لائبریرین کا عہدہ مل گیا۔ اقبال کی نظم نالۂ فراق جس کا پہلا شعر ہے۔

جا بسا مغرب میں آخر اے مکاں تیرا مکیں

آہ! مشرق کی پسند آئی نہ اس کو سرزمیں

اُسی دور کی یادگار ہے۔

انڈیا آفس لائبریری کی ملازمت کے زمانے میں آرنلڈ کو جن لوگوں کے ساتھ کام کرنے کا اتفاق ہوا۔ اُن میں دو نام قابلِ ذکر ہیں، ڈاکٹر ایف۔ ڈبلیو ٹامس

جو سینئر لائبریرین تھے، اور سر ولیم فاسٹر جو انڈیا آفس میں ریکارڈ کے مہتمم تھے یہ دونوں علم دوست اور ادب نواز شخص تھے۔ اور اُن کی مدد سے آرنلڈ نے لائبریری میں عربی اور فارسی کی جتنی کتابوں کا اضافہ کیا پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔

دو سال بعد آرنلڈ کو یونیورسٹی کالج لندن میں عربی کی مدرسی مل گئی لیکن کالج کے درسی کام کے ساتھ ہی ساتھ وہ اسسٹنٹ لائبریرین کے فرائض بھی ادا کرتے رہے۔ اِن مصروفیتوں کی وجہ سے یہ نقصان یقیناً ہوا کہ وہ وقت جو انھیں تصنیف و تالیف میں صرف کرنا چاہیے تھا کالج اور لائبریری کی نذر ہوتا رہا۔

اب انگلستان آنے والے ہندوستانی طلبہ کی تعداد اتنی زیادہ ہو گئی تھی کہ اُن کی آسائش اور رہنمائی کے لیے وزیرِ ہند کو ایک مستقل اسامی قائم کرنے کا خیال پیدا ہوا۔ علی گڑھ کالج کے پرانے پرنسپل سر تھیوڈور مارِیسن اُس وقت وزیرِ ہند کی کونسل کے رکن تھے۔ اُن کی رائے سے آرنلڈ کو اِن طلبہ کا تعلیمی مشیر مقرر کیا گیا۔ ۱۹۰۹ء سے ۱۹۲۰ء تک آرنلڈ اس عہدے پر فائز رہے۔ گیارہ برس کی اِس مدت میں سینکڑوں طلبہ ہندوستان کے مختلف علاقوں سے یہاں آئے۔ اور آرنلڈ نے اُن میں سے ایک ایک نوجوان کی جس جس طرح دلداری و غم خواری، بلکہ خدمت کی اُس کی داستان اگر کتاب کی صورت میں قلم بند کی جائے، تو ہمارے ملک کے بہت سے اکابر کے ابتدائی حالات پر نئی روشنی پڑ سکتی ہے۔

اِس دوران میں انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کی ترتیب و تدوین کے لیے

انگریزی کا ایڈیٹر مقرر کیا گیا۔ یہ کام بڑی دیدہ ریزی اور مشقت کا طالب تھا
یورپ کے مختلف علما نے انسائیکلوپیڈیا کے لیے اپنی اپنی زبان میں جو مضامین
لکھے تھے، اُن کے انگریزی تراجم کیے جا رہے تھے۔ اور آرنلڈ کو تراجم کے اس انبار
پر نظرِ ثانی کرنا پڑتی تھی، پھر ان تراجم کے پروف پڑھنے کا بے کیف کام بھی انھی
کے سپرد تھا۔ ان مصروفیتوں کے سبب سے آرنلڈ کو انسائیکلوپیڈیا کے لیے
خود مضامین لکھنے کا وقت نہ مل سکا۔

سنہ ۱۹۲۰ء میں آرنلڈ کو انڈیا آفس لائبریری کی ملازمت سے سبکدوش کر کے
لندن یونیورسٹی کے مشرقی زبانوں کے سکول میں عربی پروفیسر مقرر کر دیا گیا۔ اب
چونکہ اُنھیں انتظامی امور میں سر نہیں کھپانا پڑتا تھا، اس لیے انھوں نے کُلیتہً
اپنے آپ کو علمی کاموں کے لیے وقف کر دیا۔ سنہ ۱۹۲۱ء میں اُنھوں نے ہیسٹنگز
کی انسائیکلوپیڈیا آف ریلجن کے لیے اسلام پر تین مقالے لکھے۔ سنہ ۱۹۲۲ء میں
ماڈرن کی ضخیم کتاب (WESTERN RACES AND THE WORLD)
کے لیے یورپ اور اسلام کے عنوان سے ایک مبسوط مقالہ سپردِ قلم کیا۔ سنہ ۱۹۲۴ء
میں اُنھوں نے خلافت کے نام سے ایک کتاب شائع کی جس میں حضرت ابوبکر
رضی اللہ تعالےٰ عنہ سے لے کر سلاطینِ عثمانی تک خلافت کی مکمل تاریخ درج
ہے۔ اور مسئلہ خلافت کے تمام پہلوؤں پر بڑی جامع بحث کی گئی ہے۔ سنہ ۱۹۲۸ء
میں اُن کے قلم سے ایک اور کتاب مذہبِ اسلام کے نام سے نکلی، جو اگرچہ حجم
میں زیادہ نہیں لیکن معنوی خوبیوں کے لحاظ سے بڑی جامع اور ہمہ گیر ہے۔
آرنلڈ کو مصوری کا ابتدا سے شوق تھا۔ اگرچہ اُنھوں نے خود تصویر کشی کبھی

نہیں کی۔ لیکن اس فنِ لطیفہ کے رموز کو خوب سمجھتے تھے۔ انڈیا آفس لائبریری میں عہدِ مغلیہ کی تصویروں کا اتنا گراں مایہ ذخیرہ موجود ہے کہ اُس کی مثال شاید دُنیا میں اور کہیں نہ ہوگی۔ اِسی ذخیرے میں داماشکوہ کا وہ مشہور البم بھی ہے جو اُس نے اپنی محبوب بیوی نادرہ بیگم کے لیے تیار کرایا تھا۔ یہ تمام شاہکار آرنلڈ کی نظر سے گزرے۔ اس کے علاوہ لندن کے متعدد عجائب گھروں میں بھی مغلیہ دور کی بہت سی تصویریں رکھی ہیں۔ آرنلڈ نے اُن کو بھی غور سے دیکھا فارسی وہ جانتے تھے اور علی گڑھ اور لاہور کے طویل قیام نے انھیں مغلیہ جاہ و جلال کے مٹے ہوئے نقوش سے بھی آشنا کر دیا تھا۔ یوں بھی آرنلڈ طبعاً ماضی پرست انسان تھے۔ اور بیسویں صدی کے انگلستان میں رہنے کے باوجود وہ چشمِ تخیل سے سترھویں صدی کے دلّی و آگرہ کی شان و شوکت دیکھنے کے زیادہ خواہش مند معلوم ہوتے تھے۔ چنانچہ ۱۹۲۱ء میں اُنھوں نے لارنس بینیون کے اشتراک سے ایک کتاب مغلیہ دربار کے مصوّر کے نام سے شائع کی۔ ۱۹۲۲ء میں اُن کے قلم سے ایک اور کتاب نکلی جس میں ایران کی مصوّری پر یونانی اور ساسانی اثرات سے بحث کی گئی ہے۔

آرنلڈ کی یہ تمام کوششیں دراصل اُن کے ایک بہت بڑے کارنامے کی ابتدائی کڑیاں تھیں۔ انجام کار وہ کارنامہ ۱۹۲۸ء میں کاغذی پیرہن پہن کر نمودار ہوا۔ جس کا نام تھا اسلام میں مصوّری۔ آرنلڈ کی اس کتاب کو اُن کی زندگی کا حاصل سمجھنا چاہیے اگرچہ اس موضوع پر گزشتہ ربع صدی میں کئی اور لوگوں نے بھی طبع آزمائی کی ہے۔ لیکن حق یہ ہے کہ اولیت کا سہرا آرنلڈ

کے سر ہے۔ اور بعد میں آنے والوں نے اپنی اپنی استعداد کے مطابق انہی کے نتائج فکر سے خوشہ چینی کی ہے۔ آرنلڈ نے اس کتاب کو تکمیل تک پہنچانے کے لیے مشرق و مغرب کے ایک ایک گوشے سے مواد حاصل کیا ہے۔ اسلام میں مصوری کی ابتدا کب اور کیوں کر ہوئی۔ فنا اور مصوروں کی باہمی آویزش کہاں سے چلی اور کہاں ختم ہوئی۔ بادشاہوں نے عقیدے اور عمل کے درمیان مفاہمت کی راہ کیوں کر نکالی۔ ایران۔ ہندوستان۔ مصر۔ اندلس۔ عراق۔ چین بخارا۔ ترکی۔ سمرقند۔ مراکش۔ جاوا وغیرہ میں مسلمانوں کی مصوری پر مقامی روایات کہاں تک اثر انداز ہوئیں اور ان مختلف ممالک کی مصوری میں جزو مشترک کیا ہے اس قسم کے بیسیوں مسائل پر آرنلڈ نے شرح و بسط سے روشنی ڈالی ہے۔ مصوروں کے حالات جو اب تک پردۂ خفا میں تھے، کاوش سے تلاش کر کے ترتیب وار جمع کئے اور پھر ان میں سے ہر مصور کی فنی خصوصیات پر ناقدانہ نظر ڈالی۔ یہ صحیح ہے کہ آج اس کتاب کے بعض پہلو تشنہ معلوم ہوتے ہیں لیکن جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ آرنلڈ بنیادی طور پر مصور نہیں بلکہ اسلامیات کا ایک عالم تھا۔ اور اس کتاب کی ترتیب و تدوین کے وقت اس کے سامنے اس موضوع پر چند مضمون کا ایک معمولی رسالہ بھی نہیں تھا۔ تو ہمیں آرنلڈ کی ہمت۔ وسعت معلومات اور شبانہ روز محنت کے سامنے سر جھکا دینے کے سوا کوئی چارہ نظر نہیں آتا۔

اسلام میں مصوری کی اشاعت کے ایک سال بعد پراگ یونیورسٹی کے جرمن پروفیسر گوہتمن نے ساتویں صدی سے اٹھارہویں صدی تک کے مصوری

کی عہد بہ عہد ترقیوں پر ایک کتاب لکھی تو اس میں بھی مسلمانوں کی مصوری پر آرنلڈ نے چار باب قلم بند کئے۔ ان میں سے آخری باب جلد سازی پر ہے۔۔۔۔

جس میں آرنلڈ نے چند مجلد و مطلا جلدوں کی تصویریں درج کر کے بتایا ہے کہ مسلمانوں نے اپنے دورِ مروج میں جلد سازی کو بھی فنونِ لطیفہ میں شامل کر دیا تھا۔

۱۹۳۰ء میں اپنے انتقال سے دو مہینے قبل آرنلڈ نے بہزاد کی مصوری پر ایک مختصر سی کتاب شائع کی تھی۔ جس میں ظفر نامہ کی ان تصاویر سے بحث کی گئی ہے جو بہزاد کے موقلم کی ثمر مند ہیں۔ ظفر نامہ کا یہ نسخہ، جو ۱۴۶۷ء میں لکھا گیا تھا، بابر سے لے کر شاہ عالم ثانی تک مغل شہنشاہوں کے کتب خانے کی زینت بنا رہا۔ اسی نسخے کے ایک صفحہ پر اکبر کے دستخط ثبت ہیں۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اکبر جاہل نہیں بلکہ پڑھا لکھا آدمی تھا۔

آرنلڈ نے یورپ کے مختلف علمی اداروں میں اسلامی تہذیب پر وقتاً فوقتاً جو لکچر دیئے یا اخبارات و رسائل میں مضامین لکھے۔ ان میں سے اکثر اب تک شائع نہیں ہو سکے۔ ۱۹۳۰ء کے شروع میں انھیں مصر سے لکچروں کی دعوت موصول ہوئی تھی تو بڑے شوق سے وہاں گئے تھے۔ قاہرہ میں ان کے چند لکچر ہوئے۔ اس کام سے فارغ ہو کر وہ استنبول چلے گئے۔ جہاں دو ہفتے ٹھہر کر مئی کے آخر میں واپس لندن آ گئے۔ مسٹر ٹامس آرنلڈ کی اہلیہ ان دنوں سخت علیل تھیں۔ چنانچہ لندن پہنچ کر وہ اپنے کاموں میں مصروف ہو گئے اور ساتھ

اپنی اہلیہ کی تیمارداری بھی کرتے رہے۔ اس دوران میں انھیں سوءِ ہضم کی شکایت ہو گئی۔ لیکن دو تین روز کے بعد بالکل اچھے ہو گئے۔ ۹ر جون ۱۹۳۰ء کا ذکر ہے کہ آرام کرسی پر لیٹے ہوئے کتاب دیکھ رہے تھے کہ یکایک حرکتِ قلب بند ہو گئی۔

اس حادثے پر اظہارِ افسوس اور آرنلڈ کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے سر تھیوڈور ماریسن نے ٹائمز میں لکھا تھا۔

"آرنلڈ نے ہندوستانی طلبہ کی جس طرح بے لوث خدمت کی ہے اس کا علم بہت کم لوگوں کو ہے۔ حالانکہ یہی خدمت کا جذبہ اس کی سیرت کا نمایاں پہلو تھا۔ اس نے اپنی زندگی کا بہترین حصہ اور اپنے دل کا بیش قیمت خلوص اس کام کی نذر کر دیا۔ ہندوستان میں وہ طلبہ کی ایک پوری نسل کا بیک وقت دوست، رہنما اور معلم تھا۔ علی گڑھ میں اس نے مسلمانوں کی نژادِ نو کو جس طرح متاثر کیا تھا۔ اس کے روحانی اور ذہنی آثار اب تک موجود ہیں۔ انگلستان میں بھی وہ ہندوستانی طالب علموں کی فلاح و بہبود کے خیال سے ایک لمحہ کے لیے غافل نہیں ہوا۔ اس کام میں اس کا انہماک اور شغف اس حد تک ترقی کر گیا تھا کہ ہم لوگوں کو یہ دیکھ کر افسوس ہوتا تھا کہ ان بے کیف مصروفیتوں نے اس کے علمی مشاغل کو پیچھے ڈال دیا ہے۔

"آرنلڈ محض کتابی آدمی نہ تھا۔ وہ ایک زندہ دل شگفتہ مزاج

اور محفل آرا شخص تھا۔ اُس کی گفتگو بے حد معنی خیز اور پُر لطف ہوتی تھی۔ وہ اہلِ علم کے اُس طبقے کا فرد تھا، جہاں علم کو چھپا چھپا کر نہیں رکھا جاتا۔ بلکہ نوعِ انسان کی خدمت میں صرف کیا جاتا ہے۔ آرنلڈ کی وفات سے یورپ کے مستشرقین میں سے ایک ایسی ہستی اُٹھ گئی ہے جس کی علمی فضیلت مسلّم اور جس کے مزاج کی پاکیزگی بہت بڑی نعمت تھی۔"

آرنلڈ اچھی خاصی اُردو جانتے تھے۔ لیکن اُردو میں انھوں نے تحریری کام نہیں کیا۔ سر عبدالقادر کو ۱۹۰۱ء میں مخزن جاری کرنے کی ترغیب بھی آرنلڈ ہی نے دی تھی۔ اقبال کو اعلیٰ تعلیم کے لیے کیمبرج اور جرمنی جانے پر بھی آرنلڈ ہی نے آمادہ کیا تھا۔ عبدالقادر ۱۹۰۴ء سے ۱۹۰۷ء اور اقبال ۱۹۰۵ء سے ۱۹۰۸ء تک انگلستان میں رہے اور آرنلڈ اس دوران میں برابر انھیں اپنے مشوروں سے مستفیض فرماتے رہے۔ فارسی زبان کے مشہور محقق حافظ محمود شیرانی (اُردو کے نامور شاعر اختر شیرانی کے والد) بھی اُس زمانے میں انگلستان میں مقیم تھے۔ اور مالی مشکلات کی وجہ سے پریشان تھے۔ آرنلڈ نے انھیں انڈیا آفس لائبریری میں ملازمت دلوا دی جس سے ان کو قدرے اطمینان ہو گیا۔

اب زمانہ بدل گیا ہے اور زمین کی طنابیں کھنچ جانے کے باوجود مشرق و مغرب کی باہمی نزاع بڑھتی جا رہی ہے۔ اس لیے شاید ٹامس آرنلڈ کی قسم کے بے غرض لوگ پیدا نہ ہوں گے۔ ایک ایسے شخص کی حیثیت سے جس نے اپنے

تبحرِ علمی اور اپنی بالغ نظری سے ..... اقبال کی ذہنی تربیت میں بہت کچھ حصہ لیا، ہمیں آئرلینڈ کا ممنون ہونا چاہیئے۔ ہم کیا، اقبال خود اپنی ممنونیت کا اظہار کر گئے ہیں۔

تو کہاں ہے اے کلیمِ ذروۂ سینائے علم!
تھی تری موجِ نفس بادِ نشاط افزائے علم
اب کہاں وہ شوقِ رہ پیمائی صحرائے علم!
تیرے دم سے تھا ہمارے سر میں بھی سودائے علم
شورِ لیلےٰ کو ہے کہ باز آرائشِ سودا کند
خاکِ مجنوں را غبارِ خاطرِ صحرا کند"

لندن ۱۹۵۶ء

لارڈ برٹرنڈ رسل

برطانیہ میں اس وقت جتنے اہلِ قلم اور مصنف موجود ہیں، اُن میں برٹرنڈ رسل سے زیادہ عالمگیر شہرت کا مالک اور کوئی نہیں۔ اس کی وجہ یہ نہیں کہ انھیں ادب کا نوبل پرائز مل چکا ہے۔ بلکہ اصلی وجہ یہ ہے کہ برٹرنڈ رسل کی علمی سرگرمیوں کا حلقہ اتنا وسیع، متنوع اور ہمہ گیر ہے کہ اس کی برابری اس ملک کا اور کوئی باشندہ نہیں کر سکتا۔

اس علمی فضیلت کے علاوہ ایک چیز اور بھی ہے جس نے برٹرنڈ رسل کی شہرت میں مزید اضافہ کیا ہے۔ وہ ہے اُن کی حق گوئی، صداقت بیانی، بے خوفی اور اخلاقی جرأت۔ انگریزی میں جسے کیریکٹر کہا جاتا ہے وہ رسل میں بدرجۂ غایت موجود ہے۔ انھوں نے اپنے عقائد کے اظہار میں کبھی اس بات کی پروا نہیں کی کہ حکومت کا رویہ کیا ہے یا عوام کا ردِّ عمل کیا ہوگا۔ ظاہر ہے

جب کسی شخص میں علم و فضل کی بلندی کے ساتھ اخلاق کی پختگی اور کردار کی محکمی بھی پیدا ہو جائے تو وہ ہر اعتبار سے لائقِ تحسین اور قابلِ تعظیم انسان بن جاتا ہے۔

یہ صحیح ہے کہ آج برطانیہ میں اکثر لوگ برٹرنڈ رسل کے مخالف ہیں۔ یہاں تک کہ انھیں اپنے عقائد کی پاداش میں جیل بھی جانا پڑا۔ اور حکومت کے خلاف صف آرا ہونے کی نوبت بھی آئی۔ لیکن اس سے برٹرنڈ رسل کی عظمت میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی۔

اُن کا پورا نام برٹرنڈ آرتھر ولیم رسل ہے۔ ۱۸۵۰ء مئی ۱۸۷۲ء کو انگلستان کے ایک چھوٹے سے گاؤں ریون کرافٹ[1] میں پیدا ہوئے تھے۔ اُن کا خاندان سولھویں صدی سے بہت معزز چلا آ رہا ہے جسے سرکار، دربار میں بھی رسائی حاصل تھی۔ اُن کے دادا لارڈ جان رسل لبرل پارٹی کے مشہور ممبر تھے اور برطانیہ کے وزیر اعظم بھی بن گئے تھے۔ جان سٹوارٹ مل کے فلسفے کی وجہ سے اس ملک میں روشن خیالی، بے تعصبی اور وسیع المشربی خاصی حد تک پھیل گئی تھی۔ چنانچہ لارڈ جان رسل بھی اسی اندازِ فکر کے پیرو تھے اور مذہبی قیود سے بے نیاز تھے۔

برٹرنڈ کی عمر دو سال کی تھی کہ والدہ کا انتقال ہو گیا، اور اس کے ڈیڑھ سال بعد والد بھی اس جہانِ فانی سے رحلت کر گئے۔ برٹرنڈ اور اس کے بڑے بھائی کی ابتدائی تعلیم و تربیت اُن کی دادی کے زیرِ سایہ ہوئی۔

---

[1] RAVENCROFT

گیارہ سال کی عمر میں اُس نے اقلیدس اور ریاضی کے بعض ایسے پیچیدہ اور مشکل سوال حل کئے کہ اُس کے اُستادوں کو بھی اعتراف کرنا پڑا کہ یہ بچہ غیر معمولی ذہانت کا مالک ہے۔ اٹھارہ سال کی عمر میں برٹرنڈ نے مسیحیت ترک کر دی۔ اور اب کہ اُن کی عمر نوّے سال سے تجاوز کر چکی ہے وہ بدستور مسیحیت ہی سے نہیں بلکہ ہر مذہب سے منکر ہیں۔

سنہ ۱۸۹۰ء میں برٹرنڈ کو کیمبرج کے ٹرنٹی کالج میں داخلہ مل گیا۔ جہاں سے اُس نے ریاضی اور فلسفے میں درجۂ اوّل کی ڈگری حاصل کی۔ یہیں اُس کی دوستی میک ٹگرٹ سے ہوئی جو اُس زمانے میں فلسفہ کے طالب علم اور ہیگل کے بہت بڑے مداح تھے۔ یہاں یہ عرض کرنا دلچسپی کا موجب ہوگا کہ علامہ اقبال جب سنہ ۱۹۰۵ء میں کیمبرج کے ٹرنٹی کالج میں داخل ہوئے تو میک ٹگرٹ وہاں فلسفے کے پروفیسر تھے۔ کیمبرج سے نکل کر برٹرنڈ نے کچھ عرصہ پیرس اور برلن میں گذارا۔ سنہ ۱۹۰۰ء میں اُس نے پیرس جا کر فلسفے کی بین الاقوامی کانفرنس میں شرکت کی اور فرانس کے بعض فلسفیوں سے بہت متاثر ہوا۔

بائیس سال کی عمر میں اُس نے شادی کی اور دونوں میاں بیوی اس تحریک میں شامل ہو گئے کہ عورتوں کو ووٹ کا حق ملنا چاہیئے۔ فیبین سوسائٹی[1] کے بھی دونوں ممبر بن گئے تھے۔ سنہ ۱۹۱۰ء میں برٹرنڈ رسل کو کیمبرج میں ریاضی اور منطق کا لکچرار مقرر کیا گیا۔ سنہ ۱۹۱۴ء میں اُسے پہلی مرتبہ امریکہ سے لکچروں کی دعوت موصول ہوئی۔ اور اُسی سال، جب یورپ کی جنگ عظیم

---

[1] FABIAN SOCIETY

شروع ہوئی تو برٹرنڈ نے اپنے آپ کو "امن پرست" کہہ کر جنگ کے خلاف تحریر و تقریر سے پراپیگنڈہ شروع کر دیا۔ اور یکے بعد دیگرے اسی موضوع پر چار پانچ کتابیں لکھ ڈالیں۔ یونیورسٹی کے حکام نے اسے کیمبرج سے نکال دیا۔ اور جب وہ پھر بھی اس پراپیگنڈے سے باز نہ آیا تو اسے چار ماہ کی قید ہو گئی۔ جیل کے اندر اس نے وہ کتاب لکھی جس کا نام ہے INTRODUCTION TO MATHEMATICAL PHILOSOPHY.

جنگ ختم ہونے کے بعد، جب روس میں اشتراکی حکومت قائم ہوئی تو برٹرنڈ رسل بڑے شوق سے وہاں گیا۔ اگرچہ اسے اشتراکیت کے اصولوں سے کوئی اختلاف نہیں لیکن روس کی حکومت اسے کچھ پسند نہ آئی۔ ۱۹۲۱ء میں برٹرنڈ کی اپنی بیوی سے ناچاقی ہو گئی اور نوبت طلاق تک پہنچی۔ اگلے سال اس نے دوسری شادی کی جس سے دو بچے ہوئے۔ ایک لڑکا اور ایک لڑکی۔ ۱۹۳۱ء میں برٹرنڈ رسل کے بڑے بھائی کا انتقال ہو گیا تو لارڈ کا موروثی خطاب اسے مل گیا۔ ہر چند کہ اب وہ لارڈ برٹرنڈ رسل ہے لیکن اپنے آپ کو صرف مسٹر رسل کہلانا پسند کرتا ہے۔

۱۹۳۸ء میں اسے امریکہ کی شکاگو اور کیلیفورنیا یونیورسٹیوں میں لکچر دینے کے لیے جانا پڑا۔ انہی دنوں ہٹلر کے عروج کی وجہ سے چاروں طرف جنگ کا خطرہ پیدا ہو گیا تھا جس کا سدِ باب کرنے کے لیے برٹرنڈ رسل نے بار بار اپنے مضامین میں صلح و آشتی کی تلقین کی۔ لیکن جب ستمبر ۱۹۳۹ء میں ہٹلر نے پولینڈ پر حملہ کر دیا تو رسل نے اپنے قلم سے نازی جرمنی کے خلاف جس شدت

سے مضامین لکھے اُس کی مثال نہیں ملتی۔

۱۹۴۰ء میں اُسے نیویارک کالج میں فلسفے کا پروفیسر مقرر کیا گیا تو امریکہ بھر میں ایک طوفان اُٹھ کھڑا ہوا کہ رسل بے دین۔ لامذہب اور دہریہ ہونے کے علاوہ مسیحیت کا دشمن بھی ہے۔ ناچار کالج کے منتظمین کو اُس کا تقرر منسوخ کرنا پڑا۔ اس کے بعد امریکہ کی ایک اور یونیورسٹی نے اُسے اپنے ہاں پانچ سال کے لیے ملازم رکھ لیا۔ لیکن دو ہی سال کے بعد اُسے ملازمت سے جواب دے دیا گیا تو رسل نے ہرجانے کا دعوے کر کے یونیورسٹی سے بیس ہزار ڈالر وصول کیے۔

۱۹۴۴ء میں اُسے کیمبرج کے ٹرنٹی کالج نے فیلوشپ عطا کی تو وہ دوبارہ انگلستان آگیا جب ۱۹۴۸ء میں بی۔ بی۔ سی نے اپنے ہاں سے ریتھ لکچروں کا آغاز کیا تو اس منصب کے لیے سب سے پہلے رسل کو دعوت دی گئی۔ ۱۹۵۰ء میں اُسے ادب کا نوبل پرائز ملا۔ یہ صحیح ہے کہ برٹرنڈ رسل، بنیادی طور پر، ایک ریاضی دان اور فلسفی ہے۔ لیکن چونکہ اس کی کتابیں زبان و بیان کی شگفتگی۔ اندازِ بیان کی دلفریبی اور طرزِ تحریر کی خوبصورتی کا بے نظیر نمونہ خیال کی جاتی ہیں۔ اس لیے نوبل پرائز عطا کرنے والی کمیٹی نے اُسے ایک ادیب کی حیثیت سے انعام دیا ہے۔ اس کے علاوہ اور بھی بہت سے اعزاز و اکرام اُس کے حصے میں آئے ہیں۔ جن میں برطانیہ کا سب سے بڑا اعزاز آرڈر آف میرٹ شامل ہے۔

دوسری بیوی کے انتقال کے بعد، برٹرنڈ رسل نے ۱۹۲۶ء میں تیسری شادی کی

اس مرتبہ اُس کی زوجیت کا شرف اُس خاتون کو حاصل ہوا جو پہلے اُس کی سیکرٹری تھیں۔

برٹرنڈ رسل نے جو کچھ لکھا ہے اُسے لفظ بہ لفظ پڑھنے کے لیے کئی سال کی مہلت درکار ہے۔ کتابیں ہیں۔ رسالے ہیں۔ مقالے ہیں۔ تقریروں کے مجموعے ہیں۔ مکاتیب و مضامین ہیں۔ اور پھر لطف یہ ہے کہ فلسفہ، ریاضی اور منطق کے پیچیدہ مسائل سے لے کر معاشرت، سیاست، اقتصادیات اور مذہب کے ہر پہلو پر اُس نے لکھا ہے۔

نوّے سال سے عمر اُوپر ہو چکی ہے۔ لیکن رسل کے مزاج کی تیزی اور طبیعت کی شورش آج بھی قائم ہے۔ وہ ایٹم بم کے خلاف ہے اور چاہتا ہے کہ اس کا وجود ختم کر دیا جائے۔ ایٹم بم کو ممنوع قرار دینے کی جو تحریک اِس ملک میں چل رہی ہے، برٹرنڈ رسل اُس کا لیڈر ہے۔ اور ہر سال ایک جلوس لے کر لندن کی سڑکوں پر گشت کرتا ہے۔ ابھی دو سال کی بات ہے۔ وہ اپنے ساتھیوں سمیت دھرنا دے کر وائٹ ہال کی شاہراہ پر بیٹھ گیا تھا۔ بالآخر حکومت نے تنگ آ کر اُسے گرفتار کر لیا۔

پچھلے دنوں ایک اخباری نمائندے نے اُس سے پوچھا کہ ریاضی اور فلسفے کے علاوہ اور کس چیز کا شوق ہے آپ کو؟ تو رسل نے جواب دیا کہ شطرنج بڑے شوق سے کھیلتا ہوں اور رات کو سونے سے پہلے جاسوسی ناول بہت مزے لے لے کر پڑھتا ہوں۔

لندن ۱۹۶۶ء

سر ونسٹن چرچل

اگر یہ سوال کیا جائے کہ آج برطانیہ کا سب سے بڑا، سب سے عظیم المرتبت اور سب سے نامور فرزند کون ہے تو بلا تامل جواب دیا جائے گا ——— سر ونسٹن چرچل۔ یقین کیجئے گا، اس جواب میں کوئی مبالغہ یا تکلف نہیں۔ ونسٹن چرچل کی عمر اس وقت نوّے برس کے لگ بھگ ہے۔ وہ اب بھی سال میں چھ مہینے باہر سیر و سیاحت میں گذارتے ہیں۔ پارلیمنٹ کے بدستور ممبر ہیں۔ اور جب دارالعوام کا اجلاس ہوتا ہے تو دو، ایک بار وہاں جاکر شریک محفل بھی ہوتے ہیں۔ کھانا خوب اشتہا سے کھاتے ہیں۔ سگار کبھی اُن کے منہ سے جدا نہیں ہوتا۔ اور

مے و مینا سے باریابی نہ گئیں
میری پرہیزگاریاں نہ گئیں

کا وظیفہ بھی اُن کا معمول ہے۔

ایک مرتبہ کوئی شخص اُن سے پوچھ بیٹھا کہ جناب، لمبی عمر کا راز کیا ہے؟ تو چرچل نے ہنس کر جواب دیا۔ سنو میاں۔ ہم نے ایسے لوگوں کو بھی دیکھا ہے جو ناپ تول کر کھاتے تھے۔ پھونک پھونک کر قدم رکھتے تھے۔ وقت پر سوتے وقت پر جاگتے تھے۔ سگرٹ اور شراب کو منہ نہ لگاتے تھے۔ لیکن جوانی میں مر گئے۔ ایک میں ہوں کہ نہ کھانے میں پرہیز کرتا ہوں اور نہ پینے میں احتیاط سے کام لیتا ہوں۔ کام کرنے پر آؤں تو آندھی بن جاتا ہوں۔ لیکن اس کے باوجود جیئے جاتا ہوں۔ لمبی عمر کا راز صرف خدا کو معلوم ہے۔

چرچل کی عظمت کا راز ایک یہ بھی ہے کہ وہ ہمہ صفت موصوف اور ہر فن مولا شخص ہے۔ وہ بیک وقت قلم اور تلوار دونوں کا دھنی ہے۔ وہ سیاستدان بھی ہے اور مصور بھی۔ جادو بیان ادیب بھی ہے اور شعلہ نوا خطیب بھی۔ وہ دشمنوں کا دشمن اور دوستوں کا دوست ہے۔ اُسے وار کرنے اور وار سہنے میں مزا آتا ہے۔ پھبتی کہنے اور فقرہ چست کرنے میں بھی اُسے کمال حاصل ہے۔ سیاسی عقائد کے اعتبار سے وہ برطانیہ کے اُس قافلے سے تعلق رکھتا ہے جو مدت ہوئی لد چکا۔ طبعاً اور فطرتاً وہ شہنشاہیت پسند آدمی ہے لیکن بدلتے ہوئے حالات کے ساتھ مطابقت پیدا کرنے کی صلاحیت بھی اُسے آتی ہے۔ اُس نے برِ عظیم ہند کی آزادی کے راستے میں ہمیشہ روڑے اٹکائے۔ لیکن جب ۱۹۴۷ء میں پاکستان اور بھارت کی آزادی کا مسودۂ قانون پارلیمنٹ میں پیش ہوا تو اُس نے حزبِ مخالف کا لیڈر ہونے کے

باوجود کھلے دل سے اس تحریک کی حمایت کی تھی۔ اگرچہ میرا ذاتی خیال ہے کہ چرچل اس وقت وزیرِ اعظم ہوتا تو ہندوستان سے برطانوی اقتدار ختم کرنے میں وہ بے قاعدگی، سنگدلی، بے خبری اور بدسلیقگی ظہور میں نہ آتی جس کا اظہار لیبر پارٹی کی وزارت نے اپنی جلد بازی میں کیا تھا۔

چرچل کے والد رینڈلف چرچل برطانیہ کے وزیرِ خزانہ تھے۔ اور ان کے وزیرِ اعظم بننے کی بھی پختہ امید تھی، لیکن بعض موانع حائل ہو گئے۔ چرچل کے جدِ امجد ڈیوک آف مارلبرو تھے۔ جن کا عالی شان مکان بلنہم پیلیس آج بھی اپنے مالک کی عظمت و جبروت کی شہادت پیش کر رہا ہے۔ چرچل کی پیدائش اسی پیلیس میں ۳۰ نومبر ۱۸۷۴ء کو ہوئی تھی۔ انھوں نے ہیرو کے مشہور پبلک سکول میں تعلیم حاصل کی لیکن یونیورسٹی تک نہیں پہنچ سکے۔ ہیرو کے بعد وہ سینڈھرسٹ کی فوجی درس گاہ میں داخل ہو گئے اور دو سال کے بعد فوج میں کمشن مل گیا۔

چرچل نے اپنی ملازمت کی ابتدا ہندوستان میں کی تھی۔ شروع میں وہ کچھ عرصہ بنگلور میں رہے۔ پھر شمال مغربی صوبۂ سرحد میں چلے گئے اور وہاں کی معرکہ آرائیوں میں شریک ہوتے رہے۔ اس دوران میں انھوں نے الہ آباد کے روزنامہ پائنیئر اور لندن کے ڈیلی ٹیلی گراف کی نامہ نگاری بھی اختیار کر لی۔ گویا یوں کہنا چاہیئے کہ زبانِ قلم اور زبانِ شمشیر دونوں کا استعمال شروع ہو گیا تھا۔ ان معرکوں سے فارغ ہو کر چرچل نے اپنی پہلی کتاب لکھی جس کا نام تھا مالاکنڈ فیلڈ فورس۔ اگرچہ اس واقعہ کو ۶۵ سال گذر چکے ہیں۔ لیکن

یہ کتاب اپنی بعض خصوصیتوں کے اعتبار سے آج بھی پڑھنے کے قابل ہے۔

دو سال ہوئے جب ملکہ الزبتھ پاکستان تشریف لے گئی تھیں تو انھوں نے شمالی مغربی صوبۂ سرحد کے اُن مقامات کی سیر کرتے ہوئے جن کا ذکر چرچل نے اپنی کتاب میں کیا ہے۔ سر ونسٹن کو تہنیت و مبارکباد کا تار بھیجا تھا۔

ہندوستان سے واپس آکر چرچل نے سوڈان اور جنوبی افریقہ کی جنگوں میں بھی شرکت کی، جہاں اُن کا بیشتر وقت لندن کے اخباروں کی نامہ نگاری میں گذرا۔ جنوبی افریقہ میں وہ دشمن کے ہاتھ گرفتار بھی ہو گئے تھے۔ لیکن پھر نہایت ہوشیاری سے بھاگ نکلے۔

چرچل چھبیس ۲۶ سال کا نوجوان تھا جب پہلی بار پارلیمنٹ کا ممبر منتخب ہوا۔ یہ واقعہ سنہ ۱۹۰۰ء کا ہے۔ آج کہ اُس واقعہ کو ۶۳ سال گذر چکے ہیں چرچل بدستور دارالعوام کا ممبر ہے۔ اور بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ یہ شخص دارالعوام کی چلتی پھرتی زندہ تاریخ ہے۔

سنہ ۱۹۱۴ء کی جنگ عظیم سے پہلے چرچل بورڈ آف ٹریڈ کا صدر اور ہوم سکرٹری رہ چکا تھا۔ لیکن جنگ شروع ہوتے ہی اُسے نیوی کا وزیر بنا دیا گیا۔ اس جنگ میں چرچل کو بعض ایسی ناکامیوں کا سامنا کرنا پڑا جن کی وجہ سے اُس کے دشمنوں نے بُری طرح اُسے طعن و تشنیع کا ہدف بنایا۔ مثلاً درۂ دانیال پر برطانوی فوجوں نے جو حملہ کیا تھا۔ اُس کی ذمہ داری چرچل پر تھی۔ ظاہر ہے یہ حملہ سخت ناکام رہا۔ اور گیلی پولی کے معرکوں میں جب انگریزی فوجوں کو پسپا ہونا پڑا تو ۴۵ ہزار سپاہی لقمۂ اجل بنے۔ چرچل پر چاروں

طرف سے اعتراضوں کی بوچھاڑ ہوئی تو اُس نے وزارت سے استعفا دے دیا یہ گویا اُس کی زندگی کا تاریک دور تھا۔ لیکن بعد ازاں جنگ کے مؤرخوں نے چرچل کو ہر قسم کے الزام سے بری الذمہ قرار دیا۔

پہلی جنگِ عظیم کے ختم ہونے اور دوسری عالمگیر جنگ شروع ہونے کے درمیان جو اکیس سال کا عرصہ گذرا۔ اُس میں چرچل کی قسمت کا ستارہ عروج پر نہیں بلکہ زوال پر تھا۔ اُس کا ایک سبب تو یہ تھا کہ برطانیہ میں لیبر پارٹی کی وزارت قائم ہو گئی۔ اور دوسرا سبب یہ ہوا کہ خود چرچل کی اپنی پارٹی سے اَن بَن ہو گئی تھی۔ یہ صحیح ہے کہ اِس دوران میں اُسے پانچ سال تک وزیرِ خزانہ کے عہدے پر کام کرنے کا موقع ملا تھا۔ لیکن ۱۹۲۹ء سے ۱۹۳۹ء تک اُسے بالکل یکہ و تنہا شخص کی حیثیت سے زندگی بسر کرنی پڑی۔ بالڈوِن اور نیول چیمبرلین نے اُسے اپنے قریب تک نہیں آنے دیا۔ اور لوگوں کا عام خیال یہی تھا کہ اب چرچل کو ختم سمجھو۔

یکایک ستمبر ۱۹۳۹ء میں عالمگیر جنگ شروع ہو گئی، اور جب نیول چیمبرلین کی وزارت ناکام ثابت ہوئی تو چرچل کو برطانیہ کا وزیرِ اعظم بنایا گیا۔ بس یہیں سے چرچل کی حقیقی عظمت کا دور شروع ہوتا ہے۔ چرچل کی عمر اُس وقت چھیاسٹھ سال تھی۔ لیکن اُس نے جس محنت، جاں فشانی اور تن دہی سے کام کیا، اُس کے سامنے جوانوں کا شباب ماند پڑ گیا تھا۔ سچی بات یہ ہے کہ چرچل گذشتہ جنگ کا فاتح ہے اور آج برطانیہ کا بچہ بچہ اُسے اپنا محسن اور نجات دہندہ خیال کرتا ہے۔

چرچل نے جنگ کے زمانے میں جو تقریریں کیں، اُن کا ایک ایک لفظ آبِ زر سے لکھنے کے قابل ہے۔ قوم کے حوصلے پست ہو رہے تھے۔ حال یاس انگیز اور مستقبل سراسر تاریک تھا۔ فرانس کے سقوط کے بعد برطانیہ کا دنیا بھر میں کوئی ساتھی نہیں تھا۔ اپنے اور بیگانے دونوں سمجھتے تھے کہ اب مہینے بھر کے اندر اس جزیرے پر بھی ہٹلر کا قبضہ ہو جائے گا۔ جرمنی کے ہوائی جہاز چاروں طرف آگ برسا رہے تھے۔ اِن حالات میں چرچل نے جس طرح گرتی ہوئی قوم کو سنبھالا، مٹتے ہوئے حوصلوں کو اُبھارا۔ اور اُمید کی بجھتی ہوئی شمع کو روشن کیا۔ وہ برطانوی قوم کی تاریخ کا سب سے درخشاں باب ہے۔ یہ چرچل کی مسیحائی تھی کہ یہ مُلک گویا موت کے منہ سے زندہ بچ نکلا اور قوم کو حیاتِ تازہ حاصل ہوئی۔

جب ۱۹۴۵ء میں جنگ ختم ہوئی اور برطانیہ اس محاربۂ عظیم میں سرخرو اور کامیاب ہو کر نکلا تو پارلیمنٹ کے نئے انتخاب ہوئے۔ اور دُنیا یہ دیکھ کر انگشت بدنداں رہ گئی کہ انگریز قوم نے چرچل کی پارٹی کے خلاف ووٹ دے کر لیبر پارٹی کو کامیاب بنایا ہے۔ بعض لوگ کہتے تھے کہ انگریزوں نے اپنے محسن کی قدر نہیں کی۔ لیکن امرِ واقع یہ ہے کہ اسے بھی انگریزوں کی حقیقت پسندی سے تعبیر کرنا چاہیئے کہ اُنھوں نے جنگ جیتنے کے لیے تو چرچل کو منتخب کیا۔ اور امن کی حالت میں قوم کی تعمیرِ نو کے لیے اُن کی نظرِ انتخاب ایٹلی پر پڑی۔

چھ سال حزبِ مخالف کا لیڈر رہنے کے بعد ۱۹۵۱ء میں چرچل نے

پھر انتخاب جیتے اور دوبارہ برطانیہ کا وزیرِ اعظم بنا۔ لیکن ۱۹۵۵ء میں جب اُس کی عمر اسّی سال ہو چکی تھی اُس نے وزارتِ عظمیٰ کا بوجھ اینتھنی ایڈن کے حوالے کر دیا اور خود مملکت کی ذمّے داریوں سے کنارہ کش ہو گیا۔

چرچل ایک بہت بڑا مصنّف اور اہلِ قلم بھی ہے۔ اُس نے گذشتہ عالمگیر جنگ کی تاریخ چھ مبسوط جلدوں میں مرتّب کی تھی۔ ڈیوک آف مارلبرو کے سوانح حیات بھی لکھے ہیں۔ اُس کا طرزِ تحریر نہایت شگفتہ اور دلآویز ہے۔ ادب کا نوبل پرائز بھی اُسے مل چکا ہے۔ اور ایک مصوّر کی حیثیت سے اُس کو رائل اکیڈیمی کی اعزازی رُکنیت کا شرف بھی حاصل ہے۔

ایک باتدبیر۔ محنتی۔ جفاکش اور حد درجہ ذہین آدمی ہونے کے ساتھ ساتھ چرچل تقدیر کا بھی شدّت سے قائل ہے۔ اُس نے جگہ جگہ اپنی کتابوں میں لکھا ہے کہ حصولِ مقصد کے لیے سعی و کوشش بلاشبہ ضروری ہے لیکن ظاہری اسباب کے پسِ پردہ ایک پُراسرار طاقت بھی کام کر رہی ہے جو بعض اوقات ہماری کوششوں کو ناکام بنا دیتی ہے اور کبھی کبھار بغیر کوشش کے بھی ہمیں منزلِ مقصود پر پہنچا دیتی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اب زمانے کا رنگ بدل گیا ہے اور چرچل جیسے لوگ غالباً آئندہ پیدا نہیں ہوں گے ؎

یادگارِ زمانہ ہیں یہ لوگ
یاد رکھنا فسانہ ہیں یہ لوگ

لندن ۱۹۶۴ء

مسلم مشن — ووکنگ

ووکنگ مسلم مشن کا نام کم و بیش دنیا کے ہر حصے میں پہنچ چکا ہے۔ یورپ میں تبلیغِ اسلام کا جتنا کام اس مشن نے کیا ہے، غالباً کسی اور ادارے سے اب تک نہیں ہو سکا۔ ووکنگ لندن سے پچیس میل دور۔ ایک بڑا خوبصورت قصبہ ہے۔ ریل کے سٹیشن پر اتر کر پیدل چلیں تو پندرہ بیس منٹ کے فاصلے پر دو ایکڑ کے سبزہ زار میں ایک مسجد کھڑی ہے جس کا سبز گنبد دور سے نظر آتا ہے۔ اندر فرش پر قالین بچھا ہے۔ سامنے محراب کے اوپر آیاتِ قرآنی کے کتبے لگے ہوئے ہیں۔ اور قریب ہی منبر ہے۔ مسجد سے عین متصل ایک کشادہ مکان ہے جہاں امام صاحب رہتے ہیں۔ یہی مسجد، گذشتہ نصف صدی سے مسلم مشن کی تبلیغی سرگرمیوں کا مرکز ہے۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ پہلے یہ عرض کر دیا جائے کہ انگلستان کی

سرزمین پر یہ مسجد بنی کیوں کر۔ اور اُس کا بانی کون تھا۔ ووکنگ کی مسجد کی دلچسپ تاریخ یہ ہے کہ اِس کے بانی کا نام ڈاکٹر لائٹنر تھا۔ جو ایک زمانہ میں پنجاب یونیورسٹی کے رجسٹرار تھے، ڈاکٹر لائٹنر عربی اور فارسی کے عالم تھے، جب وہ پنجاب یونیورسٹی کی ملازمت سے سبکدوش ہو کر واپس انگلستان آئے تو اُن کا ارادہ تھا کہ اِس ملک میں ایک ایسا مرکزی ادارہ قائم کریں جہاں سے اسلامی ادبیات کی نشر و اشاعت ہو سکے۔ اِس غرض کے لیے اُنھوں نے والیۂ بھوپال نواب شاہجہاں بیگم سے مالی امداد کی درخواست کی۔ اور بیگم صاحب نے ایک اچھی خاصی معقول رقم عنایت فرمائی۔ ڈاکٹر لائٹنر نے اِس روپے سے ووکنگ میں دو ایکڑ اراضی کا قطعہ خریدا۔ اور ۱۸۸۹ء میں یہ مسجد تعمیر کی۔ حیدرآباد دکن کے نواب سالار جنگ نے بھی ڈاکٹر لائٹنر کو روپیہ عطا کیا تھا۔ جس سے مسجد سے متصل مکان بنوایا گیا۔

ڈاکٹر لائٹنر ابھی اپنا منصوبہ مکمل نہ کرنے پائے تھے کہ اُن کا انتقال ہو گیا اور یہ جائداد اُن کے بیٹوں کے قبضے میں چلی گئی۔ جنھیں اپنے باپ کے کام سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ آہستہ آہستہ مسجد بالکل ویران ہو گئی۔ اب حسنِ اتفاق ملاحظہ فرمایئے کہ ۱۹۱۲ء میں خواجہ کمال الدین مرحوم لندن تشریف لائے خواجہ صاحب لاہور میں وکالت کرتے تھے اور اپنے پیشے میں بڑے کامیاب آدمی تھے۔ لیکن اُنھیں اسلام سے بے پناہ محبت تھی۔ اُنھوں نے پریکٹس ترک کر کے اپنی زندگی تبلیغ اسلام کے لیے وقف کر دی اور اسی غرض سے انگلستان تشریف لے آئے۔

وہ زمانہ انگریز قوم کے عروج کا تھا۔ مشرق و مغرب میں اُس کی سلطنت پھیلی ہوئی تھی اور کہا جاتا تھا کہ برطانوی سلطنت میں سورج کبھی غروب نہیں ہوتا مسلمان ہر جگہ محکوم و مغلوب تھے۔ اور اس محکومی اور غلامی نے اُن میں حد درجہ احساسِ کمتری پیدا کر دیا تھا۔ جب خواجہ صاحب نے انگلستان آکر تبلیغ اسلام کا ارادہ کیا تو اکثر لوگوں نے سمجھایا کہ کیوں چلتی وکالت کو تباہ کرنے لگے ہو۔ انگریزوں کو اسلام سے کیا دلچسپی ہے اور دلچسپی ہوئی بھی تو وہ ایک غلام قوم کا مذہب کیوں قبول کریں گے لیکن اِن باتوں سے خواجہ صاحب کے پائے استقامت میں لغزش نہ ہوئی ـــــ لندن آکر انھوں نے ابتدا میں رچمنڈ کے علاقے میں قیام کیا۔ اور تقریر و تحریر سے اسلام کا پیغام لوگوں کو پہنچانا شروع کیا۔ اِسی کام کے لیے اُنھوں نے اپنا مشہور رسالہ اسلامک ریویو بھی جاری کیا۔ لیکن اُنھیں کسی ایسی جگہ کی تلاش تھی جس کو وہ اپنی سرگرمیوں کا مستقل مرکز بنا سکیں۔ اِس دوران میں اُنھیں ووکنگ کی مسجد کا حال معلوم ہُوا کہ یہ خانۂ خدا ویران پڑا ہے۔ چنانچہ خواجہ صاحب نے ووکنگ جا کر مسجد پر قبضہ کر لیا۔ ڈاکٹر لائٹنر کے ورثا نے اُن کو وہاں سے نکالنے کی کوشش کی۔ لیکن خواجہ صاحب نے جواب دیا کہ مسجد شرعِ اسلام کی رُو سے ہمیشہ مسجد رہتی ہے اور کوئی شخص مسلمانوں کو وہاں نماز پڑھنے سے منع نہیں کر سکتا۔ اِس سلسلے میں مرزا مہر عباس علی بیگ مرحوم نے جو اُس زمانے میں وزیرِ ہند کی کونسل کے ممبر تھے خواجہ صاحب کی بہت مدد کی۔ انجام کار مسجد اُن کی تحویل میں آگئی۔

خواجہ صاحب قانون دان تھے اِس لیے اُنھوں نے مسجد کی حفاظت وصیانت کے لیے ایک ٹرسٹ قائم کیا جس کے ابتدا میں تین ممبر تھے۔ ایک رائٹ آنریبل سید امیر علی جو پریوی کونسل کی جوڈیشل کمیٹی کے رکن تھے دوسرے مرزا سر عباس علی بیگ اور تیسرے سر ٹامس آرنلڈ جو گورنمنٹ کالج لاہور میں علامہ اقبال کے استاد تھے۔ اِس ٹرسٹ نے خواجہ صاحب کو امام مقرر کیا اُس وقت سے ووکنگ کی مسجد انگلستان میں تبلیغِ اسلام کی سرگرمیوں کا سب سے بڑا مرکز چلی آرہی ہے۔

خواجہ صاحب کو ابتدا میں سخت مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ اسلام کے متعلق بڑی بڑی عجیب داستانیں اور بے سر و پا افسانے اِس ملک میں مشہور تھے تعصب اور جہالت کی اِس دیوار کو پاش پاش کرنا آسان نہ تھا۔ لیکن خواجہ صاحب غیر معمولی دل و دماغ لے کر دُنیا میں آئے تھے۔ وہ حد درجہ ذہین اور محنتی انسان تھے۔ قلم اور زبان دونوں پر اُنھیں قابلِ رشک عبور تھا۔ پھر سب سے بڑی بات یہ تھی کہ اسلام کی صداقت اور حقانیت پر اُنھیں ایمانِ کامل تھا اور اسی چیز نے اُن کی ہمت کو برقرار رکھا۔ چنانچہ اُنھوں نے اپنی زندگی میں اس مشن کی روز افزوں کامیابی دیکھ لی تھی۔

خواجہ صاحب نے اِسلام پر انگریزی میں کم و بیش بیس کتابیں لکھی ہیں، اُن ہی کی کوشش سے ۱۹۱۷ء میں مولانا محمد علی لاہوری کا انگریزی ترجمہ قرآن ووکنگ سے شائع ہوا۔ لاریب یہ بہت بڑا کارنامہ تھا۔ کیونکہ اِس سے قبل دُنیا کے کسی مسلمان کو کلامِ پاک کا انگریزی میں ترجمہ کرنے کی توفیق نہیں ہوئی

تھی۔ خواجہ صاحب کا انتقال ۲۸ دسمبر ۱۹۳۲ء کو لاہور میں ہوا تھا۔ لیکن وفات سے پہلے انھوں نے اپنی جائداد جس میں ان کی تصانیف اور رسالہ اسلامک ریویو بھی شامل تھا وکنگ مشن کے حوالے کر دی

یہاں اگر مجھے چند لفظوں میں اپنا ذکر کرنے کی اجازت دی جائے تو یہ عرض کروں گا کہ مجھے خواجہ صاحب کی خدمت میں برسوں شرف نیاز حاصل رہا ہے۔ وہ میرے والد مرحوم کے دوست تھے۔ اور اُن کے چھوٹے صاحبزادے سکول میں میرے ساتھ پڑھتے تھے اس لیے میں نے خواجہ صاحب کو نسبتاً قریب رہ کر دیکھا ہے۔

خواجہ صاحب کے علاوہ جو لوگ وقتاً فوقتاً مسجدِ وکنگ میں امامت کے فرائض ادا کرتے رہے ہیں۔ اُن میں مولانا صدرالدین۔ مولانا محمد یعقوب خاں مولانا عبدالمجید۔ مولوی مصطفےٰ خاں۔ ڈاکٹر محمد عبداللہ اور مولوی آفتاب الدین احمد کے اسمائے گرامی بڑی قدر و منزلت کے مستحق ہیں۔ سوائے مولوی آفتاب الدین احمد مرحوم کے مجھے ان تمام حضرات سے شرفِ نیاز حاصل رہا ہے بلکہ اوّل الذکر تینوں بزرگ تو میرے زمانہ طالب علمی میں میرے اُستاد بھی تھے۔

وُوکنگ مشن کی سرگرمیوں کی اہمیت سمجھنے کے لیے پچھلی نصف صدی کا جائزہ لینا ضروری ہے۔ کہ مشن کے کارکنوں نے یورپ میں اسلام کی کیسی گراں بہا خدمت کی ہے۔ اُن متعدد تصانیف و تالیفات سے قطع نظر جو مشن نے شائع کی ہیں۔ تنہا اسلامک ریویو کے فائل اس بات کے گواہ ہیں۔ اسلامی فقہ و تاریخ اسلامی تہذیب و تمدن اور اسلامی روایات و

معاشرت کا مشکل سے کوئی پہلو ایسا ہوگا۔ جس پر اس میں فاضلانہ اور محققانہ مضامین شائع نہ ہوئے ہوں۔ یہ رسالہ دنیا بھر میں پڑھا جاتا ہے۔ اور اسلام کی صحیح تصویر پیش کرنے میں اس نے یقیناً بڑا کام کیا ہے۔

تبلیغ کے علاوہ ووکنگ مشن اُن لاکھوں مسلمانوں کا اجتماعی مرکز بن گیا ہے۔ جو برطانیہ میں مقیم ہیں۔ اِن میں مراکش سے چین تک ہر ملک کے مسلمان موجود ہیں۔ عیدین کے موقع پر، ووکنگ کا نظارہ دیکھنے کے قابل ہوتا ہے۔ ترکی، ایران، مصر، ملایا، انڈونیشیا، ترکستان، پاکستان، بھارت عرب، نائیجیریا، الجزائر، طرابلس غرضیکہ ہر نسل، ہر رنگ اور ہر قومیت کے مسلمان جمع ہوتے ہیں۔ بہت سے نو مسلم انگریز بھی شرکت کرتے ہیں۔ اِس بین الاقوامی اجتماع میں زبان، لباس، رنگ اور معاشرت کے اختلاف کے باوجود اخوت کی ایک ایسی لہر طاری ہوتی ہے جو مشرق و مغرب کے فاصلے اور اسود و احمر کے امتیاز کو مٹا کر تمام مسلمانوں کو ایک ہی رشتے میں منسلک کر دیتی ہے، عید کی نماز ایک بہت بڑے شامیانے کے نیچے ادا کی جاتی ہے۔ اور نماز سے فارغ ہو کر دوپہر کا کھانا بھی وہیں کھایا جاتا ہے جس کا اہتمام مشن کی طرف سے کیا جاتا ہے، گویا یوں سمجھنا چاہیئے کہ عید کے روز ہم سب ووکنگ مشن کے مہمان ہوتے ہیں۔

جس چیز نے مجھ کو زیادہ متاثر کیا، وہ یہ ہے کہ ووکنگ مشن والے فرقہ بندی سے بالکل علیحدہ بلکہ بالاتر ہو کر اسلام کی خدمت کر رہے ہیں۔ میں نے گذشتہ دس سال میں دیکھا ہے کہ عید کی نماز کی امامت مختلف لوگوں نے

کی ہے۔ ان میں ایران کے شیعہ مجتہد، انڈونیشیا کے سفیر مشہور نومسلم انگریز ڈاکٹر کاوڈن اور عراق کے ڈاکٹر عبدالعزیز خلوصی شامل ہیں۔

مشن کے زیر اہتمام ایک مسلم سوسائٹی بھی قائم ہے۔ جس کا صدر دفتر لندن کے مرکزی علاقے وکٹوریہ میں ہے۔ جہاں ہر ہفتے، ایک نہایت دلچسپ اجتماع ہوتا ہے۔ جس میں ہر خیال اور عقیدے کے لوگ شریک ہوتے ہیں۔ عموماً مسلمانوں کے کسی مذہبی، معاشرتی اور علمی و ادبی مسئلے پر کوئی صاحب تقریر کرتے ہیں۔ اور بعد کو بڑی معقول بحث بھی ہوتی ہے۔

مسجد ووکنگ کے امام کو خاصی مصروفیت رہتی ہے۔ برطانیہ کی اکثر انجمنوں اور اداروں میں اس قسم کے جلسے ہوتے ہیں۔ جہاں مختلف مذاہب کے نمائندوں کو اظہار خیال کی دعوت دی جاتی ہے، ووکنگ کے امام کو، اکثر و بیشتر، ان جلسوں میں اسلام کی ترجمانی کا اعزاز حاصل ہوتا ہے۔

آج برطانیہ کے اور شہروں میں بھی مسلمانوں کی سعی و کوشش سے مسجدیں بن گئی ہیں۔ اور خود انگلستان میں اسلام کے متعلق وہ بے خبری، جہالت اور تعصب نہیں رہا۔ جو نصف صدی پیشتر تھا۔ لیکن اس کے باوجود ووکنگ کی مرکزیت میں کوئی کمی نہیں ہوئی — اور ووکنگ آج بھی برطانیہ میں اسلام کی نشاۃ ثانیہ کا سب سے بڑا مرکز ہے۔

لندن ۱۹۶۳ء

مارمیڈیوک پکتھال

پہلا نومسلم انگریز جس نے قرآنِ مجید کا انگریزی میں ترجمہ کیا

قرآنِ مجید کا انگریزی میں ترجمہ بہت سے انگریزوں نے کیا ہے۔ لیکن مارمیڈیوک پکتھال پہلا نومسلم انگریز ہے جس کو یہ شرف حاصل ہے کہ اوّل اُس نے اسلام قبول کیا۔ پھر برسوں کی کوشش و کاوش غور و فکر اور تفکر و تدبّر کے بعد کلامِ الٰہی کا ترجمہ نہایت خوب صورت اور پاکیزہ انگریزی میں کیا۔ اس ترجمے کو آج دنیا بھر میں عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ حتیٰ کہ مصر میں بھی، جہاں ایک زمانے میں قدامت پسندی کا یہ عالم تھا کہ قرآنِ پاک کا انگریزی میں ترجمہ کرنا کفر خیال کیا جاتا تھا۔ پکتھال کے ترجمے کو بڑا بلند مقام حاصل ہے۔ امریکہ میں پچھلے چند سال سے مارمیڈیوک پکتھال کا ترجمہ PAPER BACK کی صورت میں چھپ کر پانچ لاکھ کے قریب فروخت ہو چکا ہے اور کہا جاتا ہے کہ دنیا بھر

میں کسی انگریز مترجم کے قرآنِ مجید کو اتنی مقبولیت حاصل نہیں ہوئی۔

مارمیڈیوک پکتھال ۷ اپریل ۱۸۷۵ء کو انگلستان میں سفک کے قریب ایک گاؤں میں پیدا ہوا تھا۔ اُس کے والد جن کا نام چارلس پکتھال تھا مقامی گرجا گھر کے پادری تھے۔ چارلس کی پہلی بیوی سے دس بچے تھے۔ جس کے فوت ہو جانے کے بعد اُس نے دوسری شادی کی تو اُس سے مارمیڈیوک پیدا ہوا۔

مارمیڈیوک نے ہیرو کے مشہور پبلک سکول میں تعلیم پائی تھی۔ اُس کے ہم عصر طلبہ میں سے جن لوگوں نے آگے چل کر برطانیہ کی سیاسی اور معاشرتی زندگی میں بڑا نام پیدا کیا، سر ونسٹن چرچل بھی شامل تھے۔ چنانچہ مارمیڈیوک اور چرچل کی دوستی آخر وقت تک قائم رہی۔

سکول کی تعلیم سے فارغ ہو کر اُس کے سامنے دو راستے تھے۔ ایک یہ کہ آکسفورڈ یونیورسٹی میں اعلیٰ تعلیم کے لیے داخل ہو جائے اور دوسرا راستہ یہ تھا کہ ایک دوست کے ساتھ جس کا نام ڈولنگ تھا، فلسطین کی سیر و سیاحت کرے۔ فلسطین پر اُس زمانے میں ترکوں کی حکومت تھی اور ڈولنگ کو وہاں انگریزی سفارت خانے میں ملازمت مل گئی تھی۔ چنانچہ مارمیڈیوک آکسفورڈ جانے کے پروگرام کو خیرباد کہہ کر فلسطین روانہ ہو گیا اور یہیں سے گویا اُس کی زندگی میں وہ انقلابی موڑ آیا جس نے ہمیشہ کے لیے اُس کے مستقبل کا فیصلہ کر دیا۔

مارمیڈیوک مسلسل کئی سال فلسطین۔ شام، مصر اور عراق میں مقیم رہنے کے بعد استنبول چلا گیا۔ اِس دوران میں اُس نے عربی زبان بھی سیکھ لی تھی

اور ترکی زبان میں بھی لکھنے پڑھنے کا کام کرنے لگا تھا۔ آہستہ آہستہ اُس نے عربوں کا لباس بھی پہننا شروع کر دیا اور عربی تہذیب و تمدن سے بڑی وابستگی پیدا ہو گئی۔

یہ وہ زمانہ تھا جب ترکی حکومت پر زوال طاری ہو چکا تھا اور ملک کی اندرونی بدنظمی کے علاوہ جنگِ طرابلس اور جنگِ بلقان کی وجہ سے ترکوں کو شکستیں ہو رہی تھیں۔

مارمیڈیوک کو ترکوں سے بے انتہا ہمدردی تھی۔ کیونکہ اُس نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا تھا کہ یورپ کی عیسائی حکومتیں ترکوں کی مخالفت محض مذہبی تعصب کی بنا پر کرتی تھیں۔ محمود شفقت پاشا۔ شکری پاشا۔ طلعت پاشا جمال پاشا۔ انور پاشا اور تمام بڑے بڑے ترک لیڈروں سے اُس کے دوستانہ مراسم قائم ہو گئے تھے۔

۱۹۱۲ء میں مارمیڈیوک نے واپس انگلستان آ کر ایک انجمن عثمانیہ قائم کی تاکہ ترکوں کی حمایت میں برطانیہ میں پراپیگنڈا کیا جائے۔ لیکن ۱۹۱۴ء کی جنگِ عظیم میں جب انگریزوں اور ترکوں کے درمیان باقاعدہ لڑائی شروع ہو گئی تو مارمیڈیوک کی تمام اُمیدیں اور کوششیں گویا خاک میں مل گئیں۔

چونکہ اِس تمام عرصہ میں مارمیڈیوک نے اسلام کا نہایت غور و فکر سے مطالعہ جاری رکھا تھا۔ اور اُس پر اسلام کی صداقت بالکل آشکارا ہو چکی تھی۔ اِس لیے دسمبر ۱۹۱۴ء میں اُس نے لندن میں انشراحِ صدر کے ساتھ اسلام قبول کر کے اپنا نام محمد مارمیڈیوک پکھتال رکھا۔ بعد ازاں اُس نے

اعتراف کیا تھا کہ اُس کی زندگی میں جتنے مصائب اور پریشانیاں آئیں۔ اُن میں امن و عافیت کا واحد گہوارہ اسلام ثابت ہوا۔

۱۹۱۷ء میں اُس کی ملاقات خواجہ کمال الدین مرحوم سے ہوئی۔ جنھوں نے مسجدِ ووکنگ میں تبلیغِ اسلام کا مرکز قائم کیا تھا اور جب خواجہ صاحب ۱۹۱۹ء میں ہندوستان چلے گئے تو اُن کی غیر حاضری میں مارمیڈیوک۔ مسجدِ ووکنگ میں نماز جمعہ کی امامت کرتا تھا۔ رمضان میں تراویح پڑھاتا تھا اور عیدین کی نمازوں کی اِمامت بھی کرتا تھا۔ اِس کے علاوہ رسالہ اسلامک ریویو کی ترتیب و تدوین کا کام بھی اُسی کے سپرد تھا۔

۱۹۲۰ء میں مارمیڈیوک کو ہندوستان کے مشہور انگریزی روزنامے بمبئی کرانیکل کی ایڈیٹری پیش کی گئی جو اُس نے قبول کر لی۔ دراصل بمبئی کرانیکل کے انتظامی بورڈ میں زیادہ دخل بمبئی کے ایک مشہور مسلمان خاندان ٹوبانی کا تھا۔ اور خواجہ کمال الدین اور مولانا محمد علی کے چونکہ اِس خاندان سے دیرینہ مراسم تھے۔ اِس لیے اِن اصحاب کے توسّل سے مارمیڈیوک نے بمبئی جا کر اس روزنامے کی ایڈیٹری سنبھال لی۔

سیاسی اعتبار سے یہ زمانہ بڑا نازک اور پُرخطر تھا۔ ہندوستان میں خلافت اور ترکِ موالات کی تحریکیں شروع ہو چکی تھیں اور بمبئی کرانیکل چونکہ پکا قوم پرست اخبار تھا۔ اِس لیے مارمیڈیوک نے بھی زور شور سے اِن تحریکوں کی حمایت کی۔ خود اُس نے بدیشی کپڑے پہننا ترک کر دیئے تھے۔ اور سر سے پاؤں تک کھدر کا لباس پہنتا تھا۔

مارمیڈیوک نے ۱۸۹۶ء میں جبکہ اُس کی عمر اکیس سال تھی شادی کرلی تھی۔ اس کی بیوی کا نام MURIEL تھا۔ یہ نیک دل اور پاکباز خاتون آخر تک اپنے شوہر کے علمی اور دینی کاموں میں شریک رہی اور اس کی محبت اور ہمدردی ہمیشہ مارمیڈیوک کے لیے بہت بڑی نعمت ثابت ہوئی۔

۱۹۲۴ء میں مارمیڈیوک کو اعلیٰحضرت نظامِ دکن نے اپنی ریاست کے محکمۂ تعلیم میں ملازمت عطا کرکے چادرگھاٹ سکول کا ہیڈ ماسٹر مقرر کردیا اور ایک نہایت اعلیٰ سہ ماہی رسالہ اسلامک کلچر بھی اُس کی ایڈیٹری میں شائع ہونا شروع ہوا۔

نظام ہی کی سرپرستی میں مارمیڈیوک نے قرآنِ مجید کا ترجمہ انگریزی میں کرنا شروع کیا اور جب مکمل ہوگیا تو سرکارِ نظام کی طرف سے اُس کو دو سال کی رخصت عطا کی گئی کہ مصر جاکر جامعہ ازہر اور دیگر علمائے اسلام سے اپنے ترجمے کے بارے میں مشورہ کرے۔ اور اگر کہیں اصلاح کی ضرورت ہو تو وہ بھی کی جائے۔ بالآخر دسمبر ۱۹۳۰ء میں یہ ترجمہ زیورِ طباعت سے آراستہ ہوکر شائع ہوا۔

۱۹۳۵ء میں مارمیڈیوک کو حکومتِ نظام نے پنشن عطا کی تو وہ ہندوستان کو خیرباد کہہ کر واپس انگلستان آگیا۔ یہاں آکر بھی اُس نے تبلیغِ اسلام کا کام جاری رکھا اور اکثر علمی مجالس میں اسلام پر تقریریں کیں۔ قرآنِ مجید کے انگریزی ترجمے کے علاوہ بھی مارمیڈیوک نے بہت سا علمی اور ادبی کام کیا ہے اور دس بارہ نہایت اعلیٰ پائے کے ناول بھی لکھے ہیں ۱۹ مئی ۱۹۳۶ء کو اُس کا یکایک حرکتِ قلب بند ہوجانے سے انتقال ہوگیا۔

لندن ۱۹۶۵ء

لندن کی ایشیائی انجمنیں

جب دو مختلف قومیں آپس میں ملتی ہیں تو اُن کا باہمی طور پر متاثر ہونا ضروری ہے۔ متاثر نہ ہوں تو بھی ایک دُوسرے کو سمجھنے کی کوشش ضرور کرتی ہیں۔ اس باہمی افہام و تفہیم سے، یہ خوش گوار نتیجہ نکلتا ہے کہ بسا اوقات تعصبات کے تاریک سائے چھٹ جاتے ہیں اور جوں جوں ربط و ضبط بڑھتا ہے۔ ایک قوم دُوسری قوم کی تہذیب، معاشرت، اور تاریخ سے اِستفادہ کرنے کی کوشش بھی کرتی ہے۔

آج سے تین سو سال پہلے جب انگلستان کے تاجروں کو مشرقی ممالک میں قدم رکھنے کا موقع ملا۔ تو ابتدائی گھبراہٹ اور پریشانی کے بعد اُنھوں نے بھی اہلِ مشرق کے رسم و رواج، تہذیب و تمدن اور مذہبی عقائد کو سمجھنے کی کوشش کی۔ اِس میں کوئی شک نہیں کہ آہستہ آہستہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے

تاجر ہندوستان کے حکمران بھی بن گئے تھے۔ لیکن انگلستان کے علمی طبقے میں مشرقی علوم کی خدمت کا جو شغف پیدا ہوا تھا وہ کم ہونے کی بجائے روز بروز بڑھتا گیا۔ اِس شغف کی بِنا پر متعدد انگریزوں نے ایسی انجمنیں قائم کیں جن کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ اہلِ مغرب کو مشرقی علوم سے آشنا کیا جائے۔

میں اس وقت صرف چار ایسی انجمنوں کا ذکر کروں گا۔ سب سے پہلے رائل ایشیاٹک سوسائٹی آف گریٹ برٹن اینڈ آئرلینڈ کا نام آتا ہے، جو ۱۸۲۳ء میں قائم ہوئی تھی۔ اِس کے بانی کا نام ہنری کول بروک تھا۔ جو ۱۷۸۲ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی ملازمت اختیار کر کے ہندوستان چلا گیا تھا۔ اکاؤنٹنٹ اور اسسٹنٹ کلکٹر کے ابتدائی عہدوں سے ترقی کرتے کرتے وہ جج اور سفیر کے منصب پر پہنچ گیا۔ اور آخر کار ۱۸۰۰ء میں اُسے گورنر جنرل کی ایگزیکٹو کونسل کا رُکن مقرر کیا گیا۔ جس سے بڑا سرکاری اعزاز اُس زمانے میں کوئی نہیں تھا۔

کول بروک کو ویدوں پر فاضلانہ عبور تھا۔ اور اِن صحائف کے ایک ایک لفظ کا اُس نے بغور مطالعہ کیا تھا۔ چنانچہ سنسکرت کے نقادوں، اور ہندو دھرم کے طالب علموں کی رائے ہے کہ کول بروک نے ویدوں پر جو تنقید لکھی تھی۔ وہ اپنے موضوع کے اعتبار سے ایک شاہکار کی حیثیت رکھتی ہے۔

سنسکرت کے علاوہ کول بروک کو ریاضی، علمِ ہیئت، علم النباتات، علم الحیوانات اور معدنیات میں بھی فضیلت کا مرتبہ حاصل تھا۔ ہندوستان میں بتیس سال ملازمت کرنے کے بعد وہ ۱۸۱۵ء میں واپس انگلستان آگیا۔ اور

یہاں پہنچ کر اُس نے سنسکرت کی تمام کتابیں جن کی تعداد دو ہزار کے قریب تھی انڈیا آفس لائبریری کو مُفت نذر کر دیں۔

ایشیاٹک سوسائٹی قائم ہونے کے ایک سال بعد برطانیہ کے بادشاہ جارج چہارم نے اُسے منشورِ شاہی عطا فرمایا۔ چنانچہ اُس وقت سے سوسائٹی کے نام کے ساتھ رائل کا لفظ استعمال کیا جا رہا ہے۔ پُورے یورپ میں صرف پیرس کی ایشیائی سوسائٹی برطانیہ کی اس سوسائٹی سے پرانی ہے۔ لیکن دونوں کی عمر میں کچھ زیادہ فرق نہیں۔ پیرس کی سوسائٹی صرف ایک سال پہلے قائم ہوئی تھی۔

قیام کے چار سال بعد سوسائٹی کے اعزازی ممبروں میں شاہِ اودھ، ڈیوک آف یارک، ولی عہد ایران اور مہاراجہ تنجور جیسے لوگ شامل تھے اِس کے علاوہ مقامی ممبروں کی تعداد پونے چار سو تک پہنچ گئی تھی۔ ۱۸۷۴ء میں مستشرقین کی بین الاقوامی کانگرس کا اجلاس لندن میں ہُوا تھا تو میزبانی کے فرائض رائل ایشیاٹک سوسائٹی نے ادا کئے تھے۔

۱۸۲۸ء میں سوسائٹی نے ایک دار الترجمہ قائم کیا۔ تاکہ عربی، فارسی اور سنسکرت کے مخطوطات حاصل کر کے اُن کا انگریزی میں ترجمہ کیا جائے۔ بادشاہِ انگلستان نے اُس کی سرپرستی قبول فرمائی۔ جو سوسائٹی کے لیے بہت بڑا اعزاز تھا۔

سوسائٹی کے حلقۂ رکنیت میں اس وقت آٹھ سو آدمی شامل ہیں، جن میں سے بعض ممبر ہیں۔ اور بعض فیلو کہلاتے ہیں۔ رکنیت کا سالانہ چندہ تین گنی

ہے۔ لیکن برطانیہ سے باہر رہنے والوں کے لیے اِس میں کچھ تخفیف کر دی گئی ہے۔

اکتوبر سے لے کر جون تک، مہینے میں دو دفعہ، سوسائٹی کے زیرِ اہتمام، کسی مشہور و معروف شخص کا لیکچر ہوتا ہے اور ان لیکچروں کے لیے ایسا موضوع منتخب کیا جاتا ہے۔ جس کا تعلق ایشیائی مسائل سے ہو۔ گذشتہ سال، جن لوگوں نے لیکچر دیئے تھے، ان میں ایک مسٹر برٹن پیج تھے جنھوں نے سلاطینِ دہلی کے عہد کی مساجد پر تقریر کی تھی۔ ڈاکٹر ٹنکر نے پاکستان میں دستور سازی کے مسائل پر اظہارِ خیال کیا تھا۔ مسٹر میریڈتھ کی تقریر کا موضوع تھا، ترکوں کی مصوری، اور ڈاکٹر ہیک نے بھارت کے لوک گیتوں پر لیکچر دیا تھا۔

سوسائٹی کے جملہ مصارف، کچھ تو ممبروں کے چندے سے ادا کئے جاتے ہیں۔ اِس کے علاوہ بعض مخیر اصحاب بھی وامے درمے مدد کرتے رہتے ہیں۔ گذشتہ سال بھارت، پاکستان، ملایا اور سنگاپور کی حکومتوں نے بھی سوسائٹی کی مالی مدد کی تھی۔ سوسائٹی کا پچھلا سالانہ اجلاس ۱۰ مئی ۱۹۶۲ء کو ہوا تھا۔ جہاں سوسائٹی کے صدر سر رچرڈ ونسٹٹ نے سوسائٹی کی علمی خدمات کا ذکر کرتے ہوئے کہا تھا کہ حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ علم حاصل کرو۔ خواہ تمھیں چین تک جانا پڑے۔ پس ہماری سوسائٹی بھی ۱۳۹ سال سے مشرق کی تاریخ، زبان، مذہب اور فنونِ لطیفہ کی تحقیق اور مطالعہ میں منہمک ہے اور یہی مطالعہ اُس کی زندگی کی غرض و غایت ہے۔

سوسائٹی کے دفتر میں ایک بہت بڑی لائبریری بھی ہے جس میں ۴۵ ہزار

کتابیں موجود ہیں۔ فارسی، عربی، ترکی، سنسکرت، چینی، نیپالی زبانوں کے جن قدیم مخطوطات کو انگریز مستشرقین نے مرتب و مدون کیا تھا۔ ان کی جلدیں یہاں رکھی ہیں۔ فردوسی کے شاہنامے کے کم از کم بیس مختلف نسخے تو میں نے دیکھے ہیں۔ اسی طرح بہارستانِ جامی اور سعدی کی گلستان کے بھی متعدد نسخے میری نظر سے گزرے ہیں۔

سوسائٹی کا ایک سہ ماہی رسالہ بھی انگریزی میں نکلتا ہے جس میں ایشیا کی تاریخ، تہذیب اور علوم و فنون پر بڑے بلند پایہ مضامین شائع ہوتے ہیں۔ سوسائٹی کے ممبروں کو یہ رسالہ مفت بھیجا جاتا ہے۔ ہر تین سال کے بعد سوسائٹی کی طرف سے ایک سونے کا تمغہ انعام دیا جاتا ہے۔ اس مرتبہ یہ تمغہ ولاڈی میئر، می تورسکی کو عطا ہوا ہے۔ جو روسی نژاد ہیں۔ لیکن اپنی ساری عمر انھوں نے فارسی ادب کی خدمت میں صرف کی ہے۔

دوسری انجمن رائل سنٹرل ایشین سوسائٹی ہے جو ۱۹۰۱ء میں قائم ہوئی تھی۔ اس کا دفتر لندن کی اورنج سٹریٹ میں واقع ہے اور صدر کا نام سر ولیم ڈکسن ہے۔ ایک مجلس انتظامیہ بھی ہے جس کی صدارت سر رچرڈ گیل کے سپرد ہے۔ رکنیت کی سالانہ فیس دو پونڈ ہے۔ لیکن انگلستان سے باہر رہنے والوں سے ڈیڑھ پونڈ وصول کیا جاتا ہے۔ اس وقت ممبروں کی تعداد ۱۶۰۰ کے قریب ہے۔ جن میں ہر طبقے کے لوگ شامل ہیں۔ سوسائٹی کے ذیلی دفاتر بحرین، ہانگ کانگ، ہندوستان، ایران، ملایا، پاکستان، عراق اور اسرائیل میں بھی موجود ہیں ـــــ مہینے میں دو مرتبہ سوسائٹی کے زیر اہتمام لکچر بھی ہوتے ہیں۔

جن کا موضوع ایشیا اور مشرقِ وسطیٰ سے تعلق رکھنے والے مسائل ہوتے ہیں۔ لکچروں کے لیے انہی اصحاب کو مدعو کیا جاتا ہے جو اپنے اپنے موضوعات پر مکمل عبور رکھتے ہیں۔

سوسائٹی کی طرف سے ایک علمی رسالہ بھی جاری ہے جس کے سال بھر میں تین نسخے شائع کئے جاتے ہیں۔ ہر پرچے میں نہایت بلند پایہ مضامین چھپتے ہیں۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ جو تقریریں سوسائٹی کے جلسوں میں ہوتی ہیں۔ بعد کو انھیں پرچے میں بھی شائع کر دیا جاتا ہے۔ تازہ شمارے میں ایک مضمون افغانستان اور صوبہ سرحد کی سیاحت پر، دوسرا ۱۹۳۷ء کے سعد آباد پیکٹ پر، تیسرا تبت پر، چوتھا عدن، پانچواں ملایا، چھٹا سوویٹ روس کی اسلامی جمہوریتوں اور ساتواں منگولیا پر شائع ہوا ہے۔ سوسائٹی کے دفتر میں ایک خاصی بڑی لائبریری ہے جس سے ان لوگوں کو بھی استفادہ کرنے کی اجازت ہے جو باقاعدہ ممبر نہیں ہیں۔

سوسائٹی کی طرف سے ہر سال دو تمغے بطور انعام ان اشخاص کو دیئے جاتے ہیں جنھوں نے اپنی تقریر و تحریر سے ایشیا اور مشرقِ وسطیٰ کے متعلق بہتریں معلومات مہیا کی ہوں۔

تیسری انجمن کا نام ہے ایسٹ انڈیا ایسوسی ایشن، جو ۱۸۶۶ء میں قائم ہوئی تھی۔ اس کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ آئینی اور جائز طریقوں سے اہلِ ہند کی مدد کی جائے۔ ظاہر ہے کہ یہ مقصد اپنی نوعیت کے اعتبار سے اتنا وسیع تھا کہ اس میں ہندوستان کی مادی۔ اخلاقی اور علمی امداد کا ہر پہلو شامل کیا جا سکتا تھا۔ اس انجمن کے بانیوں میں دادا بھائی نوروجی بھی شامل تھے جو پارسی ہونے

کے باوجود، اپنے زمانے میں، ہندوستان کے سب سے بڑے لیڈر خیال کئے جاتے تھے۔ جن نامور لوگوں نے وقتاً فوقتاً اس ایسوسی ایشن کے جلسوں میں تقریریں کی تھیں۔ اُن میں لارڈ مارلے۔ لارڈ کرزن۔ لارڈ برائس اور جان بر ائٹ بھی شامل تھے۔

ایسوسی ایشن کا دفتر ٹیمپل کے علاقے میں واقع ہے۔ اور ممبروں کی تعداد ساڑھے سات سو کے قریب ہے۔ رکنیت کا سالانہ چندہ ایک پونڈ پانچ شلنگ ہے۔ ایسوسی ایشن کا ایک سہ ماہی رسالہ ایشین ریویو کے نام سے نکلتا ہے جو ممبروں کو مفت بھیجا جاتا ہے۔ ۱۹۴۷ء کے بعد سے ایسوسی ایشن نے اپنے دائرۂ عمل میں بھارت۔ پاکستان اور برما کو شامل کیا ہے۔ حکومتِ پاکستان سے ایسوسی ایشن کو ایک سو پونڈ سالانہ مدد ملتی ہے۔ یوں بھی اکثر موقعوں پر برطانیہ کی پاکستان سوسائٹی اور ایسٹ انڈیا ایسوسی ایشن کے مشترکہ اجلاس منعقد ہوتے رہتے ہیں۔

میرے نزدیک ایسوسی ایشن کا سب سے مفید سرمایہ وہ مطبوعہ تقریریں ہیں جو ۱۸۶۶ء سے لے کر ۱۹۴۷ء تک وقتاً فوقتاً اُس کے جلسوں میں ہوتی رہی ہیں۔ یہ تمام ذخیرہ یہاں موجود ہے۔ پاکستان اور بھارت کے طلبہ کوشش کریں تو اس ذخیرے کی چھان پھٹک سے بڑا قیمتی تاریخی مواد میسر آسکتا ہے۔

چوتھی انجمن جس کا میں ذکر کرنا چاہتا ہوں رائل انڈیا۔ پاکستان۔ سیلون سوسائٹی ہے۔ ۱۹۱۲ء میں جب یہ انجمن قائم کی گئی تھی اُس کا نام انڈیا سوسائٹی تھا اس کے بانیوں میں ٹامس آرنلڈ۔ ڈبلیو بی ییٹس۔ رابندر ناتھ ٹیگور۔

ولیم راٹن سٹائین جیسے مشاہیر شامل تھے۔ اِس سوسائٹی کا تعلق زیادہ تر پاکستان۔ بھارت اور سیلون کے فنونِ لطیفہ سے ہے۔ موسیقی، مصوری۔ سنگتراشی اور شاعری اِس کے خاص موضوع ہیں۔ جب علامہ اقبال گول میز کانفرنس میں شرکت کے لیے ۱۹۳۱ء میں لندن آئے تھے تو اِس سوسائٹی نے اُن کے اعزاز میں ایک جلسہ کیا تھا جہاں علامہ مرحوم اور مسز سروجنی نیڈو نے اپنا کلام سُنایا تھا۔

لندن ۱۹۶۲ء

رُوحانیات کی تحریک

ہستیٔ باری تعالیٰ اور حیاتِ بعد الموت کا عقیدہ ہر مذہب کا بنیادی جزو ہے۔ اِس خاکدانِ ارضی کی زندگی ختم کرنے کے بعد انسان کو حیاتِ ابدی حاصل ہوتی ہے۔ اقبال نے اِس حقیقت کو کس خُوب صورت پیرائے میں بیان کیا ہے ؎

موت کو سمجھے ہیں غافل اختتامِ زندگی
ہے یہ شامِ زندگی، صبحِ دوامِ زندگی

یہی وجہ ہے کہ بڑے بڑے عالی خیال اور برگزیدہ لوگ موت سے بالکل نہیں ڈرتے۔ خود اقبال کے متعلق مشہور ہے کہ اپنے انتقال سے چند گھنٹے قبل جب اُن کے تیمارداروں نے اضطراب اور پریشانی کا اظہار کرنا شروع کیا تو علامہ مرحوم نے اطمینان سے فرمایا کہ میں مسلمان ہوں۔ میں موت سے نہیں ڈرتا۔ میرے درد کا

ایک شعر ہے ؎

موت اک زندگی کا وقفہ ہے
یعنی آگے چلیں گے دم لے کر

اِس کا مطلب یہ ہے کہ زندگی ایک غیر منقطع تسلسل ہے اور موت سے اِس تسلسل کی صرف ہیئت بدل جاتی ہے۔ یعنی ہمارا جسم تو خاک میں مل کر خاک ہو جاتا ہے۔ لیکن رُوح اس قفسِ عنصری سے آزاد ہو کر حیاتِ جاوداں حاصل کر لیتی ہے۔

کیا مرے ہُوئے انسانوں کی رُوحیں پھر بھی اِس دُنیا میں آتی اور ہمارے دُکھ درد میں شریک ہوتی ہیں؟ کیا یہ رُوحیں، جن کو ہم اپنی چشمِ ظاہر بیں سے دیکھ نہیں سکتے، ہمارے رنج و غم سے باخبر رہتی ہیں؟ یہ بہت مشکل اور پیچیدہ سوال ہیں۔ جن کا تسلی بخش جواب دینا آسان نہیں۔

اِنگلستان میں گذشتہ سو سال سے ایک تحریک چل رہی ہے جس کو (SPIRITUALIST MOVEMENT) یعنی رُوحانیات کی تحریک کہا جاتا ہے۔ جو لوگ اِس تحریک سے وابستہ ہیں اُن کا خیال ہی نہیں بلکہ عقیدہ ہے کہ ہمارے عزیزوں، دوستوں اور غم گساروں کی رُوحیں ہر وقت ہم سے رابطہ استوار کرنے اور ہم کلام ہونے کے لیے بے تاب رہتی ہیں، لیکن مرئی اور غیر مرئی، مادی اور روحانی دنیا میں جو فرق ہے وہ راستے میں حائل ہوتا ہے۔ اگر اس فرق پر کسی طرح قابو پا لیا جائے تو روحوں سے ملنا، ہم کلام ہونا اور اِستفادہ کرنا چنداں مشکل نہیں۔

ہم میں سے اکثر لوگوں نے ایسے واقعات سنے ہوں گے کہ بعض مکانوں میں یکایک بغیر کسی ظاہری سبب کے شور و غوغا ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ کواڑ کھڑکھڑانے ہیں۔ چیخیں سنائی دیتی ہیں، تالیاں بجتی ہیں اور برتن الماریوں سے خود بخود نکل کر فرش پر گرنے لگتے ہیں۔ آج سے سو سوا سو سال پہلے انگلستان کے ایک دور افتادہ گاؤں میں اسی قسم کا واقعہ پیش آیا۔ جو لوگ اس مکان میں رہتے تھے۔ وہ بچارے سخت پریشان ہوئے۔ پولیس کو اطلاع کی گئی لیکن پولیس والے بھی جستجو کرنے کے بعد تھک ہار کر بیٹھ گئے۔ کسی کی سمجھ میں نہیں آتا تھا دور دور سے لوگ اس گاؤں میں یہ تماشا دیکھنے آتے تھے۔ آخر کسی شخص نے مشورہ دیا۔ کہ فلاں جگہ ایک جھاڑ پھونک کرنے والا سیانا رہتا ہے اس کو بلاؤ، چنانچہ وہ سیانا بلایا گیا۔ اور اس نے دم پھونک کر بتایا کہ اس مکان میں آج سے اتنے سال پہلے ایک شخص قتل ہو گیا تھا۔ اس کی روح مضطرب اور بے قرار ہو کر یہاں آتی ہے۔ گاؤں کے بڑے بوڑھوں نے اس قتل کی واردات کی تصدیق کی۔

اس واقعہ کا ملک بھر میں اتنا چرچا ہوا کہ تمام بڑے بڑے شہروں مثلاً لندن، ایڈنبرا، مانچسٹر، کارڈف وغیرہ کے پڑھے لکھے لوگوں نے جن میں پروفیسر، ڈاکٹر اور سائنس دان بھی شامل تھے۔ اس طرف بڑی سنجیدگی سے توجہ کی۔ یہیں سے روحانیات کی باقاعدہ تحریک انگلستان میں شروع ہوئی۔

مشہور سائنس دانوں میں سے، جس نے سب سے پہلے اس تحریک میں حصہ لیا۔ وہ ڈاکٹر رسل ویلیس تھا۔ جو نظریۂ ارتقا کے بانی چارلس ڈارون کا شریک کار

رہ چکا تھا۔ ڈاکٹر ویلس کے زمانے میں ایک عورت مسز مارشل نے یہ دعویٰ کیا تھا کہ مختلف لوگوں کی روحیں اُس کے اندر حلول کر جاتی ہیں اور وہ مرے ہوئے لوگوں کے پیغام، ان کے عزیز و اقارب کو پہنچا سکتی ہے۔ ڈاکٹر ویلس نے اس دعوے کی خوب چھان بین کی۔ اور اس عورت کی روحانی، ذہنی اور نفسیاتی کیفیت کا بغور جائزہ لینے کے بعد اس دعوے کی تصدیق کی۔

ڈاکٹر ویلس کے بعد جو بڑے بڑے سائنس دان اس تحریک کے علمبردار بنے۔ ان میں سر ولیم کرکس۔ سر ڈبلیو ایف۔ بیرٹ۔ لارڈ ریلے وغیرہ شامل ہیں۔ یہ تینوں اصحاب رائل سوسائٹی کے فیلو تھے۔ سر ولیم کرکس تو کیمیکل سوسائٹی اور برٹش ایسوسی ایشن جیسے اداروں کے صدر بھی تھے۔ لارڈ ریلے فزکس کے بڑے نامور عالم اور کیمبرج یونیورسٹی کی لیبارٹری کے ڈائرکٹر تھے۔

ان لوگوں کی کوشش سے ایک انجمن قائم ہوئی جس کا مقصد یہ تھا کہ سائنٹیفک ذرائع سے روح کی ماہیت۔ انسان کے تحت الشعور کی کیفیت۔ نفسِ انسانی کے پُراسرار اور حیرت انگیز تصرفات۔ مسمریزم اور ہپناٹزم کے کرشموں اور مابعد الطبیعاتی قوتوں کی باقاعدہ ریسرچ کی جائے۔ اس پروگرام میں یہ چیز بھی شامل تھی کہ ارواحِ خبیثہ کی ماہیت معلوم کرنے کی بھی کوشش کی جائے کہ آیا جن بھوت اور چڑیل کی قسم کی مخلوق موجود ہے یا نہیں۔

جونہی یہ تحریک شروع ہوئی چاروں طرف سے مخالفت کا طوفان امڈ آیا، ڈاکٹروں، سائنس دانوں اور کلیسا کے پادریوں نے شور مچایا کہ علم الارواح کے علمبردار قوم کو گمراہ کر رہے ہیں۔ پادریوں نے اسے الحاد اور زندقہ سے تعبیر

کیا اور سائنس دانوں نے اُسے محض خرافات قرار دیا۔ لیکن اِس کے باوجود یہ تحریک روز بروز ترقی کرتی گئی۔ آخر انگلستان کے ایک بہت بڑے فاضل فریڈرک مائرز کی معرکتہ الآراء کتاب Human Personality and its survival of Body Death شائع ہوئی۔ جس نے فلسفے، سائنس اور نفسیات کی دُنیا میں اس نئی تحریک کے پرچم کو خاصا بلند کر دیا۔

بیسویں صدی کے اوائل میں انگلستان کے جن نامور لوگوں نے رُوحانیات کی تفتیش و جستجو اور ترقی میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا۔ اُن میں سر آرتھر کانن ڈائل۔ سر آلیور لاج۔ ڈاکٹر کرافرڈ۔ ڈاکٹر ہیسٹنگز وغیرہ شامل ہیں۔ یہ لوگ علم و فضل کے اعتبار سے عالمگیر شہرت کے مالک تھے اور دنیا کے ہر حصّے میں آج بھی ان کا ذکر عزت و احترام سے کیا جاتا ہے۔ سر آرتھر کانن ڈائل وہی شخص ہے جس نے شرلک ہومز کی جاسوسی کہانیاں لکھ کر مشرق و مغرب کے ادبی حلقوں کو اپنا گرویدہ بنا لیا تھا۔ اور سر آلیور لاج کو کون نہیں جانتا۔ یہ شخص دورِ حاضر کے سب سے بڑے سائنس دانوں میں شمار ہوتا ہے۔ جس تن دہی، یکسوئی اور گرم جوشی سے سر آلیور لاج نے رُوحانیات کی تحریک میں حصّہ لیا، اس کی مثالیں بہت کم ملتی ہیں۔

اِس وقت بھی بعض نہایت قابل، روشن دماغ اور بلند پایہ اصحاب اس تحریک میں شامل ہیں۔ جو شب و روز اپنے کام میں مصروف رہتے ہیں۔ ابتدائی مخالفت ختم ہو چکی ہے۔ اگرچہ شک و شبہ کا وجود ہنوز باقی ہے۔ کلیسا نے

بھی اپنے رویّے میں بہت کچھ تبدیلی کر لی ہے۔ اور اکثر پادری اِس تحریک کے حامی اور معاون بن گئے ہیں۔

انگلستان میں بہت سی انجمنیں روحانیات کی خدمت اور تبلیغ کا کام کر رہی ہیں۔ سب سے بڑی انجمن لندن میں ہے جس کا نام Spiritualist Association of great Britain ہے۔ اس کے عہدیداروں اور کارکنوں میں بعض بڑی مشہور شخصیتیں شامل ہیں۔ رکنیت کا سالانہ چندہ ڈیڑھ پونڈ ہے۔ انجمن کا صدر دفتر بلگریو سکوئر کی ایک شاندار عمارت میں ہے۔

رُوحانیات کی موجودہ تحریک میں جتنی انجمنیں اس وقت مصروفِ عمل ہیں۔ اُن کے پروگرام میں تین چیزیں نمایاں حیثیت رکھتی ہیں۔ ایک کا تعلق بیماروں کے علاج سے ہے۔ اِس تحریک کے علمبرداروں کا خیال ہے کہ بہت سے مزمن بلکہ ناقابلِ علاج امراض کو روحانی علاج سے شفا ہو سکتی ہے، دُور دُور سے بیمار ان کے پاس آتے ہیں۔ اور رُوحانی طبیب اپنی توجہ سے اُن کا علاج کرتا ہے۔ یہ معاملہ بڑا پیچیدہ ہے اور وثوق سے نہیں کہا جا سکتا کہ حقیقت کیا ہے۔ بعض ڈاکٹر قطعی انکار کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ تمام ڈھونگ ہے کبھی کوئی مریض اِس طرح تندرست نہیں ہو سکتا۔ کہ صرف اُس کے جسم پر آہستہ آہستہ ہاتھ پھیرا جائے، یا زیرِ لب کچھ پڑھ کر پھونک دیا جائے۔ مثلاً کسی شخص کے پھیپھڑے میں سرطان یا گردے میں پتھری ہے تو صرف ہاتھ پھیرنے سے سرطان یا پتھری کا ازالہ نہیں ہو سکتا۔

اِس کے برعکس بعض زندہ شہادتیں اِس ملک میں موجود ہیں کہ بڑے

بڑے ہسپتالوں کے علاج سے فائدہ نہ ہوا۔ اور ڈاکٹروں نے ناقابلِ علاج سمجھ کر جواب دے دیا۔ لیکن اُنہی مریضوں کو رُوحانی معالج کی توجہ نے شفائے کامل عطا کی۔ آئے دن اس موضوع پر حیرت انگیز کتابیں چھپ رہی ہیں۔ جن میں اُن لوگوں کی مصدقہ روئداد درج ہوتی ہے۔ جو روحانی علاج سے شفایاب ہوئے۔

پروگرام کا دُوسرا حصّہ مُردوں کی روحوں سے ہمکلام ہونا ہے۔ یہ معاملہ روحانی علاج سے بھی زیادہ پُراسرار ہے۔ مروّجہ قاعدہ یہ ہے کہ معمول جسے انگریزی میں میڈیم کہتے ہیں۔ اسٹیج کے اُوپر بیٹھ جاتا ہے۔ اور اس پر ایک غنودگی سی طاری ہوتی ہے۔ پھر وہ یکایک کہتا ہے کہ اِس وقت فلاں شخص کی روح کمرے میں موجود ہے۔ اور حاضرین میں سے فلاں فلاں کو یہ پیغام دیتی ہے۔ جس شخص کے نام یہ پیغام ہو۔ اگر وہ کمرے میں موجود ہے تو اس بات کی تصدیق کرتا ہے۔ کہ واقعی یہ پیغام جو روح نے دیا ہے میرے فلاں عزیز یا دوست کی روح کا ہے جسے مرے ہوئے اِتنا عرصہ گزر چکا ہے۔

میں اس بارے میں قطعی کچھ نہیں کہہ سکتا کہ یہ مُردوں کی روحوں کا آنا۔ اور یُوں اپنے عزیزوں کو پیغام دینا کوئی حقیقت اور سچائی رکھتا ہے یا نہیں۔ اکثر میڈیم ایسے پکڑے جا چکے ہیں جو سراسر مکر و فریب کے پُتلے تھے۔ اور جن کا سارا کاروبار ایک چالبازی سے زیادہ نہ تھا۔ اِس کے برعکس بیسیوں نہیں سیکڑوں واقعات ایسے بھی ہیں کہ نہایت ثقہ، راست باز اور دیانت دار لوگوں نے اعتراف کیا ہے کہ اُن کے مرے ہوئے عزیزوں نے فلاں میڈیم کی

معرفت جو پیغام بھیجا تھا۔ وہ من وعن صحیح تھا۔

بقاءِ رُوح کے تو ہم سب قائل ہیں اور مانتے ہیں کہ موت کے بعد جسم گل سڑ جاتا ہے اور رُوح زندہ رہتی ہے۔ لیکن انگلستان کی اس تحریکِ رُوحانیات نے ارواح کے یہاں آنے اور میڈیم کے توسل سے ہمارے ساتھ ہم کلام ہونے کے جو تجربات و مشاہدات پیش کئے ہیں۔ وہ ایک ایسی انوکھی داستان ہے جس پر اعتبار کرنا بھی مشکل ہے اور اعتبار نہ کرنا بھی مشکل۔

چارلس بریڈلا

جس کے نام سے لاہور کا بریڈلا ہال منسوب ہے

جن لوگوں نے اگست ۱۹۴۷ء سے پہلے کا لاہور دیکھا ہے۔ اُنھیں معلوم ہوگا کہ وہاں کی ایک مشہور و معروف عمارت کا نام بریڈلا ہال ہے۔ وہ عمارت تو بلاشبہ آج بھی موجود ہے اور نام بھی اُس کا وہی ہے لیکن وہ سیاسی جلسے اور جلوس وہ انقلابی محفلیں اور جوش و خروش کے ہنگامے، جو اِس عمارت سے وابستہ تھے۔ ماضی میں دفن ہو چکے ہیں اور صرف اُن کی یاد گنتی کے چند لوگوں کے ذہن میں باقی رہ گئی ہے۔

اکثر لوگ پوچھتے ہیں کہ بریڈلا کون تھا جس کے نام سے یہ عمارت منسوب کی گئی؟ اُن کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ یہ شخص چارلس بریڈلا تھا جو ۱۸۳۳ء

میں انگلستان کے ایک غریب گھرانے میں پیدا ہوا تھا۔ افلاس کی وجہ سے اُسے بارہ ہی سال کی عمر میں اسکول چھوڑ دینا پڑا۔ اور پیٹ پالنے کے لیے اول اُسے ایک سالسٹر کے دفتر میں چپراسی کا کام کرنا پڑا۔ دو سال کے بعد وہاں سے نکلا تو ایک تجارتی فرم میں کلرک کی اسامی مل گئی۔

یہ زمانہ انگلستان میں خاصی قدامت پرستی بلکہ اوہام پرستی کا تھا۔ مذہب کا چاروں طرف دور دورہ تھا اور عوام پر کلیسا کا بڑا دبدبہ تھا۔ چارلس بریڈلا کے دل میں مروجہ مذہب کے خلاف بہت سے شکوک پیدا ہوئے۔ تو اُس نے اپنے قصبے کے پادری سے وقتاً فوقتاً تبادلۂ خیال کرنا شروع کیا۔ اِس بحث مباحثے نے آہستہ آہستہ ایسی تلخی اختیار کر لی کہ پادری اور بریڈلا میں باقاعدہ جنگ ٹھن گئی۔ پادری نے بریڈلا کے خلاف قصبے کے باشندوں کو اس قدر برانگیختہ کیا کہ اُس غریب کو گھر بار چھوڑ کر پردیس میں ایک دوست کے ہاں پناہ لینا پڑی۔

روٹی کمانے کا مسئلہ بھی درپیش تھا۔ چنانچہ دسمبر ۱۸۵۰ء میں بریڈلا فوج میں بھرتی ہو گیا۔ لیکن تین سال کے بعد فوج کی ملازمت سے استعفا دے کر دوبارہ لندن کے ایک سالسٹر کے دفتر میں نوکری کر لی۔ جہاں چند سال کے بعد اُسے دفتر کا منیجر بنا دیا گیا۔ اِس ملازمت سے بریڈلا کو یہ فائدہ ہوا کہ اُس نے محض اپنی ذاتی کوشش اور مطالعہ سے قانون پر اس قدر عبور حاصل کر لیا کہ بڑے بڑے بیرسٹر، بعض اوقات نجی طور پر اُس سے مشورہ کرنے سے دریغ نہ کرتے تھے۔ یوں بھی بریڈلا کو کتب بینی اور مطالعہ کا بے حد شوق تھا۔ اور انگریزی کے

علاوہ فرانسیسی - جرمن - یونانی، عربی زبانوں پر بھی اُسے اچھی خاصی قدرت حاصل تھی -

بریڈلا کا بنیادی عقیدہ یہ تھا کہ مذہب کے جبر اور عاقبت کے خوف کے بغیر بھی انسان اپنے اندر اعلیٰ اخلاق پیدا کر سکتا ہے - بلکہ صحیح تر یہ ہے کہ اچھے کام کرنا اس لیے ضروری نہیں کہ اُن کے بدلے میں مرنے کے بعد جنت ملے گی۔ اور بُرے کاموں سے اجتناب کرنے کی وجہ یہ نہیں - کہ ان کی سزا دوزخ ہے بلکہ نیکی بجائے خود غرض و غایت اور مقصودِ حیاتِ انسانی ہے - قطع نظر اس سے کہ مذہب اور جزا و سزا کا عقیدہ اس بارے میں کیا ہے -

بریڈلا نے اس موضوع پر عام تقریریں کرنا شروع کیں اور تعطیل کے دن وہ لندن سے باہر دوسرے شہروں میں جا کر بھی بڑے بڑے جلسوں سے خطاب کرتا تھا۔ قدرت نے اُسے خوب زورِ بیان عطا کیا تھا - اِس کے علاوہ ذاتی کوشش سے بھی اس نے فنِ تقریر میں بڑی مہارت پیدا کر لی تھی -

آہستہ آہستہ اُس کی مقبولیت میں اضافہ ہونا شروع ہوا - بالخصوص مزدوروں غریبوں اور محنت کشوں کے طبقے میں - تو اُسے ایک ہیرو کی حیثیت حاصل ہو گئی تھی - عجیب بات ہے کہ جہاں جہاں چارلس بریڈلا کو مقبولیت حاصل ہوتی - وہاں کے سرمایہ دار اور پادری اس کی جان کے دشمن بن جاتے تھے -

چارلس بریڈلا نے کھلے بندوں مذہب سے انحراف ہی نہیں بلکہ بیزاری اور بے تعلقی کا اعلان کر دیا اور اس غرض کے لیے ایک رسالہ نیشنل ریفارمر کے نام سے جاری کیا - سیاسیات میں بھی وہ انتہا پسند تھا اور بادشاہت کے

سخت خلاف تھا اور چاہتا تھا کہ برطانیہ کو موروثی بادشاہت کے وجود سے آزاد کر کے ایک ری پبلک بنا دیا جائے۔

۱۸۷۴ء میں اُس کی ملاقات مسز اینی بسنٹ سے ہوئی اور آئندہ تیرہ سال تک وہ دونوں یک جان دو قالب کی حیثیت سے سیاسی۔ مذہبی اور معاشرتی کاموں میں ایک دوسرے کے شریک کار رہے۔ اسی زمانے میں بریڈلا نے ضبطِ تولید پر ایک رسالہ شائع کیا تو اُسے گرفتار کر کے باقاعدہ مقدمہ چلایا گیا۔

آج برطانیہ ہی نہیں بلکہ دنیا بھر میں ضبطِ تولید کا پراپیگنڈا ہو رہا ہے اور اس پراپیگنڈے کو حکومتوں کی امداد اور سرپرستی حاصل ہے لیکن کسے معلوم ہے کہ آج سے نوّے سال پہلے چارلس بریڈلا کو محض اس جرم میں گرفتار کر لیا گیا تھا کہ اُس نے ضبطِ تولید پر ایک رسالہ لکھا تھا۔

اِسی طرح ایک اور واقعہ ۱۸۶۸ء میں پیش آیا جس نے عدالتی کارروائی اور یہاں کے قانون میں ایک نہایت اہم تبدیلی پیدا کر دی۔ چارلس بریڈلا کسی مقدمے میں ایک گواہ کی حیثیت سے پیش ہوا۔ تو اُس نے بائبل پر ہاتھ رکھ کر حلف اُٹھانے سے انکار کر دیا اور کہا کہ میں اپنے ضمیر کی صداقت کا حلف اُٹھانے کو تیار ہوں۔ عدالت نے محض اس بنا پر اس کی شہادت قبول کرنے سے انکار کر دیا کیونکہ از روئے آئین گواہ کے لیے بائبل کا حلف اُٹھانا ضروری تھا اِس پر چارلس بریڈلا نے عدالتِ مذکور کے خلاف باقاعدہ چارہ جوئی کی اور آخر کار دو سال کی مستقل جدّ و جہد کے بعد اُسے اپنے مقصد میں کامیابی ہوئی۔ اور آئندہ

برطانیہ کے قانونِ شہادت میں ترمیم کی گئی کہ گواہ اگر چاہے تو اپنے ضمیر کا حلف اُٹھا کر عدالت کے روبرو گواہی دے سکتا ہے اور عدالتِ مجاز کو یہ گواہی قبول کرنا پڑے گی۔

۱۸۶۸ء ہی میں جب پارلیمنٹ کے انتخاب ہوئے تو چارلس بریڈلا نارتھمپٹن کے حلقے سے امیدوار کھڑا ہوا۔ لیکن ناکام رہا۔ ناکامی کی سب سے بڑی وجہ یہی تھی کہ تمام سرمایہ دار، قدامت پسند۔ مذہبی رہنما، بادشاہت کے علمبردار اور پادری لوگ اُس کے خلاف متحد ہو کر کھڑے ہو گئے تھے۔

۱۸۷۴ء کے انتخاب میں وہ دوبارہ کھڑا ہوا۔ لیکن پھر ناکام رہا۔ آخر کار ۱۸۸۰ء کے انتخاب میں وہ نارتھمپٹن ہی کے حلقے سے کامیاب ہو گیا۔ لیکن اس کی یہ کامیابی ایک نئی کشمکش کا نقطہ آغاز بن گئی۔ جب وہ دارالعوام میں داخل ہوا تو حسبِ قاعدہ اُسے بائبل پر ہاتھ رکھ کر حلفِ وفاداری اٹھانے کے لیے کہا گیا۔ لیکن اس نے انکار کر دیا اور وہی پرانی دلیل پیش کی کہ میں بائبل کی بجائے اپنے ضمیر کی قسم کھانے کو تیار ہوں۔ چنانچہ اسے پارلیمنٹ سے نکال دیا گیا۔ نارتھمپٹن کے حلقے سے ۹ اپریل ۱۸۸۱ء کو دوبارہ ضمنی انتخاب ہوا۔ چارلس بریڈلا بہت بڑی اکثریت سے پھر کامیاب ہوا۔ لیکن دارالعوام میں قدم رکھتے ہی از سرِ نو پھر وہی پرانا جھگڑا شروع ہو گیا۔ بریڈلا کسی شرط پر بھی بائبل کی قسم کھانے کو آمادہ نہ تھا۔ چنانچہ اُسے جبراً پارلیمنٹ سے نکال دیا گیا۔ اسی طرح مارچ ۱۸۸۲ء میں تیسرا ضمنی انتخاب ہوا۔ اور بریڈلا کامیاب ہو گیا۔ لیکن پھر دارالعوام میں اُسے بیٹھنے کی اجازت نہ دی گئی۔

غرضکہ نومبر ۱۸۸۵ء تک بار بار ضمنی انتخاب ہوتے رہے اور ہر بار چارلس بریڈلا کامیاب ہوتا رہا لیکن اِدھر پارلیمنٹ بھی اپنی ضد پر قائم تھی کہ جب تک وہ بائبل پر ہاتھ رکھ کر حلف نہیں اُٹھائے گا۔ اُسے دارالعوام میں بیٹھنے کی اجازت نہیں ملے گی۔ بالآخر جنوری ۱۸۸۶ء کے عام انتخابات میں جب وہ کامیاب ہوکر ایک فاتح کی حیثیت سے دارالعوام میں داخل ہوا تو حکومت کو مجبوراً جھکنا پڑا۔ اور برطانیہ کے پارلیمنٹری آئین میں یہ بنیادی ترمیم کی گئی کہ ممبروں کے لیے بائبل کا حلف اُٹھانا ضروری نہیں اگر کوئی چاہے تو اپنے ضمیر کی صداقت کا حلف بھی اُٹھا سکتا ہے۔ بلاشبہ اس جنگ کی فتح کا سہرا چارلس بریڈلا کے سر ہے۔

بریڈلا جب تک پارلیمنٹ کا ممبر رہا۔ اس نے ہمیشہ ہندوستان کی مدد کی اور ہر موقع پر دارالعوام میں یہ مطالبہ پیش کیا کہ ہندوستانیوں کو حکومت خود اختیاری عطا کرنی چاہیئے۔ یہ وہ زمانہ تھا، جب انڈین نیشنل کانگرس کو قائم ہوئے صرف دو چار سال گزرے تھے اور خود اہلِ ہند اپنی زبان پر آزادی کا لفظ لاتے ہوئے ڈرتے تھے۔ لیکن چارلس بریڈلا کھلم کھلا ہندوستانیوں کی حمایت کرتا تھا۔ یہاں تک کہ دسمبر ۱۸۸۹ء میں وہ خود ہندوستان گیا اور بمبئی میں انڈین نیشنل کانگرس کے سالانہ اجلاس میں شریک ہوا۔ جہاں اہلِ ہند نے گرمجوشی اور احسان مندی سے اُس کا استقبال کیا۔

۳۰ جنوری ۱۸۹۱ء کو ستاون سال کی عمر میں اُس کا انتقال ہوا اور اہلِ پنجاب نے اظہارِ تشکر کے طور پر چندہ جمع کرکے لاہور میں بریڈلا ہال تعمیر کیا جو اگست ۱۹۴۷ء تک پنجاب صوبہ کانگرس کمیٹی کا مرکزی دفتر تھا۔

کارلائل کا مکان

انگلستان کے بعض نامور ادیبوں، شاعروں اور مصنّفوں کے مکان اب تک لندن میں محفوظ ہیں۔ اِن مکانوں کے اندر جا کر دیکھیں تو ماضی کا جیتا جاگتا نقشہ آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہے۔ گھریلو سامان کم و بیش اُسی حالت میں رکھا نظر آئے گا۔ جیسے مالک کی زندگی میں تھا۔ کتابیں، مسودے، خطوط اور خانگی ضرورت کی اکثر چیزیں من و عن اُسی طرح پڑی ہوئی ملیں گی جیسے مکین کی حیات میں موجود تھیں۔ بعض مکانوں میں تو چلتے پھرتے وقت یُوں محسوس ہوتا ہے گویا مالک کی رُوح بھی ہمارے ساتھ ساتھ اس خاکدانِ ارضی کی سیر میں مصروف ہے۔ کارلائل کا مکان بھی اسی نوعیت کا ہے۔

کارلائل کو انگریزی ادب میں ایک نقاد۔ سوانح نگار۔ انشا پرداز اور مورخ کی حیثیت سے بڑا بلند مقام حاصل ہے۔ اور اس بات میں قطعاً کوئی مبالغہ نہیں کہ اُنیسویں صدی کے نصفِ آخر میں انگلستان کی ادبیات کو جس قدر کارلائل نے متاثر کیا تھا اُس کے برابر اور کوئی شخص نہیں کر سکا وہ اگرچہ شاعر نہیں تھا۔ لیکن نثر کی مختلف اصناف میں اُس کے ہمہ گیر قلم نے جس قدر جولانیاں دکھائی تھیں۔ اُن کے نقوش اب تک برقرار ہیں۔

کارلائل سکاٹ لینڈ کے ایک دُور اُفتادہ گاؤں میں ۱۷۹۵ء میں پیدا ہُوا تھا۔ اُس کا باپ ایک غریب آدمی تھا جس کے کندھوں پر بہت بڑے کُنبے کی پرورش کا بوجھ آپڑا تھا۔ ابتدائی تعلیم کارلائل نے گاؤں کے سکول میں حاصل کی۔ پھر ثانوی تعلیم کے لیے اُسے ایڈنبرا جانا پڑا۔ اُس کے گاؤں سے ایڈنبرا تک ایک سو میل کا فاصلہ تھا، جو کارلائل نے پیدل طے کیا۔ کیونکہ گاڑی میں سوار ہو کر وہاں تک جانے کے لیے جس قدر کرایہ درکار تھا وہ رقم اُس کے پاس نہیں تھی۔ کارلائل کے باپ کا جی چاہتا تھا کہ اُس کا بیٹا پادری بنے۔ چنانچہ ایڈنبرا پہنچ کر شروع میں کارلائل نے تحصیل مذہب کی طرف توجہ کی۔ لیکن اُس کی تشکک آمیز طبیعت کو بہت جلد مسیحیت سے نفرت ہو گئی۔ اور یہ نفرت آہستہ آہستہ مکمل الحاد کی صورت اختیار کر گئی۔ مذہب سے مُنہ موڑ کر اُس نے قانون کی طرف توجہ کی۔ لیکن قانون کی خشک اور بے آب و گیاہ وادی بھی کارلائل کی مضطرب طبیعت کو سکون نہ بخش سکی۔

اب آہستہ آہستہ اُس کا رجحان ادب۔ فلسفہ اور تاریخ کی جانب ہونے لگا اور بالآخر یہی مضامین اُس کے محبوب موضوع بن گئے۔ جن کے مطالعہ سے اُسے وہ سرورِ میسّر آیا جس کی اُسے مدّت سے تلاش تھی۔

کارلائل ایڈنبرا ہی میں تھا کہ اُس کی خط و کتابت گوئٹے سے قائم ہو گئی تھی، جس کی بعض تصانیف کا اُس نے انگریزی میں ترجمہ بھی شروع کر دیا تھا۔ انہی دنوں اُس نے معاش کی دقتوں سے مجبور ہو کر ایک سکول میں نوکری کر لی۔ لیکن مدرّسی کی بے کیف زندگی میں اُس کے لیے کوئی دلکشی نہ تھی۔ چنانچہ دو، چار سال کے بعد وہ اس سے بالکل اُکتا گیا۔ اور آخر کار اُس نے ہر قسم کی ملازمت سے بے نیاز ہو کر تصنیف و تالیف کا پیشہ اختیار کرنے کا ارادہ کر لیا۔

۱۸۳۴ء میں وہ اپنی بیوی کو لے کر لندن چلا آیا۔ اور آئندہ پورے سینتالیس ۴۷ سال تک یہی شہر اُس کے علمی و ادبی کارناموں کا مرکز رہا۔ لندن میں اُس نے چیلسی کے محلّے میں، ایک سڑک پر، جس کا نام چینی رو ہے۔ کرائے کا مکان لے لیا۔ اُس وقت اس مکان کا نمبر ۵ تھا۔ لیکن اب بدل کر ۲۴ ہو گیا ہے۔

چیلسی لندن کے ادیبوں، شاعروں، مصنفوں اور مصوّروں کا سب سے بڑا مرکز رہا ہے۔ اُنیسویں صدی کے نصفِ آخر میں کارلائل کے علاوہ جو نامور لوگ یہاں رہتے تھے اُن میں رسکن۔ روسیٹی۔ برن جونز۔ جارج ایلیٹ۔ وہسلر۔ ولیم مورس۔ بی ہنٹ۔ براؤننگ۔ آسکر وائلڈ

وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ اِس دوران میں کارلائل کے دوستوں کا حلقہ بھی وسیع ہو گیا تھا۔ جان سٹوارٹ مل۔ تھیکرے۔ لی ہنٹ۔ ایمرسن وغیرہ سے اُس کے نہایت اچھے مراسم ہو گئے تھے۔ چلینی رو سے پندرہ منٹ کے فاصلے پر دریائے ٹیمز بہتا ہے۔ جس کے اُس پار نہایت کشادہ اور خوب صورت باغ ہے۔ اِس باغ میں ہر سال گرمیوں کے موسم میں بہت بڑا میلہ لگتا ہے۔ جہاں رات کے وقت، بجلی کے قمقموں سے دریا کے دونوں کناروں کو اِس خوب صورتی سے سجایا جاتا ہے کہ میرے ایک دوست نے اِس منظر کو دیکھ کر بے اختیار کہا تھا کہ "معشوقۂ ٹیمز کے گلے میں قمقموں کا ہار پہنا دیا گیا ہے"۔

چلینی رو کے اِس مکان کی تین منزلیں ہیں۔ اور نیچے تہہ خانہ بھی ہے۔ جسے انگلستان کی اصطلاح میں بیس منٹ کہتے ہیں۔ بیس منٹ میں باورچی خانہ ہے اور مکان میں داخل ہوں تو بائیں ہاتھ کو کارلائل کا ڈائننگ روم ہے۔ دوسری منزل میں ڈرائنگ روم ہے۔ اور تیسری منزل میں کارلائل کی لائبریری ہے۔ جہاں وہ لکھنے پڑھنے کا کام کرتا تھا۔ اِسی کمرے میں بیٹھ کر اُس نے انقلابِ فرانس ایسی مشہور کتاب لکھی جو آگے چل کر اُس کی عظمت و شہرت کا گویا سنگِ بنیاد ثابت ہوئی۔ اِسی کمرے میں اُس نے فریڈرک اعظم کی ضخیم سوانح عمری مرتب کی۔ جس پر اُس کو شہنشاہِ جرمنی نے اپنی سلطنت کا سب سے بڑا اعزاز پرشین آرڈر آف میرٹ عطا کیا تھا۔ اِسی کمرے میں کارلائل نے ہیرو ورشپ کے عنوان سے اپنے

لکچروں کا مجموعہ ترتیب دیا، جس میں اُس نے بانیٔ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کو دُنیا کے پیغمبروں کا ہیرو قرار دیا۔

مسلمانوں میں کارلائل کا نام ہمیشہ ادب و احترام سے لیا جاتا ہے اس لیے کہ انگلستان میں کارلائل پہلا شخص ہے جس نے پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس کو اُن تعصبات سے بلند ہو کر دیکھا ہے جو اُس عہد میں دشمنانِ اسلام نے عام طور پر پھیلا رکھے تھے۔ اُنیسویں صدی کے اوائل میں یورپ کے پادریوں نے اسلام اور رسولِ پاکؐ کے متعلق ایسی غلط، بے بنیاد اور گمراہ کن باتیں مشہور کر رکھی تھیں کہ آج اُن کو پڑھیں تو غصے سے خون کھولنے لگتا ہے۔ تعصب اور جہالت کی اس گھٹا ٹوپ تاریکی میں کارلائل پہلا شخص تھا جس نے ہیرو ورشپ لکھ کر دشمنی اور کذب و افترا کے اُن بادلوں کو چاک کیا۔

اگرچہ گذشتہ چالیس پچاس سال میں یورپ کا اندازِ فکر بہت کچھ بدل گیا ہے۔ اور اب اکثر مغربی زبانوں میں اسلام پر نہایت بیش قیمت کتابیں شائع ہو رہی ہیں۔ لیکن جب ۱۸۴۰ء میں کارلائل نے ہیرو ورشپ لکھی ہے۔ اُس وقت اِس امر کا کھلے بندوں اعتراف کرنا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) دنیا کے تمام پیغمبروں کے ہیرو ہیں۔ بڑے حوصلے اور دل گردے کا کام تھا۔ اِسی کتاب میں ایک جگہ کارلائل لکھتا ہے کہ

"جو لوگ پیغمبرِ اسلام کو (نعوذ باللہ) نفسانی خواہشات کا بندہ سمجھتے ہیں، وہ غلط کہتے ہیں۔ یہ وہ شخص ہے جس کے

گھر میں مسلسل کئی مہینے چولھے میں آگ نہیں جلتی تھی۔ جو پیٹ بھرنے کے لیے جَو کی روٹی کھا کر پانی پی لیتا تھا۔ جو اپنا جوتا خود مرمت کرتا تھا۔ جو اپنے پھٹے ہوئے کرتے کو اپنے ہاتھ سے ٹانکے لگاتا تھا۔ اور جو عام غریب آدمیوں کی طرح محنت مزدوری کر کے اپنی روزی کماتا تھا.....

تیس سال تک، صبح و شام اور دن رات، یہ شخص اُن تندمزاج عربوں کے درمیان کام کرتا رہا۔ جو سخت کینہ پرور خون آشام اور بات بات پر تلواریں کھینچ لینے والے لوگ تھے۔ اُس کی زندگی کی کوئی رمز اِن لوگوں سے پوشیدہ نہ تھی۔ اس کے باوجود اِن اکھڑ مزاج اور غضب ناک عربوں نے جس خلوص و عقیدت سے محمدؐ کے آگے گردنیں جھکائی ہیں۔ اس طرح دُنیا کے بڑے سے بڑے باجبروت شہنشاہ کے آگے بھی لوگوں کی گردنیں نہیں جھکیں۔ میں یقیناً اِس شخص کو پیغمبروں کا ہیرو سمجھتا ہوں۔"

کارلائل کے ڈائننگ رُوم میں اِس وقت کھانے کی ایک میز اور سات کرسیاں موجود ہیں۔ ایک صوفہ بھی پڑا ہے۔ دیواروں پر کارلائل کی بہت سی تصویریں لٹک رہی ہیں۔ جن میں سے بعض فوٹو ہیں اور بعض مصوّری کے خوب صورت نمونے ہیں۔ چینی کے بہت سے برتن بھی الماری میں قرینے سے رکھے ہیں۔

ڈرائنگ روم کی دیواروں پر کارلائل اور مسز کارلائل کی بہت سی تصویریں آویزاں ہیں۔ کتابوں کی دو الماریاں بھی رکھی ہیں۔ ایک میں گوئٹے کی تینتیس ۳۳ تصانیف ہیں جو اس نے ہدیتہً کارلائل کو جرمنی سے بھیجی تھیں۔ ایک جگہ برطانیہ کے وزیر اعظم ڈزرائیلی کا وہ خط ہے جس میں اس نے حکومت کی طرف سے کارلائل کو خطاب اور پنشن کی پیش کش کی تھی۔ اور جسے کارلائل نے بصد شکریہ قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ ڈارون اور ایمرسن کے کچھ تحائف بھی پڑے ہیں۔ چینی۔ بلور اور پتھر کے بہت سے خوب صورت مجسمے بھی رکھے ہیں۔ ہاتھی دانت سے بنے ہوئے بہت خوب صورت ڈبے اور چند چھوٹی تپائیاں بھی رکھی ہیں۔ ڈرائنگ روم سے ملحقہ کمرہ مسز کارلائل کی خواب گاہ تھا۔ جہاں اس وقت ایک پلنگ اور بستر پڑا ہے۔ چند کرسیاں بھی ہیں اور ایک کمبس میں مسز کارلائل کی کشیدہ کاری کا سامان ہے۔ دیواروں پر بہت سی تصویریں لٹک رہی ہیں۔

تیسری منزل میں لائبریری ہے۔ جہاں کتابوں کی دو الماریاں ہیں۔ فریڈرک اعظم اور اس کے بھائی شہزادہ ولیم کی تصاویر ہیں جو انھوں نے اپنے دستخط سے کارلائل کو تحفے کے طور پر پیش کی تھیں۔ ایک طرف دیوار پر وہ سپاسنامہ لٹک رہا ہے جو انگلستان کے مشاہیر نے کارلائل کو اس کی سالگرہ کے موقع پر جبکہ وہ اسی برس کی عمر کو پہنچ گیا تھا ایک پبلک جلسے میں پیش کیا تھا۔ اس سپاسنامے پر جن اہل علم

کے دستخط ثبت ہیں اُن میں رابرٹ براؤننگ۔ چارلس ڈارون۔
جان فاسٹر۔ ہکسلے۔ کمس ٹطر اور فیٹز جیرالڈ بھی شامل ہیں۔

اس مکان کی نگہداشت پر ایک عورت مقرر ہے جس کی عمر اس
وقت اسی برس کے لگ بھگ ہے۔ لیکن قویٰ نہایت اچھے ہیں
گذشتہ چالیس سال سے وہ اس خدمت پر مامور ہے۔ میں جب مکان
داخل ہوا تو اُس نے مجھ سے پوچھا کہ آپ ہندوستان سے آ
ہیں؟

میں نے جواب دیا "نہیں۔ پاکستان سے آیا ہوں"
کہنے لگی "میں ہندوستان کی ایک خاتون کو جانتی ہوں جو ۳۲
میں یہ مکان دیکھنے آئی تھیں"

میں نے پوچھا "کیا نام تھا اُن کا؟"

بولیں "مسز سروجنی نیڈو۔"

میں نے پوچھا "ہمارے ملک کے کسی اور آدمی کو بھی آپ جانتی
جو کبھی یہاں آئے ہوں؟"

سوچ کر کہنے لگیں "ہاں، ایک صاحب تشریف لائے تھے
یہاں وزیر ہند کی کونسل کے ممبر تھے۔ نام اُن کا بھول گئی ہوں"

میں نے کہا "سر عبدالقادر تو نہیں تھے؟"

فوراً بولیں "ہاں یہی نام تھا۔ ترکش کیپ پہنی ہوئی تھی۔ اور بڑے
جمعدار اور معتبر شخص معلوم ہوتے تھے"

کارلائل کا مکان اس وقت انگلستان کے نیشنل ٹرسٹ کی تحویل میں ہے۔ جو لوگ مکان دیکھنے آتے ہیں وہ ایک رجسٹر میں اپنا نام اور پتہ بھی درج کر دیتے ہیں۔ گذشتہ ساٹھ سال کے پرانے رجسٹر یہاں موجود ہیں۔ اگر اُن کا مطالعہ کیا جائے تو ہمارے ملک کے بہت سے لوگوں کے نام نظر آئیں گے۔ جو وقتاً فوقتاً کارلائل کو خراجِ عقیدت پیش کرنے یہاں آتے رہے ہیں۔

لندن ۱۹۵۸ء

عبداللہ فلبی

سات سال ہوئے، دُنیائے اسلام کی ایک بڑی دلچسپ، مشہور اور بدیع المثال شخصیت ہم سے ہمیشہ کے لیے جدا ہو گئی۔ میری مراد سینٹ جان فلبی سے ہے، جنھوں نے ۱۹۳۰ء میں اسلام قبول کر کے اپنا نام عبداللہ فلبی رکھ لیا تھا۔

عبداللہ فلبی ۳ر اپریل ۱۸۸۵ء کو لنکا میں پیدا ہوئے تھے جہاں اُن کے والد ہنری مانٹیگو نے بڑے وسیع پیمانے پر چائے کی کاشت کا کاروبار جاری کر رکھا تھا۔ ہنری مانٹیگو کا وطن تو انگلستان تھا لیکن پچھلی دو پشتوں سے اُن کا خاندان نقلِ مکانی کر کے لنکا میں آباد ہو گیا تھا۔ اُن کی اولاد میں چار بیٹے تھے جن میں دوسرے نمبر پر عبداللہ فلبی تھے۔ بچپن میں فلبی کو اُن کے والدین نے انگلستان بھیج دیا تھا جہاں اُن کی ابتدائی تعلیم ہنسفیلڈ میں ہوئی۔ پھر انھیں وظیفہ مل گیا اور لندن کے مشہور سکول ویسٹ منسٹر میں داخلہ

ہو گئے جہاں سے دوبارہ وظیفہ حاصل کر کے کیمبرج کے ٹرنٹی کالج میں چلے گئے۔ کیمبرج میں اُن کا قیام تین سال رہا اور ۱۹۰۸ء میں انڈین سول سروس کا امتحان پاس کر کے ہندوستان تشریف لے گئے۔ عجیب اتفاق ہے کہ علامہ اقبال اور فلبی دونوں کیمبرج کے ٹرنٹی کالج میں ایک ہی زمانے میں پڑھتے تھے۔ اور دونوں نے ایک ساتھ ۱۹۰۷ء میں یونیورسٹی سے ڈگری لی تھی۔

انڈین سول سروس میں بھرتی ہو کر فلبی پنجاب میں متعین ہوئے۔ اس لحاظ سے مغربی پاکستان کو یہ فخر حاصل ہے کہ اسلام اور مسلمانوں کے ساتھ جو رابطہ فلبی نے اُستوار کیا تھا اُس کی ابتدا اسی خطۂ پاک سے ہوئی تھی۔ پنجاب میں فلبی کی ملازمت کا تمام زمانہ جہلم۔ راولپنڈی۔ سرگودھا۔ لائل پور اور لاہور میں بسر ہوا۔ جہلم، راولپنڈی اور سرگودھا میں وہ اسسٹنٹ کمشنر تھے اور لائل پور میں قائم مقام ڈپٹی کمشنر کی حیثیت سے کام کیا۔ جب ۱۹۱۴ء میں پہلی عالمگیر جنگ شروع ہوئی تو فلبی کو لاہور کے سول سکریٹریٹ میں اخباروں کی نگرانی کے کام پر تعینات کر دیا گیا تھا۔

اس دوران میں اُنھوں نے اُردو، فارسی، عربی اور پشتو سیکھی۔ اُردو میں انھوں نے بالترتیب ادیب۔ ادیب عالم اور ادیب فاضل کے امتحان بہت اچھے نمبروں پر پاس کیے۔ اُن کی اُردو دانی کا یہ عالم تھا کہ جب اکتوبر ۱۹۱۴ء میں برطانیہ نے ترکوں کے خلاف اعلانِ جنگ کیا تو حکومت کو مسلمانوں کے جذبات کا اس قدر شدید احساس تھا کہ پنجاب کے لفٹننٹ گورنر سر مائیکل اوڈوائر نے یہ کام فلبی کے سپرد کیا کہ وہ بہت نرم اور موزوں الفاظ اور نہایت سُلجھے ہوئے انداز میں اہلِ پنجاب کو اعلانِ جنگ کی خبر پہنچائیں۔

جہلم ہی میں فلبی نے قرآن مجید کا مطالعہ شروع کیا۔ انھوں نے اپنی خود نوشت سوانح عمری میں جو ۱۹۴۵ء میں (ARABIAN DAYS) کے نام سے شائع ہوئی تھی، لکھا ہے کہ قرآن مجید انھوں نے سبقاً سبقاً اپنے پیش کار، غلام محی الدین سے پڑھا تھا۔

۱۹۱۵ء میں فلبی کو بورڈ آف ایگزامینرز کا سیکرٹری بنا کر کلکتہ بھیج دیا گیا جہاں مولانا ابوالکلام آزاد سے اُن کے دوستانہ تعلقات قائم ہو گئے۔ بعد کو مولانا اور فلبی کے درمیان

خط و کتابت بھی ہوتی رہی۔ فلبی نے اپنی سوانح عمری میں لکھا ہے کہ مولانا نے ایک دفعہ اُن کو اُردو کانفرنس کی صدارت کی دعوت بھی دی تھی جسے فلبی نے بخوشی قبول کر لیا تھا۔ لیکن پھر سرکاری ملازمت کی مصروفیتیں حائل ہو گئیں اور وہ صدارت نہ کر سکے۔

۱۹۱۵ء سے ۱۹۱۷ء تک وہ عراق میں پولیٹکل افسر کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ پھر اُن کا تبادلہ سلطان ابن سعود والیٔ نجد کے دارالسلطنت میں ہو گیا جہاں وہ برطانیہ کے پولیٹکل مشن کے سربراہ بن کر چلے گئے۔ یہ واقعہ فلبی کی زندگی میں ایک انقلاب آفریں موڑ کی حیثیت رکھتا ہے کیونکہ یہیں سے فلبی اور سعودی خاندان کے وہ تعلقات استوار ہونا شروع ہوئے جنھوں نے آہستہ آہستہ فلبی کو بالکل عربوں کے رنگ میں رنگ دیا۔ اور انجام کار جزیرۃ العرب ہی فلبی کا وطن بن کر رہ گیا۔

پہلی جنگِ عظیم کے بعد جب برطانوی حکومت نے عربوں سے قابلِ اعتراض سلوک کیا اور اُن وعدوں کے ایفا سے بھی گریز کیا جو دورانِ جنگ میں لندن کے وائٹ ہال نے عربوں سے کئے تھے تو لارڈ لارنس کی طرح فلبی بھی برطانوی حکومت سے برگشتہ خاطر ہو گئے اور انھوں نے انڈین سول سروس سے علیحدگی اختیار کر لی۔ لیکن ملازمت سے الگ ہو جانے کے بعد بھی انھوں نے اپنی بود و باش بدستور عرب ہی میں رکھی۔ ۱۹۳۰ء میں انھوں نے سلطان عبدالعزیز ابن سعود والیٔ نجد و حجاز کی موجودگی میں بطیبِ خاطر اور بہ انشراحِ صدر اسلام قبول کیا اور اُن کا نام عبداللہ فلبی رکھا گیا۔ فلبی نے اپنی ایک کتاب میں قبولِ اسلام کے اس واقعہ کا ذکر ایسے والہانہ انداز میں کیا ہے کہ پڑھنے والے پر بے اختیار رقت طاری ہو جاتی ہے۔ اُن کی رائے ہے کہ حقیقی اسلام کی جو دل کشی اور سادگی انھوں نے نجد و حجاز میں دیکھی ہے، ہندوستان۔ ایران۔ ترکی مصر کہیں نظر نہیں آئی۔

فلبی کو سیاحت کا بے حد شوق تھا۔ چنانچہ سلطان ابن سعود کی شفقت اور مہربانی سے ایسے مواقع میسر آئے جن سے فائدہ اُٹھا کر انھوں نے مسلسل دس سال تک

صحرائے عرب کے اُن دُور دراز گوشوں کا سفر کیا جہاں پہلے کبھی یورپ کے کسی متنفس کو قدم رکھنے کی جرأت نہیں ہوئی تھی۔ آب و ہوا۔ معدنیات اور نباتات کے لحاظ سے فلبی نے جزیرۃ العرب کے جو متعدد نقشے تیار کئے تھے اُنہی کی مدد سے آگے چل کر تیل نکالنے والی کمپنیوں نے گراں بہا فائدہ اُٹھایا۔

جب سرزمینِ عرب سے تیل نکلنا شروع ہوا اور دیکھتے ہی دیکھتے اس خطۂ بے آب و گیاہ میں سیم و زر کے دریا بہنے لگے تو عربوں کی سادہ زندگی بھی اُن تکلفات کا شکار ہو گئی جو تمول ہمیشہ اپنے جلو میں لاتا ہے۔ چنانچہ جب نجد و حجاز کی بدوی زندگی پر مغرب کی عیش پسندی کا رنگ چڑھنا شروع ہوا تو فلبی نے عربوں کی اس بدلتی ہوئی معاشرت پر سخت نکتہ چینی کی۔ سلطان ابنِ سعود نے ناراض ہو کر انھیں اپنے ملک سے نکال دیا اور فلبی امریکہ چلے گئے۔ لیکن سال بھر کے بعد سلطان نے پھر اُن کو واپس بلا لیا۔

وفات سے تین سال قبل فلبی کا مستقل قیام بیروت میں تھا اور وہ تصنیف و تالیف کے کام میں مصروف تھے۔ ۱۹۶۰ء کی گرمیوں میں دُنیا کے مستشرقین کی بین الاقوامی کانفرنس ماسکو میں ہوئی جہاں فلبی بھی شریک ہوئے۔ چند ماہ روس میں گذار کر واپس بیروت پہنچے ہی تھے کہ طویل سفر کی تھکان سے بیمار ہو گئے اور یکم اکتوبر کو چھہتر سال کی عمر میں عالمِ فانی سے سدھار گئے۔

فلبی نے عربوں کی معیشت و معاشرت، تہذیب و تمدن اور تاریخ اور جغرافیہ پر جو کتابیں لکھی ہیں اُنھیں آج علمی دُنیا میں درجۂ استناد حاصل ہے۔ اُنہی کی سعی و کوشش سے صحرائے عرب کے بعض نوادر بھی لندن کے برٹش میوزیم میں شامل کئے گئے۔

فلبی کم و بیش دو درجن کتابوں کے مصنف ہیں۔ اُن کا محبوب موضوع اسلام اور ملکِ عرب تھا۔ چنانچہ اِس موضوع کے اکثر پہلوؤں پر اُنھوں نے جو تصانیف یادگار چھوڑی ہیں وہ اُن کی علمی فضیلت اور دقتِ نگاہ کے ثبوت میں پیش کی جا سکتی ہیں۔

۱۹۲۲ء میں اُنھوں نے HEART OF ARABIA کے نام سے دو جلدوں میں اپنی سیاحت کی داستان قلم بند کی۔ حجاز میں ابنِ سعود کی حکومت مستحکم

ہو جانے کے بعد انھوں نے ARABIA OF THE WAHABIS لکھی۔
ملک یمن پر جو کتاب انھوں نے لکھی تھی اُس کا نام SHEBA'S DAUGHTERS ہے
۱۹۳۴ء میں انھوں نے خلیفہ ہارون الرشید کی سوانح عمری شائع کی۔ ۱۹۴۰ء کے
بعد جب برّعظیم ہند کے مسلمانوں نے تحریک پاکستان شروع کی تو فلبی نے بڑی
گرم جوشی سے اس کا خیر مقدم کیا اور انگلستان کے مشہور اخبار مانچسٹر گارڈین میں
پاکستان کی حمایت میں چند بہت اچھے مضامین بھی لکھے تھے۔

پانچ سال سے فلبی کی صحت خراب چلی آرہی تھی، لیکن اُن کے علمی مشاغل
میں کوئی کمی نہ ہوئی۔ بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ صحت کی خرابی اُن کی تصنیفی سرگرمیوں
کے لیے مہمیز ثابت ہوئی اور فلبی کے قلم سے یکے بعد دیگرے تین بیش قیمت کتابیں
نکلیں۔ پہلی کا نام ARABIAN JUBILEE دوسری کا نام SAUDI
ARABIA اور تیسری کا نام FORTY YEARS IN THE
WILDERNESS ہے۔

عبداللہ فلبی یقیناً بڑا آدمی تھا۔ اور اُس کی موت سے، جیسا کہ میں نے
ابتداء میں عرض کیا ہے، دنیائے اسلام ایک بدیع المثال شخصیت سے محروم
ہو گئی۔

تحریر نمود
محمد سرور صدیقی